خالد فتح محمد
دیواروں کے راز
افسانے

دیواروں کے راز

دیواروں کے راز

(افسانے)

خالد فتح محمد

عکس
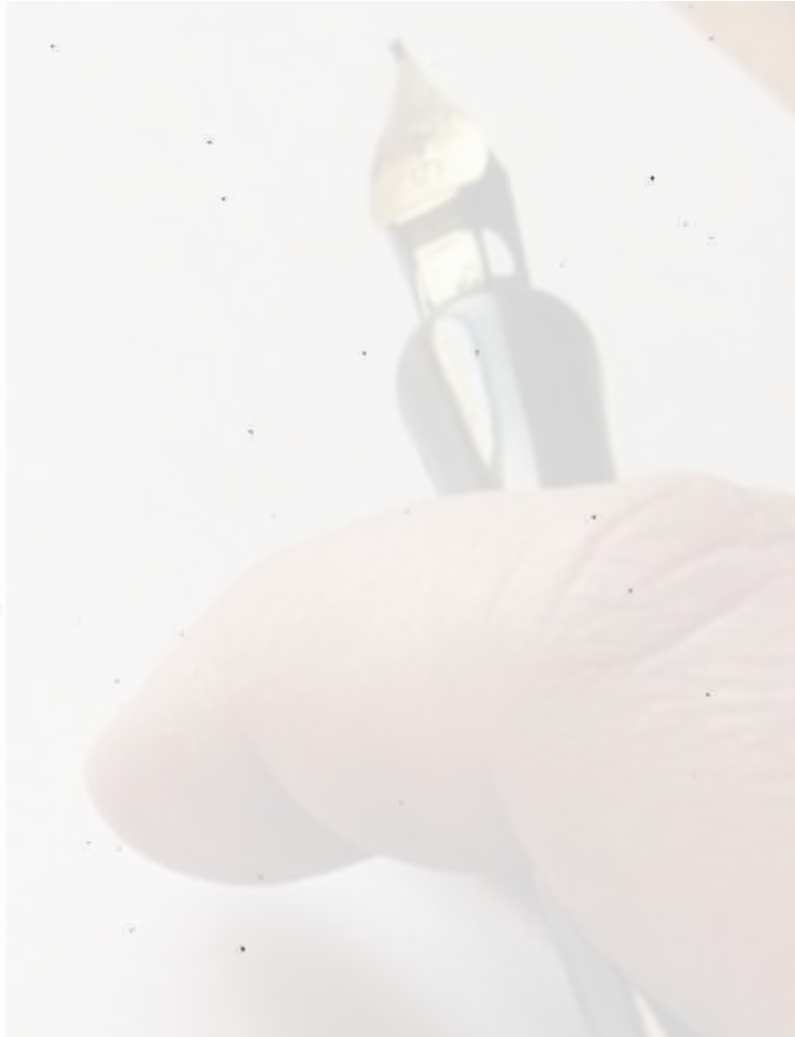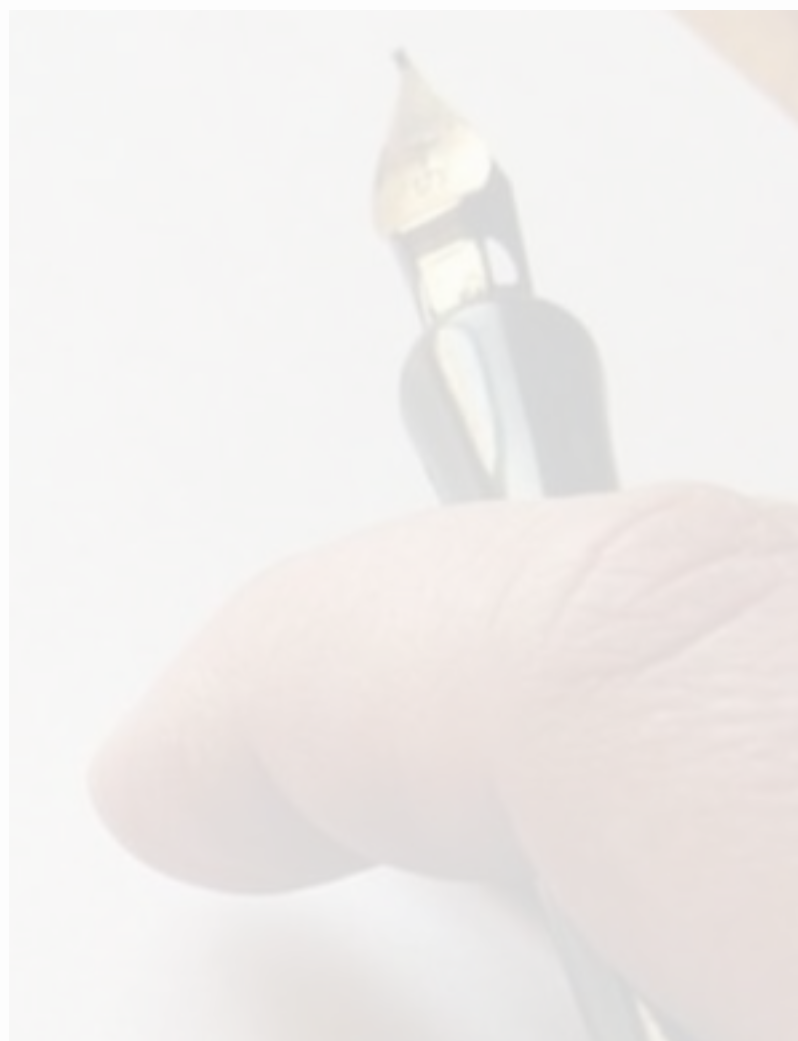
AKSPUBLICATIONS

نام کتاب: دیواروں کے راز

تخلیق کار: خالد فتح محمد

سنہ اشاعت: 2022

تعداد: 500

قیمت: 800

AKSPUBLICATIONS
Ph: 042-629400, Cell: 03004827500
E-mail: publications.aks@gmail.com
Ground Floor, Mian Chambers, 3-Temple Road, Lahore

انتساب

عین، سعود اور معید کے لیے

حسنِ ترتیب

ایک الگ داستان

میری عمر اِس وقت اٹھاسی سال ہے اور اچانک میرا دل اخراج سے لطف اندوز ہونے پر کر آیا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اِس عمل میں سے گزرے ہوئے تقریباً سولہ سال ہونے کو آئے ہیں اور میں وہ بے خودی بھول چکا ہوں جو اِسے زندگی میں اتنا اہم بناتی ہے۔ مجھے اچانک موت اپنے داخلی دروازے پر دستک دیتے ہوئے محسوس ہوئی اور لگا کہ اگر میں دروازہ کھولنے چلا گیا تو شاید واپس نہ آؤں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ بلاوا اِتنا پرکشش ہوتا ہے کہ اُس کی آواز پر جانا ہی پڑتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سب کے اُس من پسند اور اپنے ناپسندیدہ بلاوے کی آواز پر لبیک کہنے سے پہلے مجھے اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنا لینا چاہیے۔ میرا ارادہ اُس نوے سالہ بوڑھے والا کام نہیں کرنا تھا کہ جسے ایک رسیلی اور کم عمر باکرہ چاہیے تھی جس کے ساتھ وہ زندگی کے معاملات پر تبادلۂ خیال کر سکے اور جب وہ کم سن لڑکی آئے تو اُس کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ مجھے ایسا کوئی برتری یا کم تری کا احساس نہیں تھا اور میں صرف اُس لذت کی کھیتی میں سے گزرنا چاہتا تھا جس کا میں راستہ بھول چکا تھا۔ نہ تو مجھے کم عمر باکرہ کی ضرورت تھی اور نہ ہی میں نے اُس کے ساتھ تاریخ کو زیرِ بحث لانا تھا۔ مجھے تو بس ایک عورت چاہیے تھی جو میری اُس خواہش کی تکمیل کر سکے جسے میں بھول چکا تھا۔ مجھے ایسی عورت کی ضرورت تھی جو مجھ سے عمر میں اتنی کم ہو کہ وہ مجھے عورت ہی لگے۔

میں ایک چھوٹے شہر میں رہتا ہوں جہاں ہر کس و ناکس کسی طرح ایک دوسرے کو جانتا ہے

سوائے اُن نو دولتیوں کے جو شہر کے اردگرد وجود پا جانے والی نئی آبادیوں میں بس گئے تھے اور اُنھیں شہر کی تاریخ یا مستقبل کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ شہر میں دولت سمیٹنے آئے تھے اور ہر طرح کی بے اصولی کرتے ہوئے اپنے اصولوں کی پاسداری کیے جا رہے تھے۔ ہم شہر میں دو طرح کی زندگیاں گزار رہے تھے؛ ایک وہ زندگی جس کا اُن کے ساتھ کچے دھاگے سے بندھا ہوا ایک تعلق تھا اور دوسری وہ جو میرے جیسے لوگوں کی اپنی تھی۔ میں اپنی زندگی کے حصول میں اٹھاسی سال کی عمر میں بھی کوشاں تھا کہ مجھے اُس خواہش نے شدت کے ساتھ آن دبوچا۔ میں نے تمام عمر یہیں گزار دی تھی اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں کبھی کسی قسم کی بے راہ روی یا عامیانہ پن کا شکار نہیں ہوا جسے پرانا شہر ناقابل قبول کہہ سکے۔ میں نے ہمیشہ وہی کیا یا کہا جو شہر کی قدیمیت کا تقاضا تھا اور جسے کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ احساس فخر ہوا۔

اب اچانک مجھے اپنی زندگی کے آخری دور میں ایک کمی کا شدت سے احساس ہوا۔ جیسے ہی اِس خیال نے میرے ذہن میں ڈیرے جمائے، مجھے اپنی بے بسی پر غصہ بھی آیا اور خوشی بھی ہوئی کہ میں وہ سوچ رہا تھا جسے سوچتے ہوئے جوان بھی کتراتے ہیں۔ کیا میں جوان تھا؟ یقیناً تھا اور نہیں بھی۔ میں جوان تھا تو ایسی سوچ میرے ذہن میں آئی ورنہ میں کسی مسجد کے خاموش کونے میں بیٹھا موت کا انتظار کیا کرتا اور اگر جوان نہیں تھا تو میرے بوڑھے اور سکڑے ہوئے جسم میں ایسی گرم رَو دوڑی تھی جس نے مجھے جوان کر دیا اور وہ سوچنے لگا جو میری عمر کے لوگ نہیں سوچتے یا سوچ نہیں سکتے!

مجھے ایسی عورت کی تلاش رہنے لگی جو ابھی عورت ہی ہو اور اُس میں سے رس ابھی خشک نہ ہوا ہو۔ مجھے خود بھی حیرت ہوتی کہ میں اِس عمر میں ایک رسیلی عورت کا متلاشی تھا۔ میرے ذہن میں ہمیشہ ایک دبلی اور درمیانے قد کی عورت آتی جس کی آنکھوں میں اُداسی ہو۔ مجھے اپنے پر غصہ بھی آتا کہ میں ایک ناکام عورت کو کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟ مجھے پھر خیال آتا کہ عورت کی ناکامی اُس کی عمر کے بجائے سوچ میں ہے اور اگر وہ عورت میری طرح سوچ رہی ہو تو وہ بڑھاپے میں بھی جوانوں کو مات دے گی۔ کیا میری عمر عورت کے قرب کی متحمل ہو سکے گی؟ پھر مجھے خیال آیا کہ کیا کوئی عورت میرے قرب کی متحمل ہو سکے گی؟

وہ بوڑھا نوے سال کا تھا اور میں صرف اٹھاسی برسوں کا لیکن بوڑھا نہیں۔ اُس نے مختلف

عورتوں کے ساتھ تعلق بنائے اور اُن کے جسموں سے لذت کھینچی لیکن میں ایک ہی عورت کے ساتھ وابستہ رہا۔ اُس نے اُن عورتوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا لیکن میں ایک عورت کے ساتھ ایک ہی طرز میں اپنے دِن رات گزارتا رہا۔ اُس کی عورتیں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتی تھیں لیکن میں جس عورت کے ساتھ رہا اُس کا ایک ہی شعبہ تھا اور شاید اِسی لیے مجھے اچانک ایک عورت کے ساتھ کے بجائے اُس کے جسم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ عورت مجھے چاہتی نہیں تھی اور وہ جانتی تھی کہ مجھے اُس کے ساتھ دلی یا ذہنی وابستگی نہیں؛ ہم زندگی کے چکر میں جوت دیے گئے تھے اور ہم وہ چکر کاٹے جا رہے تھے۔

انسان موت کو نہ تو دیکھتا ہے اور نہ ہی محسوس کرتا ہے۔ اُسے کچھ اشارے ملتے ہیں جن سے وہ اندازہ لگالیتا ہے کہ اُس کے دِن قریب ہیں۔ مجھے بھی ایسے ہی لگا۔ آدمی جب اپنی زندگی کے پُرہجوم سال گزار چکا ہوتا ہے اور وہ، وہ سب بھول چکا ہوتا ہے جو اُس کی زندگی کا اہم حصہ رہے تھے تو اُسے وہ سب واقعات اور مقامات یاد آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ کوشش کر کے اُن جگہوں اور لوگوں سے ملتا ہے جو کبھی اُس کی زندگی میں اہم ہوا کرتے تھے۔ یہ تجدید اُسے اُس دور میں لے جاتی ہے اور وہ ایک بار پھر وہاں کچھ عرصے کے لیے جیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

اُردو بازار میں میرے ایک پرانے تعلق والے کی سب سے زیادہ مصروف دکان ہوا کرتی تھی۔ اُس کی وفات کے بعد وہ دکان بتدریج افغانیوں کے یتیم بچوں کے لیے ایک پناہ گاہ بن گئی۔ وہاں اب اُس وسیع دکان کی جگہ پر متعدد چھوٹی چھوٹی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے اُن دکانوں پر ایسے نظر ڈالی جس طرح پرانے وقف کار کے ساتھ ہاتھ ملایا جاتا ہے۔

میں نے اُن دکانوں کو ایک نظر دیکھا؛ اُس نظر سے جو سرسری ہونے کے ساتھ ساتھ گہری بھی تھی۔ میری اُس نظر نے میرے اندر کوئی سوئی ہوئی یاد زندہ نہیں کی.....بس میں نے وہاں کھڑے ہو کر اُس وقت کو یاد کیا جب وہاں عروج تھا۔ میں اُن دکانوں کو ایک نظر دیکھ کر آگے کی طرف چل پڑا تو مجھے ٹیلی فون کے ایک متروک کھمبے کے ساتھ وہ کھڑی نظر آئی۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے اُسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ وہ وہاں میرے انتظار میں تھی۔ وہ عمر کے اُس حصے تھی جہاں خوب صورتی اہم نہیں ہوتی لیکن چہرہ ایسی خوب صورتی لیے ہوئے ہوتا ہے کہ وہاں سے

نظر ہٹتی نہیں۔ وہ وہاں کھڑی مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ مجھے وہ اپنی دل کشی کے بلند پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی نظر آئی جہاں سے نیچے وادیاں ایک کھلا منظر لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ جوانی تو اُس چوٹی تک پہنچنے کے نشیب و فراز ہوتے ہیں جہاں ٹھہرنا وقت کا ضیاع لگتا ہے۔

وہ اُس کھمبے کے ساتھ کھڑی مجھے دیکھتی تھی اور مجھے لگا کہ وہ میرے انتظار میں تھی اور مجھے یہ بھی لگا کہ میں جانتا تھا کہ وہ وہاں میرے انتظار میں تھی ورنہ میں ایک واقف کار کی اُس دکان دیکھنے کیوں آتا جو افغانستان میں طالبان کو وجود دینے کے لیے چندہ دیتے دیتے اپنی حیثیت کھو بیٹھی تھی اور اُس نے دہشت گردی کو زندہ رکھنے کے لیے اُسے بیچ دیا تھا۔ میں اُس ایک دکان میں سے برآمد ہونے والی دکانوں کو دیکھنے کے بجائے اُسے دیکھنے وہاں آیا تھا۔

وہ درمیانے قد سے ذرا نکلتی ہوئی کسی حد تک ایک بھاری جسم کی مالک تھی۔ مجھے ہمیشہ پتلے جسم کی عورتوں میں کشش محسوس ہوتی تھی لیکن جب سے میری واحد عورت نے گھر کے اندر ہی مجھ سے دوری اختیار کی مجھے قدرے بھاری عورتوں میں ایسی کشش محسوس ہونے لگی تھی جس سے بعض اوقات میں خود بھی اپنے آپ سے جھجک جاتا۔ میں کبھی یہ بھی سوچتا کہ اِسے ایک طرح کی ذہنی پراگندگی بھی کہا جا سکتا ہے۔ میں نے..... جب سوچنے کا وقت تھا..... کبھی عورتوں کے متعلق ایسے نہیں سوچا تھا جس طرح اب میرے ذہن کی پرواز ہو گئی تھی۔

میں اپنے راستے پر چلتے جانے کے بجائے اُسے دیکھتا جاتا تھا۔ اُس کی نظر میں ایک اپنایت اور چہرے پر میٹھی سی مسکراہٹ تھی۔ مجھے لگا کہ وہ مجھے جانتی تھی اور میں نے ذہن پر زور دے کر سوچا کہ میں اُسے کہیں ملا بھی ہوں؟ میرے لیے وہ بالکل اجنبی تھی اور مجھے لگا کہ میں بھی اُس کے لیے اجنبی تھا لیکن وہ مجھے اپنایت کی نظر سے دیکھ رہی تھی کیوں کہ میں شاید ایسے ہی چاہتا تھا۔

میں نے اُسے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا !

ہمارے اردگرد ایک بھیڑ تھی۔ لوگ کسی مقصد کے تحت یا یوں ہی بے مقصد ایک طرف سے دوسری طرف اور مخالف میں آ جا رہے تھے۔ وہ ایک عجیب قسم کی بھیڑ تھی؛ شاید ہمیشہ ایسے ہی ہوتی ہو لیکن اُس دِن مجھے وہ بھیڑ رنگوں میں کٹی ہوئی نظر آئی۔ کہیں محبت کا سرخ رنگ تھا اور کہیں بے بسی کا سفید، کہیں موت کا زرد رنگ تھا اور کہیں بے وفائی کا سرمئی رنگ اور کہیں خوف کا سیاہ..... میں لوگوں کو

اپنے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھتے جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں اپنی عورت کے ساتھ اِن بازاروں میں آتا تھا تو کہیں کوئی رنگ بکھرے نہیں ہوتے تھے؛ ہر شے ویسے ہی ہوتی تھی جیسے کہ وہ تھی اور اَب میں چاہتا تھا کہ ہر کوئی مجھے دیکھے کیوں کہ میں ایک نوجوان عورت کو ہم بستری کے لیے لے کر جا رہا تھا لیکن کسی کو میرے ہونے یا نہ ہونے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ کیا میں اتنا ہی غیر اہم فعل کرنے جا رہا تھا جو کسی کی توجہ کا مرکز نہیں تھا؟ پھر مجھے خیال آیا کہ کسی کو میرے ارادوں کی کیا خبر ہو سکتی ہے؟ پھر میرے جیسے کئی لوگ ہوں گے.....وہ ہمارے پاس سے ایسے گزر رہے تھے کہ ہم وہاں تھے ہی نہیں یا وہ ہمیں اتنی تفصیل سے جانتے تھے کہ ہم اُن کے لیے غیر اہم تھے۔

میرے چلنے کے اشارے سے وہ کچھ پریشان لگی!

کیا وہ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی؟ اگر وہ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی تو اُسے میرا انتظار کیوں تھا؟ مجھے اچانک اُس بھیڑ میں ایک تبدیلی نظر آئی۔ اُس بھیڑ کا ایک ہی رنگ تھا جو مجھے پہلے نظر نہیں آیا تھا اور وہ تھا شناسائی کا کاسنی رنگ۔ مجھے لگا کہ ہر گزرنے والا مجھے ایک نگھی اپنایت سے دیکھ رہا ہے۔ مجھے ہر سو کاسنی رنگ بکھرا ہوا نظر آیا۔ پہلے مجھے یہ ایک وہم لگا کہ عمر میرے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی ہے لیکن سامنے اُسے کھڑے دیکھ کر مجھے ہر طرف کاسنی رنگ کی بوچھار نظر آئی؛ وہ بھی کاسنی رنگ کی شلوار قمیص میں تھی اور مجھے وہ ایک بار پھر شناسا لگی۔

چھوٹے شہروں میں زندگی ہر جاننے والے کے ساتھ جُڑی ہوتی ہے۔ اُسے میرے ساتھ جاتے ہوئے کئی ایسے لوگ دیکھیں گے جنھیں نہیں دیکھنا چاہیے لیکن اگر وہ دیکھ بھی لیں تو اُنھیں احساسِ تفخر ہوگا کہ اُن کا جاننے والا ایک جوان عورت کے ساتھ کہیں جا رہا ہے۔ شہر میں ایک ایسا ہوٹل تھا جو کسی بھی تین ستارہ کے معیار کا تھا اور اُس کا مالک میرے تعلق والوں میں سے تھا۔ میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا مجھے وہاں مکمل راز داری ملے گی اور حفاظت بھی۔ میں نے اُسے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا اور پھر مجھے خیال آیا کہ اُسے پیچھے چلانا اُس کو کم تر کرنا تھا۔ وہ میری ایک خواہش پوری کرنے کے لیے تیار تھی اور مجھے اُسے اتنی ہی عزت دینی چاہیے جتنی کی وہ حق دار تھی اور وہ اُتنی ہی عزت کی حق دار تھی جتنی اپنی عورت کی کرتا آیا تھا کیوں کہ اُس وقت وہ بھی میری عورت ہی تھی۔

میں نے اُسے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا!

ہم ایک دوسرے کے برابر چلتے رہے۔ میں اُسے دیکھتا بھی جاتا تھا۔ مجھے اُس کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی نظر نہیں آئی اور وہ ایک اعتماد کے ساتھ قدم اُٹھا رہی تھی۔ اُس کے چلنے میں ایک بے نیازی تھی۔ وہ ایسے چلے جا رہی تھی کہ میرے ساتھ اُن بازاروں کو کئی مرتبہ ناپ چکی ہو۔ ہماری جب بھی نظر ملتی وہ ایک اپنایت سے مسکراتی اور مجھے اپنے اندر ایک گرم سی رو دوڑتے محسوس ہوتی اور کاسنی رنگوں کی بوچھار مجھے نہلا جاتی۔

شہر کی ایک ہی محفوظ پارکنگ لوٹ تھی جہاں میں اپنی کار کھڑی کرتا تھا۔ ہم اُس لوٹ میں آ گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم دونوں کار تک کا پیدل سفر ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر کرنا چاہتے تھے لیکن اپنے اپنے خیالات میں کھوئے رہنے کی وجہ سے ہم یہ نہیں کر سکے تھے۔ اُس خاموشی کے سفر میں ایسی گفتگو ہوئی جو میں نے اپنی اِس طویل عمر میں نہیں کی تھی۔ میری عادت قدرے تیز چلنے کی تھی اور میں اُسی رفتار سے چل پڑا۔ میرے ساتھ پیدل چلنے والے میری بزرگی میں بھی جواں رفتاری سے نالاں رہتے تھے اور اُس کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ وہ میرے ساتھ قدم ملاتے ہوئے چلے جا رہی تھی اور کار تک پہنچنے میں شاید تھک جاؤں اور جس مقصد کے لیے اُسے کہیں لے جا رہا ہوں تھکاوٹ کی وجہ سے پورا نا کر پاؤں تو میں نے اُسی وقت رفتار کم کر دی۔

میں نے اُسے کار میں بیٹھایا تو میرے اندر ایک کم اعتمادی نے سر اُٹھایا۔ اچانک مجھے خیال آیا: میں جو کرنے جا رہا ہوں کیا مناسب ہے؟ مجھے ایک مضحک خیال آیا: اگر میں کچھ کرنا سکا تو میں کیا کروں گا؟ اِس عورت پر کوئی الزام دھر دوں گا؟ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ عورت تو میری ایک خواہش پوری کرنے کے لیے میرے ساتھ آئی تھی! مجھے اُس کا ساتھ دینا چاہیے۔ ہم اُس ہوٹل کی طرف چل پڑے ۔ہم کاسنی رنگ کی دھند میں سے گزر رہے تھے۔ دھند اتنی گہری تھی کہ سامنے دیکھنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ میں احتیاط سے چلتے ہوئے آگے بڑھتا رہا اور ہوٹل میں پہنچ گیا۔

مجھے کمرہ حاصل کرنے میں دقت نہیں ہوئی۔ ریسیپشن پر کھڑا آدمی مجھے جانتا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے پہلے مجھے دیکھا اور پھر شک اور دل چسپی سے میری ساتھی پر ایک نظر ڈالی۔ ہم بتائے گئے کمرے میں چلے گئے۔ میں کچھ عرصے سے کاسنی رنگ دیکھتا آیا تھا اور کمرے میں کالا رنگ بکھرا ہوا تھا جو مجھے پریشانی کا آغاز محسوس ہوا۔ میں اُس کالے رنگ کی گہرائی میں ڈوبا باہر کی فضا میں سانس لینے

کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ میں نے اپنی ساتھی کی طرف دیکھا تو وہ کالے رنگ کی ایک دیوی محسوس ہوئی۔ اُس کے چمکتے گندمی چہرے پر کالا رنگ کھنڈا ہوا تھا۔ میں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ پلنگ اتنا چوڑا تھا کہ اُس پر تین لوگ لیٹ سکتے تھے۔ میرے ذہن میں ایک دم آیا کہ میں اتنا ناآسودہ رہا ہوں کہ اِس پلنگ پر فالتو جگہ دیکھتے ہی ایک اور عورت کا خیال آ گیا؟ خوف کا سیاہ رنگ پہلے ہی میرے اعصاب پر سوار تھا، میں نے فوراً پردے کو تھوڑا سا سرکا کر باہر دیکھا۔ وہاں ہر طرف محبت کا سرخ رنگ رقص کر رہا تھا۔ مجھے اُس سرخی کے اندر اپنی روح تحلیل ہوتے محسوس ہوئی؛ مجھے لگا کہ رنگ کا وہ بادل ساکت ہو کر مجھے دیکھنا شروع ہو گیا ہے۔ اُس کے دیکھنے میں گہری رغبت تھی۔ پھر مجھے اُس بادل میں حرکت محسوس ہوئی اور وہاں ایک رقص شروع ہو گیا؛ بادلوں کا رقص۔ بادل ایک دیوانہ وار رقص کیے جاتے تھے اور اُن میں سے سُرخ رنگ کی بارش برستی جاتی تھی۔ میں نے کمرے کے وسط میں کھڑی اپنی ساتھی کی طرف دیکھا۔ اُس کے سرخ لباس میں ایک چمک تھی اور آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے اور وہ مجھے دیکھتی جاتی تھی۔ میں نے کمرے میں پھیلی سرخی کے بیچ میں اُسے ایک مختلف ہستی سمجھا۔ میں اُسے چھونا چاہتا تھا۔ کیا اُسے چھونا ہی میرا مقصد تھا؟ مجھے خیال آیا کہ کہیں سے تو آغاز ہونا ہی ہے۔ میں نے انگلیوں کی اُلٹی طرف سے اُس کے ماتھے کو سہلایا؛ اُس کے بدن میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ میں نے سیدھی انگلیاں اُس کے گالوں پر پھسلائیں اور پھر دائیں ہاتھ کی پوروں سے اُس کے ہونٹوں کو لمسا۔ کیا میرے ہاتھ کو پھسلتے ہی چلے جانا چاہیے؟ میں نے ہاتھ کو نیچے کی منزل پر روک لیا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک ہی طرح کی مسکراہٹ تھی؛ ہونٹ نیم وا اور بے تاثر۔ کچھ تو بات ہونی چاہیے! میں نے سوچا۔ ابھی تک اُس نے ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔

''بیٹھو!'' میں نے دیوار کے ساتھ رکھی کرسیوں کو دیکھتے ہوئے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ جوتا اُتار کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مجھے وہ تھکی ہوئی لگی۔ اُس نے پلنگ کی ٹیک کے ساتھ کمر لگا لی۔ میں بھی اُس کے ساتھ نیم دراز ہو گیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُس کا ہاتھ چھوٹا، بھاری، گرم اور نرم تھا۔ ''مجھے اپنا بیٹا یاد آ رہا ہے۔ کئی بار خیال آیا کہ اُسے ساتھ لے آنا چاہیے تھا۔ اُس نے رونا نہیں تھا۔'' مجھے راجندر سنگھ بیدی کا ''ببل'' یاد آ گیا۔ ''ببل'' ایک طرح یہ فرضی کہانی تھی

جس کے پسِ پردہ ایک المیہ تھا۔

''شادی شدہ ہو؟'' اچانک مجھے اپنے سوال کے سطحی پن پر افسوس ہوا۔

''نہیں!'' مجھے ہر طرف سفید چادر نظر آئی اور وہ اُس چادر کو لپیٹے ہوئے ہلکے سے مسکرا رہی تھی۔ وہ ابھی تک مسکرائے چلے جا رہی تھی۔ شاید اُسے میری حالت کا اندازہ ہو گیا تھا یا شاید وہ میرا مذاق اُڑا رہی تھی۔ ''میں بیوہ بھی نہیں اور مطلقہ بھی نہیں۔ میں دراصل.....'' وہ رکی۔ اُس کے ماتھے پر تین لکیریں بن گئیں۔ اُس نے اپنا ماتھا سہلایا۔ ''کنواری ماں ہوں۔'' سفید چادر کچھ گہری ہو گئی۔ میں نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا اور پھر یک دم خیال آیا کہ مجھے تو ایسی ہی عورت کی تلاش تھی۔ میں اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔

''گھر میں اور کون ہے؟'' میں اب ایک منصوبے پر عمل پیرا ہو چکا تھا۔

''میری بہن اور بہنوئی۔''

''انھیں بچے کے بارے میں معلوم ہے۔''

''ہاں! سب کو یہی بتایا گیا ہے کہ وہ میرا بھانجا ہے۔''

''تمھارے بہنوئی نے اعتراض نہیں کیا؟'' مجھے اُس کے چہرے یا لہجے میں کسی قسم کی جھجک، پریشانی یا اُلجھن محسوس نہیں ہوئی۔ وہ میرے پہلو میں لیٹی سامنے دیکھے جا رہی تھی۔

''نہیں۔'' وہ ہولے سے ہنسی۔

''کیوں؟'' مجھے لگا کہ میں کسی حواس باختہ عورت کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔

''کیوں کہ وہ اُس کا باپ ہے۔ وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اُس کی شادی اپنی بہن سے کروادی۔ پتا نہیں وہ کون سی گھڑی تھی جب میں نے یہ فیصلہ کیا۔ میں اُس گھڑی کو ڈھونڈتی پھر رہی ہوں اور اُسی کی تلاش میں تھی کہ آپ وہاں آ گئے۔ شاید آپ ہی اُس گھڑی کو ڈھونڈنے میں میری مدد کریں۔'' میں نے اردگرد دیکھا۔ کمرے میں کوئی رنگ نہیں تھا۔ خاکستری رنگ کے پردے اور اُسی رنگ کی پلنگ پر چادریں اور صوفہ جس پر میرا کالے رنگ کا کوٹ تضاد کی وجہ سے نمایاں لگ رہا تھا۔ اُس کا چھوٹا اور نرم ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی اور مجھے اپنے سانس کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی اور اُس کی بھی۔ مجھے یہ خاموشی وقت کو اپنے ساتھ بہاتے محسوس

ہوئی۔ مجھے لگا کہ اُس کا بیٹا اپنے صحن میں سے اُسے کہیں پکار ہی نہ لے اور یہ کہیں اُس کی پکار سن ہی نہ لے اور اُس پکار کو سن کر یہاں سے چلی ہی نہ جائے اور اگر وہ چلی گئی تو میں کہیں پیاسا ہی مر نہ جاؤں۔ میری عمر پہلے ہی قبرستان تک کا فاصلہ روز ناپتی تھی۔ میری نظر دیوار پر لگی گھڑی تک گئی۔ ایک بجنے والا تھا اور یہ کھانے کا وقت تھا۔

''میں اُس گھڑی کو ڈھونڈنے میں کیسے مدد کروں؟ میں مدد کرنے کو تیار ہوں۔'' میں اُس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔

''سچ؟'' اُس نے اپنا آپ میری طرف ایسے موڑ لیا کہ اُس کا جسم مجھے چھونے لگا۔

''ہاں! سچ!'' اُس کی آنکھیں گہری ہو گئیں۔ کمرہ ایک بار پھر خاموشی کو اپنے اوپر اُٹھائے خاموش سا کھڑا رہا۔

''وہ اب ہم دونوں کو استعمال کرتا ہے۔ میری بہن بھی اُس وقت کو ڈھونڈتی ہے جب اُس نے شادی کے لیے حامی بھری تھی۔''

''کیا وہ گھڑی ایک ہی تھی؟''

''نہیں! یہ دو مختلف گھڑیاں تھیں۔'' وہ اب سیدھی ہو گئی تھی اور ہمارے بدن اب چھو نہیں رہے تھے۔ ''ایک گھڑی نے اُسے آباد کر کے برباد کیا اور ایک گھڑی نے مجھے برباد کر کے آباد کیا۔''

''تمھیں برباد کر کے آباد کیسے کیا؟''

''یہی تو وہ گھڑی بتائے گی جس کو ہم نے ڈھونڈنا ہے۔''

اُس کی باتیں میری سمجھ سے باہر ہونا شروع ہو گئیں تھیں۔ مجھے یہ ملاقات کسی فلسفیانہ سمت میں جاتی نظر آ رہی تھی جسے میں روکنا چاہتا تھا۔ اُس وقت کھانا ہی مجھے ایک مشترک قدر لگا۔ میں نے کروٹ لے کر پلنگ کے ساتھ جڑی میز پر رکھے ٹیلی فون سے روم سروس کو بھاری کھانے کا آرڈر دینے لگا جس پر وہ میرا بازو کھینچ کھینچ کر مسلسل احتجاج کرتی رہی۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ کر خاموشی سے کھاتے رہے۔ مجھے اُس کی گم شدہ گھڑیوں کی فکر ہونا شروع ہو گئی تھی۔ کیا اُنھیں بازاروں میں کہیں پر دیکھا جا سکتا ہے؟ اگر مجھے نظر آ گئیں تو کیا اُنھیں پہچان پاؤں گا؟ میری زندگی کی بھی کئی گھڑیاں میرے ہاتھوں سے پھسل کر ایک بڑے دریا میں بہہ گئی تھیں، وہ شاید کسی مچھیرے کے جال میں تڑپ رہی ہوں! کیا

میں اُسے اپنی گھڑیوں سے شناسائی کراؤں کہ وہ اُنھیں پہچان سکے؟ پھر مجھے خیال آیا کہ جو گھڑی گم جائے دوبارہ ملتی نہیں اور میں اب بھی اپنی ہر گھڑی گِنا رہا تھا۔

کھانا ختم ہوا، برتن اُٹھ گئے اور ہم پھر بڑے سارے پلنگ پر نیم دراز تھے۔ اب وہ میرے ساتھ جڑی ہوئی تھی، شاید دور ہونے کے خوف سے۔ ''دیکھو!'' میں نے اپنی عمر کا تمام تر تجربہ اپنی آواز میں سموتے ہوئے کہا۔ میں نے مکاری کو اپنی آواز سے دور رکھنے کی بھی کوشش کی۔ ''جو گھڑی نکل جائے پکڑی نہیں جا سکتی۔ سو جو گھڑی نکل جائے اُسے پکڑا نہیں جا سکتا لیکن ری پلیس ضرور کیا جا سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ گھڑی اُسی گھڑی جیسی ہو، کم تر ہو سکتی ہے یا بہتر بھی۔'' میں نے دبے ہوئے لہجے میں اتنی شدت سے بات کی تھی کہ میں شاید تھک گیا تھا یا میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا کہ میں خاموش ہو گیا۔

وہ میرے ساتھ چمٹ ہی گئی۔

''میری بھی کتنی گھڑیاں کہیں گم گئی ہیں۔ وہ وقت کے دریا میں کسی کے جال میں اٹکی ہوئی ہیں۔ لیکن میں اُنھیں ری پلیس نہیں کرنا چاہتا۔'' اُس نے میری طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔ ''میں آگے چلنا چاہتا ہوں۔ اب بھی!'' پھر مجھے ایک دم کچھ یاد آیا۔ ''تمھارا نام کیا ہے؟''

''نام میں کیا ہے؟ کچھ بھی نام ہو! آپ نے اپنی فہرست میں اضافہ کرنا ہے؟''

میں شاید پہلی بار ہنسا تھا۔ ''تم دوسری ہو۔ اتنی مختصر فہرست ہو سکتی ہے؟'' میں پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اپنی فہرست بھی بتا دے۔ اُس نے شاید میرا سوال پڑھ لیا تھا یا شاید اُسے توقع تھی۔

''عورت کی فہرست نہیں پوچھتے۔'' اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور ساتھ چمٹے ہونے کے باوجود وہ مجھے سمٹی ہوئی لگی۔

''کیوں؟''

''تمام عمر کے لیے تعلق میں تلخی آ جاتی ہے۔'' میں خاموش رہا۔ وہ شاید کہنا چاہتی تھی کہ عورت جیسی بھی ہو قبول کر لینی چاہیے۔ ہم اب خاموش تھے۔ شاید کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ پھر میرے ساتھ جُڑ گئی۔ اُس کے بدن کی حدت میرے جسم میں سرایت کر رہی تھی۔ مجھے یہ احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔ شاید جوانی میں میرے جسم کی اپنی بھی ایک حدت ہو جو اُس کا بدن مجھے اب بہم پہنچا رہا تھا۔ مجھے

ایک گرماہٹ اور بے خودی کا احساس ہونے لگا، میں آسودگی اور طمانیت کی لپیٹ میں آ گیا۔ ہر طرف سے رنگوں کی ایک دھند پھیلنے لگی، کمرے میں ہر طرف رنگ ہی رنگ تھے اور میرے ساتھ چمٹی بے نام عورت رنگوں کی اُس دھند میں بھی مجھے نظر آتی رہی!
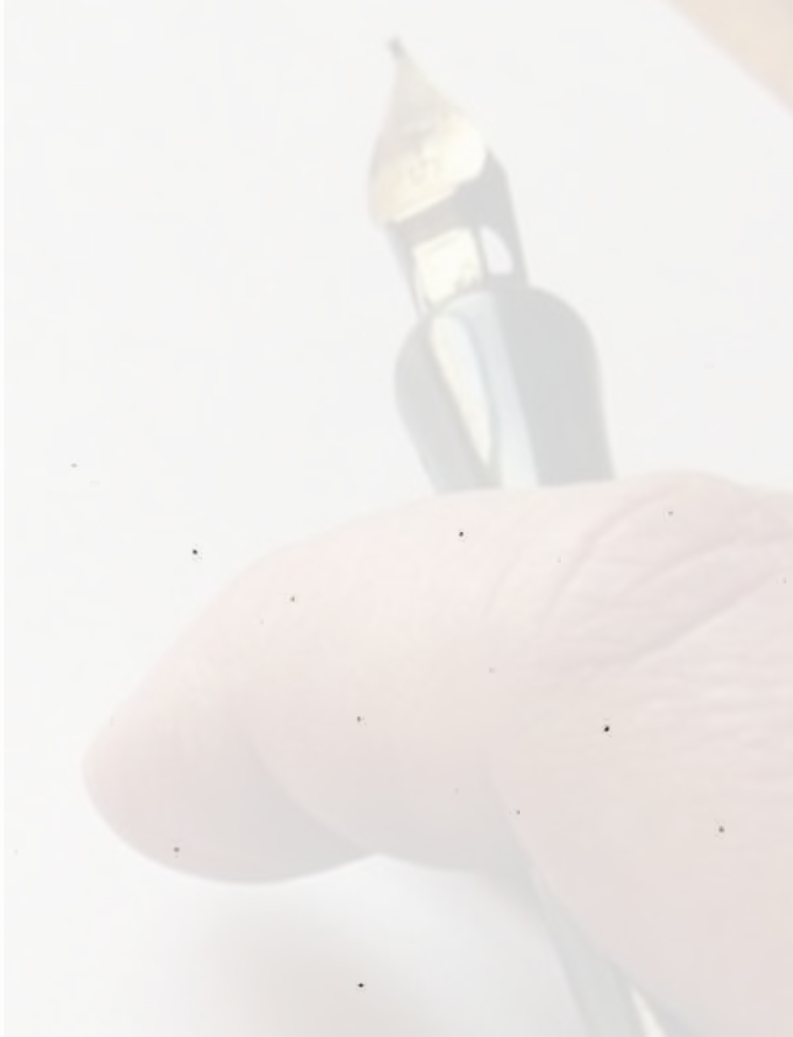
جو نظر نہ آئے

فریحہ کے لیے جب رشتہ آیا تو اُس نے اپنے والدین کو کسی طریقے سے کہلوایا کہ وہ اُس نوجوان کی تصویر دیکھنا چاہے گی جس کے لیے اُس کا ہاتھ مانگا گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ اُس نے ایسی مانگ کی تھی جو اُن کے کنبے میں ہوتا نہیں تھا، صرف والدین خاندان کو زیادہ اور ہونے والے داماد کو کم اہمیت دیتے تھے۔ وہ ابھی تک اُس پرانے اور فرسودہ نظام کا حصہ تھے جس میں دو افراد کے بجائے دو خاندان آپس میں رشتہ کرتے ہیں، اِس رشتے کے طے پا جانے کے بعد اُن دو افراد پر یہ پابندی ہوتی ہے کہ دونوں خاندانوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے جیسے بھی ہو سکے، زندگی گزار دیں، ایسی زندگی جس میں بچے تو پیدا ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے کی شناخت کا پودا جڑ نہیں پکڑ سکتا۔

فریحہ نے ایسی مانگ کی تھی جو اُس تہذیب کا حصہ نہیں تھا جس میں وہ پلی بڑھی تھی، گو اُسے تعلیم دلوائی گئی تھی، وہ ملازمت کرنا چاہتی تھی جس کی اُسے اجازت تھی، وہ اپنی دوستوں سے مل سکتی تھی، اُن دوستوں سے جنھیں گھر والے جانتے تھے، لیکن شادی کا فیصلہ والدین کا حق تھا اور یہ اُس کے ذہن نشین کرایا جاتا رہا تھا کہ رشتے کے لیے اُس کے پاس سوائے اقرار کے کوئی اور فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ سو جب اُس نے تصویر مانگی تو ٹھہرے ہوئے پانی میں لہریں ضرور بنیں، لیکن کوئی طوفان نہیں اُٹھا، شاید والدین بھی پرانے نظام سے اُکتا چکے تھے اور وہ نئی دنیا میں داخل ہونے کے لیے راستے کی تلاش میں تھے یا وہ جانتے تھے کہ ہونا وہی ہے جو وہ چاہیں گے، اِس لیے لڑکی کو بھی اِس عمل میں شامل

کرلیا جائے، جس طرح حکومتیں اقلیتوں کو شامل تو کر لیتی ہیں لیکن اختیار نہیں دیتیں۔

فریحہ نے تصویر کو غور سے دیکھا، کئی زاویوں سے معائنہ کیا، آئینے کے سامنے کھڑی ہو کے تصویر کے نقوش کا اپنے نقوش کے ساتھ مقابلہ کیا، اُسے وہ آدمی کسی بھی طرح اپنے سے کم نہ لگا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ خود تو خوب صورتی کی انتہا ہے، اور لڑکیاں اُس کی دوست بننے سے پہلے ہچکچاتی تھیں کہ اتنی خوب صورت لڑکی کے ساتھ وہ بیٹھی، یا گھومتی یا کھیلتی سجیں گی نہیں۔ فریحہ نے سوچا کہ اُس کے ساتھ ایسے آدمی کی شادی ہونی چاہیے جو شکل وصورت میں اُس سے اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہونا چاہیے۔ وہ دیکھتی رہی اور جب بھی دیکھتی، وہ مطمئن ہو جاتی، وہ چاہتی تھی کہ جس کے ساتھ اُس کی شادی ہو آدمی ایسا ہونا چاہیے جو اُس کے ساتھ سجے اور جس کے ساتھ وہ سجے۔ اُس نے بلیک اینڈ وہائٹ تصویر کی مانگ کی جس سے گھر میں طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ تصویر دکھانے کے لیے اُس کی ماں نے اُس کا ساتھ دیا تھا اور اب وہ اُس کی مخالفت میں پیش پیش تھی، اُس کے نزدیک یہ بے حیائی تھی۔

فریحہ کبھی مطمئن ہو جاتی اور کبھی کوئی پریشانی اُسے گھیر لیتی، وہ سوچتی کہ سب دنیا کی شادیاں ہوتی ہیں، اور جیسے بھی ہو لڑکیاں زندگی گزار دیتی ہیں۔ اُسے اپنے گھر میں کام کرنے والی عورت یاد آ گئی جس کی شادی کو چند سال ہوئے تھے۔ اُس کی ساس اُن کے گھر میں کام کرتی تھی اور وہ جب پہلی بار آئی تو دبلی، لمبی، کھلتے رنگ والی جوان عورت تھی اور اب اُس کے تین بچے تھے، پیٹ ڈھلکا ہوا، چھاتیاں لٹکی ہوئی، اُسے ڈوپٹے کی فکر ہی نہیں تھی کہ ڈھانپ بھی رہا ہے کہ نہیں۔ وہ ایسے نہیں ہوا کرتی تھی، ڈوپٹہ اُس کے بدن کو ڈھانپے ہوتا اور وہ چلتی بھی ایسے کہ بند بند تک نظر آئے۔ سننے میں آیا کہ وہ اپنے خاوند کو اب پسند نہیں کرتی کیوں کہ اُس کی وجہ سے وہ یہاں تک پہنچی تھی؛ اُسے اُس کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ فریحہ خوف زدہ رہنے لگی اور تصویر والا خوب صورت آدمی اُسے اپنا دشمن لگتا۔ وہ کئی بار سوچتی کہ اُس کے ذہن میں یہ خیال کیوں آ رہا تھا کہ وہ اچھا خاوند ثابت نہیں ہوگا۔ اُس کی کسی دوست کی شادی نہیں ہوئی تھی جس سے وہ ماہرانہ رائے لے سکتی اور ملازمہ کی شادی شدہ زندگی کسی بھی طرح ایک مثال نہیں کہی جا سکتی۔

فریحہ پریشان رہنے لگی اور اُس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے، اُس کی شادی کا مسئلہ ابھی تک رکا ہوا تھا جس کی وجہ اُس کی پریشانی تھی۔ اُس کے والدین اپنی مرضی سے شادی تو کرنا

چاہتے تھے لیکن اُسے مجبور بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اور یہ بھی چاہتے تھے کہ اُس کی وہی مرضی ہو جو اُن کی تھی۔ ایسے ہی پریشان دِنوں اور بے چین راتوں میں اُسے ایک خواب آیا، جو اتنا سچا لگا کہ کسی طرح بھی جھوٹا نہ لگا؛ اُس کے سب خواب ہمیشہ جھوٹے ہوتے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں تھی، اپنے ہی پلنگ پر جہاں وہ تب سے سو رہی تھی جب سے اُس کی ماں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اکیلی سوئے تاکہ اُس کے پہلو میں اپنی چھوٹی بہن کے لیے جگہ چھوڑ دے کیوں کہ وہاں اُسی کا حق ہوتا ہے جو نیا ہو، پرانے صرف اُس جگہ کی یاد میں زندگی گزار دیتے ہیں۔

وہ اُسی کمرے میں تھی جب اُس نے وہ جھوٹ دیکھا جو سچا تھا، تصویر والا آدمی جس کے چہرے پر نرمی ہے، خواب میں بھی ایسا ہی تھا لیکن ہر وقت اُسے اذیت دیتا، وہ خواب میں بھی جانتی تھی کہ یہ خواب ہے، لیکن اُس آدمی کی ہر بات کو سچ مان رہی تھی۔ وہ اِسے مارتا، گو وہ اُس کی بیوی نہیں تھی۔ وہ اُسے سردی میں باہر کھڑے رکھتا گو وہ ایک گھر میں نہیں رہ رہے تھے، وہ اُسے گرمیوں کی دوپہروں میں چھت پر بھیجتا کہ ہمسایوں کے کبوتر دیوار پر تو نہیں بیٹھے؟ وہ خوف کے مارے سب کچھ کرتی جاتی کہ اُس کے ہاتھ میں تلوار تھی اور وہ جب بھی کوئی تقاضا کرتا، ساتھ ہی تلوار کے وار سے کوئی چیز توڑ دیتا۔ اُس کا پیٹ ڈھلکا ہوا تھا: ملازمہ کی طرح۔ تب ایک طرف سے روشنی اُٹھتی ہے اور اُس روشنی میں نہایا ہوا ایسا شخص آتا ہے جو پہلے سے بالکل مختلف، اُس کا اُلٹ تھا۔ اُس کے چہرے پر خوب صورتی نام کی کوئی چیز نہیں تھی، اُس کا رنگ سیاہ، اور اُس سیاہ رنگ میں اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں، جیسے دور اُجاڑ میں دو دیے روشن ہوں، اُس کا جسم مضبوط، پٹھے اُبھرے ہوئے، ہاتھ لمبے اور اُنگلیاں مخروطی تھیں۔ اُس کے آتے ہی پورا نظارہ سہم گیا، جیسے اُس کی ہیبت قبول کر گیا ہو، جیسے وہ سب پر حاوی ہو گیا ہو، جیسے اُسے کوئی شکست نہ دے سکتا ہو۔ وہ سب سے بے نیاز وہاں کھڑا تھا اور خوش شکل آدمی اُس کی بدشکلی کے بوجھ تلے دب گیا تھا۔ فریحہ اب دونوں کو مختلف نظر سے دیکھ رہی تھی، اُس کی نظر تو ایک تھی لیکن نظارے دو اور دونوں مختلف اور وہ اُن کے تضاد کو شناخت تو کر گئی لیکن اُلجھن میں بھی پڑ گئی۔ کیا سب کی سوچ غلط تھی یا اُس اکیلی کی؟ سب خاکی یا سفید جلد کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اُسے سیاہ میں کشش نظر آئی، اور اُس کے چہرے پر نرمی تھی، اُس کے دیکھنے میں اپنائیت اور جسم میں سکون۔ فریحہ اُس کی ظاہری کیفیت اور سبھاؤ دیکھ کے آرام سے ہونے کے علاوہ پُر اعتماد بھی ہو گئی۔ خوب صورتی کیا

ہے؟فریحہ نے سوچا۔وہ جو ایک روایت کا حصہ ہے یا وہ جو غیر روایتی ہے؟یا وہ جو سب کو نظر آتی ہے یا وہ جو کسی بدصورتی کے اندر چھپی ہوئی ہے اور صرف اُسے نظر آتی ہے جو اُس کی تہہ تک پہنچ جائے۔

فریحہ نے جو خواب دیکھا وہ اُس کی سچائی سے خوف زدہ ہوگئی؛اچھی صورتیں بُری بھی ہوسکتی ہیں،اور اگر اچھی صورتیں بُری ہوسکتی ہیں تو کیا بُری بھی بُری ہی ہوں گی یا اچھی؟وہ تجربہ کرنا نہیں چاہتی تھی،وہ فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔اُس کے لیے تجربہ کرنا مشکل تھا تو فیصلہ کرنا مشکل تر لیکن اُس نے تجربہ نہیں فیصلہ کرنا تھا۔فیصلہ کرنا مشکل تر تو تھا لیکن اُس نے آسانی کے ساتھ کرلیا۔وہ تصویر والے آدمی کے ساتھ شادی کرنے کے بجائے انتظار کرے گی کہ وہ طے کرسکے کہ اُس کے لیے کون سا خاوند بہتر ہوگا؟ خوش شکل یا بدشکل؟ اُس نے سوچا کہ ہر بدصورت آدمی خوب صورت بیوی چاہتا ہے،ہر بدصورت عورت خوب صورت خاوند چاہتی ہے،خوب صورت تو چاہتے ہی خوب صورت ہیں لیکن وہ ایسی خوب صورت عورت تھی جسے خوب صورت خاوند نہیں چاہیے۔اُن کے ایک جاننے والی جو خوب صورت تھی،اُس کی شادی ایک بدصورت آدمی کے ساتھ ہوئی اور وہ شادی چند مہینے ہی چل سکی کیوں کہ وہ عورت اپنے خاوند کی بدصورتی کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کرسکی تھی۔

وہ جمالیات میں یقین رکھتی تھی،شاعری اُس کی پناہ گاہ رہی تھی،اِسی لیے وہ اُس تصویر کو بار بار دیکھتی تھی کہ اُس میں کوئی نقص تو نہیں لیکن اب اُسے احساس ہونے لگا کہ بدصورتی کی بھی جمالیات ہیں؛ایسی جمالیات جن سے اکثریت کی شناسائی نہیں۔اگر اُسے خواب جیسا آدمی نہ ملا اور وہی ملے جن سے جمالیاتی حظ نہ اُٹھا سکتی ہو تو کیا وہ ساری زندگی انتظار کرتی رہے گی؟لیکن ایسے آدمی کے ساتھ ہی شادی ہونا چاہیے جسے جمالیات کی حس قبول کرے۔فریحہ نے سوچا کہ وہ انتظار کرے گی اور تلاش بھی۔کیا اُس کے والدین اُسے انتظار کرنے دیں گے یا تلاش.....اُنھوں نے تو تصویر ایک اخلاقی رواداری کی وجہ سے دکھائی تھی۔

اُس نے فیصلہ تو کرلیا لیکن اگلا قدم اُٹھانے سے پہلے طویل سوچ کا بھی طے کیا۔وہ والدین کو راضی کرنا چاہتی تھی،وہ اُنھیں تکلیف کے بجائے آرام سے رہنے دینا چاہتی تھی،اُسے خواب اور حقیقت کے درمیان میں فرق کا بھی علم تھا،وہ خواب کے تعاقب میں حقیقت کی طاقت کو سمجھتی تھی۔اُسے معلوم تھا کہ خواب ہی زندگی کو تعمیر کرتے ہیں اور یہ بھی جانتی تھی کہ حقیقت ہی اُن خوابوں

میں رنگ بھرتی ہے۔ وہ خواب دیکھے جانا چاہتی تھی اور خواب کو حقیقت بنانے کی کوشش کو جاری رکھنا بھی اُس کا مقصد تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شادی کے بغیر وہ نامکمل رہے گی، اُسے اِس کا ادراک اپنے بدن کی پکار سے لگا جسے مرد کی ضرورت تھی لیکن وہ اِس خواہش کو دبا کے رکھے ہوئے تھی، تبھی وہ شاعری سے فکشن کی طرف مائل ہوئی اور اُس نے مغرب میں عورت کو مرد کا پابند نہیں پایا اور اُسے اپنے اندر بھی ایک ایسی ہی سوچ سر اُٹھاتے ہوئے محسوس ہوئی ،لیکن وہ محسوس کرتی تھی کہ وہاں کی عورت پر اتنی پابندیاں نہیں تھیں، جب کہ اُس پر ہر قدم پر ایک زنجیر تھی، والدین کا اُسے تصویر دکھانا بھی اُسی زنجیر کی ایک کڑی تھی۔ فریحہ نے سوچا کہ کیا وہ آزادی چاہتی تھی؟

وہ ایک اُلجھن میں گرفتار تھی، وہ ایسے آدمی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی جو خوب صورت نہ ہو اور اُس کی بدصورتی میں بھی خوب صورتی کا ایسا پہلو ہو کہ وہ پُرکشش لگے۔ اُس نے اپنے خواب کے تعاقب میں اپنے خیر خواہوں کے ساتھ ٹکر لینے کا فیصلہ کر لیا، اُس کے خیر خواہ کون تھے؟ والدین؛ کیا وہ اُس کے خیر خواہ تھے؟ یا اپنی ذمے داری پورا کرنا چاہتے تھے کہ اُن کی زندگی میں وہ کہیں بس جائے، بھلے وہ وہاں بس نہ سک رہی ہو اور وہاں نوشتہ تقدیر ٹریفک کی سُرخ بتی کی طرح راستہ روک کے کھڑا ہو جائے، وہ اُسے اپنی ذمہ داریوں کی زنبیل میں سے نکال کے باہر پھینک چکے ہوں گے۔ اگر نوشتہ تقدیر ٹریفک کی سرخ بتی کی طرح راستہ رو کے کھڑی ہے تو ایک مخصوص وقفے کے بعد وہ سبز رنگ کی بتی میں تبدیل ہو جائے گی، جو وہاں سے چلنے کا اشارہ ہوگا۔ وہ مغرب کی عورت کی طرح اپنی آزادی کا خود فیصلہ کر کے اپنی رہتل کے مطابق زندگی گزارے گی؛ وہ دو کشتیوں میں سوار ہو کے ایک ہی سفر طے کرے گی: اور وہ سفر ہوگا اپنے خواب کا تعاقب، اُسے تعبیر سے دل چسپی نہیں تھی۔

فریحہ نے تصویر والے رشتے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں گھر طویل مباحث کا دہکتا ہوا تنور بنا رہا، والدین وجہ جاننا چاہتے تھے، وہاں، جہاں رشتہ طے ہی ہو چکا تھا اور صرف ایک رسمی اقرار باقی تھا، انکار اُن کی سبکی تھی۔ وہ وجہ جاننا چاہتے تھے جب کہ فریحہ کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی، اُس کا جواز اُن کی سمجھ میں نہیں آنا تھا۔ اُس کے بعد کئی رشتے آئے اور فریحہ اپنے خواب کی واپسی کی منتظر رہی اور انتظار میں وہ ہر رشتے سے انکار کرتی رہی، یہ تب تک ہوتا رہا جب تک نوشتہ تقدیر کی لال بتی نے اُن کا راستہ نہ روک لیا اور فریحہ بتی کا رنگ تبدیل ہوتے ہی ایک اندھے سفر پر چل نکلی۔ اُسے نوکری مل

گئی، ایسی نوکری جس میں اُس کا واسطہ مردوں سے بھی پڑتا تھا اور اُسے اُس مردانہ جنگل میں اُس آدمی کی تلاش رہتی جو خوب صورت نہ ہو، وہ یہ بھی جانتی تھی کہ بدصورت لوگوں سے دنیا بھری ہوئی ہے لیکن اُسے ایسے بدصورت کی تلاش تھی جو خوب صورت ہو۔ ماں، اُس کی مصروفیت سے خوش ضرور تھی، لیکن مطمئن نہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ فریحہ کا اپنا گھر ہو جس میں وہ اپنی مرضی کی زندگی جیے، خاوند ہو جس کے ساتھ اُس کی وابستگی ہو اور اُسے محرومی کا کبھی احساس نہ ہو۔ فریحہ کو ماں کی بات سے ہمیشہ ہی اختلاف رہتا، ماں کو یقین دلاتی کہ اپنا گھر بنا لے گی جس میں وہ خاوند کے بغیر بھی زندگی گزارے گی۔ ماں کو شک گزرتا کہ فریحہ کسی کو پسند نہ کرتی ہو؟ وہ جانتی تھی کہ اگر فریحہ نے کسی کو پسند کر رکھا تھا تو اُس کے ساتھ شادی کی باپ نے کبھی اجازت نہیں دینی تھی، وہ اپنے خاوند کی سوچ سے واقف تھی۔ وہ تعلیم کے حق میں تھا اور کسی حد تک ملازمت کے حق میں بھی، ایک تعلیم یافتہ لڑکی نے اگر گھر میں ہی رہنا ہے تو اُسے پڑھانے کا کیا فائدہ؟ لیکن شادی لڑکی کی پسند سے نہیں ہو سکتی، شادی وہیں ہونی چاہیے جہاں والدین چاہیں، مرضی کی شادی آوارگی کہلائے گی۔ پھر طے کی ہوئی شادی میں مستقبل کی حفاظت کے کئی ضامن ہوتے ہیں، پسند کی شادی جیسے جڑتی ہے ویسے ہی ٹوٹ جاتی ہے۔

فریحہ اپنی نوکری میں خوش تھی۔ اُس کی شکل جاذب تھی، دفتر میں مردوں کی اکثریت تھی اور جو چند عورتیں وہاں کام کرتی تھیں، وہ ہر وقت کسی قدر احساسِ کم تری کا شکار رہتیں تھیں لیکن فریحہ نے آنے کے بعد اِس احساس کو زائل کر دیا تھا۔ اُس میں ایک اعتماد تھا جس نے دوسری عورتوں کو طاقت دی اور اُن کے رویے کی تبدیلی سے کمپنی کی کارکردگی بہتر ہوئی جس کا سہرہ فریحہ کے سر پر باندھا گیا۔ دفتر میں مردوں کی اکثریت فریحہ کے آتے ہی چوکس ہو گئی، ہر کسی کا خیال تھا کہ ایک خوش شکل اور ناتجربہ کار جوان عورت اُن کے جال میں پھنس جائے گی لیکن وہ ایسی مچھلی تھی جو جال کو پھینکے جانے سے پہلے ہی دیکھ لیتی تھی۔

آدمیوں کے اِس جنگل میں اُسے ایسے بدصورت مرد کی تلاش تھی جو خوب صورت ہو۔ دفتر کے مرد اُس کے آتے ہی سجنے لگے، وہ وہاں پہلے کام کرنے والی عورتوں کے عادی ہو چلے تھے اور اُنھیں اُن میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن فریحہ اُنھیں مختلف لگی، وہ اُسے مائل کرنے کے لیے بن سنور کے آتے اور وہ جتنا بنتے سنورتے، فریحہ کو اُتنے ہی معمولی اور غیر اہم محسوس ہوتے، اُسے جس کی تلاش

تھی وہ وہاں نہیں تھا، فریحہ جانتی تھی کہ وہ کہیں ہوگا، وہ کہیں ہے تو اُس کے خواب میں آیا، اور اگر وہ کسی پیشگی اطلاع کے بغیر اُس کے خواب میں آ سکتا ہے، اُسی طرح اُس نے زندگی میں بھی آ جانا ہے۔ وہ اُمید کے ساتھ جڑی ہوئی تھی لیکن اُس کے والدین نے اب اُمید کو ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ اُس کی ایک چھوٹی بہن تھی اور ایک بڑا بھائی، دونوں کی شادی اُس کی وجہ سے رکی ہوئی تھی کہ ممکن ہے کہ کسی موڑ پر فریحہ اپنا ارادہ تبدیل کر لے۔ اُنھیں پہلے مایوسی ہوئی اور پھر اُنھوں نے تکلیف اور دُکھ کے ساتھ اِس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ فریحہ اپنے غلط فیصلے پر قائم ہے، اُنھوں نے اُن دونوں کی شادیاں کر دیں۔ اُن کی شادیوں کے درمیان میں فریحہ ایک احساس جرم کا شکار رہی، اُسے محسوس ہوتا کہ اُن دونوں کی شادیوں میں تاخیر اُس کی وجہ سے تھی اور وہ کسی حد تک اپنے والدین کی سبکی کا بھی سبب بنی تھی، لیکن پھر اُس نے اپنے آپ کو مضبوط کیا، زندگی کا ہر فیصلہ کسی کو خوش کرنے کے لیے نہیں کیا جاتا اور نہ تکلیف دینے کے لیے، فیصلوں میں اپنا مفاد، دل چسپی اور خود غرضی بھی شامل ہوتے ہیں، اُس کے بھائی اور بہن کی شادی میں والدین کی خود غرضی تھی اور اگر وہ اپنی شادی کے لیے رضامند ہو جاتی تو اُس میں بھی اُن خود غرضی کو دخل تھا اور اُس کے انکار سے اُنھیں جو دکھ پہنچا وہ اُن کے کسی نہ کسی مفاد کے منافی تھا۔

فریحہ نے رہائش والدین کے گھر ہی رکھی، گو کمپنی اُسے رہائش دینا چاہتی تھی، لیکن وہ اپنے گھر میں خود کو محفوظ تصور کرتی تھی۔ وہ اپنے گھر میں اب ایک اجنبی تھی، گھر کے معاملات اب اُس کے لیے اہم نہیں تھے، وہ دفتر سے آ کے اپنے کمرے میں کسی نہ کسی طرح کسی مصروفیت میں اُلجھی رہتی، اُسے اپنے ماں، باپ اور بھابھی سے کچھ شرمندگی بھی ہوتی، لیکن پھر وہ خود کو سنبھالتی کہ ہر کسی نے اپنی زندگی جینا ہے، وہ مرحلہ وار سب کا سامنا کرنے لگی اور کچھ عرصے کے بعد گھر کے معاملات کا حصہ بن گئی جو اُس کی ماں کے لیے باعثِ اطمینان اور تکلیف تھا، فریحہ کبھی اُسے وہاں غیر اہم پرزہ محسوس ہوتی، وہ چاہتی کہ فریحہ وہاں مزید نہ رہے، وہ اپنے بھائی اور بھابھی کی زندگی میں ایک رکاوٹ محسوس ہوتی اور ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو والدین کے لیے ایک بیساکھی بھی محسوس کرتی، اُن میں سے کسی کی جب طبعیت خراب ہوتی تو فریحہ ہی فوری طبی امداد کا بندوبست کرتی۔

فریحہ آہستہ آہستہ گھر کی زندگی میں شمولیت اختیار کرنے لگی۔ وہ صبح ساڑھے سات بجے گھر سے نکل جاتی اور اُس کا شام چار بجے تک دفتر میں رہنا لازمی تھا۔ وہ دفتر سے آنے کے بعد اب اپنے

والدین کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزارتی، اُسے ایسا کرتے وقت گہرے سکون اور ہٹ دھرمی کا احساس ہوتا۔ اُسے خوشی ہوتی کہ وہ اپنے والدین کے کام آرہی تھی، وہ اُنھیں دوا پلاتی، گھومنے کے لیے باہر لے جاتی اور آہستہ آہستہ اُنھیں یقین ہونے لگا کہ تقدیر کا ہاتھ بہت لمبا ہے اور فریحہ کی شادی اِس لیے نہیں ہوئی کہ وہ اُنھیں بڑھاپے میں سنبھالے رکھے۔

فریحہ کے دفتر کے معمول میں کوئی فرق نہیں تھا، دفتر بھی اُسی طرح مردوں کا جنگل تھا اور وہ اُس جنگل کی مانوس روشوں پر چلتی رہتی۔ اُسے عورت کی کمزوری کے بارے میں مکمل جان کاری تھی اور وہ عورت کی طاقت سے بھی واقفیت رکھتی تھی، وہ دفتر میں اب ایک متوازن رویہ اپنائے ہوئے تھی، وہ اگر کسی کے نزدیک نہیں تھی تو اُس سے دور بھی نہیں تھی۔ یہ نزدیکی اور دوری اُسے اوپر نیچے ہونے والے تختے کے جھولے کی طرح لگا اور اِس تختے پر جھولتے ہوئے اُسے اپنی تنہائی کا احساس ہونے لگا، وہ سوچتی: کیا اُس کا فیصلہ درست تھا؟ ایسے تو نہیں کہ اُس نے ایک خواب کے تعاقب میں اپنی زندگی گلا دی ہو؟ اِس تنہائی کو دور کرنے کے لیے اُس نے اپنے اور دوسروں کے درمیان میں دوری ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب وہ اپنے مرد رفقاً کار سے ایسے ملتی جیسے وہ اُنھیں شروع سے ہی جانتی ہو؛ اُن کے ساتھ اُس کی شناسائی نئی بھی نہیں تھی، وہ صرف ایک دوسرے کے قریب نہیں تھے، وہ تو اُس کا قرب چاہتے تھے لیکن فریحہ نے ہی بیچ کی کھائی کو کبھی کم نہیں ہونے دیا۔ وہ شناسا ہوتے ہوئے بھی اجنبی تھے، مگر اب اُس نے یہ اجنبیت کم کردی تھی۔

ماں اور باپ نے ایک دِن جانا ہی تھا اور وہ چلے گئے۔ دونوں کے جانے کے بیچ میں زیادہ وقفہ نہیں تھا، لیکن وہ چاہتی تھی کہ وقفہ ہو، جب باپ فوت ہوا تو اُس نے چاہا کہ ماں کچھ عرصہ زندہ رہے لیکن وہ اپنے خاوند کی جدائی کو شاید سہہ نہ سکی اور جلد ہی وہ بھی چلی گئی۔ فریحہ کے اپنے بھائی کے ساتھ تعلقات میں ایک کھچاؤ پیدا ہوگیا تھا، اِس کھچاؤ کی کوئی وجہ تو نہیں تھی، اُسے معلوم تھا کہ بعض واقعات کسی وجہ کے بغیر ہی رونما ہوجاتے ہیں۔ جہاں اُس کے بھائی کے ساتھ تعلقات میں ایک کھچاؤ تھا، اُس کی بھابھی کافی قریب تھی اور وہ اُسے اکثر بتاتی کہ ساتھی کے بغیر زندگی گزارنا دراصل زندگی ضائع کرنا تھا۔ فریحہ کو شروع میں تو نہیں لیکن بعد میں یہ خیال آنے لگا کہ بھابھی کہیں اُسے کسی کے ساتھ تعلق بنا کے رہنے کا تو نہیں کہہ رہی؟ اُس نے کئی بار پڑھا تھا کہ کئی مردوں کے اُس جیسی عورتوں کے ساتھ

تعلقات ہوتے ہیں اور کئی عورتوں نے بھی اپنی تنہائی ختم کرنے کے لیے مردوں کا سہارا لیا ہوتا ہے۔ کیا وہ چاہتی تھی کہ فریحہ بھی ایسے ہی کرلے؟ فریحہ نے بھابھی کی بات پر اکثر غور کیا۔ اُسے اپنے اردگرد وہی مرد نظر آتے جن کے ساتھ وہ شادی کرتو سکتی تھی لیکن نہیں کی کیوں کہ وہ اُس کے ذہنی خاکے میں رنگ نہیں بھرتے تھے، اور اگر اُس نے اب یہی کرنا تھا تو کئی سال پہلے تصویر والے آدمی کو کیوں ٹھکراتی جس کا تب بھی قصور نہیں تھا۔ اُس آدمی کی شکل یاد آتے ہی اُسے ایک محرومی اور تنہائی کا احساس ہوا، اُس نے پھر سوچا کہ کیا اُس کا فیصلہ درست تھا؟ کیا کوئی بدصورت آدمی دنیا میں موجود بھی ہے؟ قدرت کی بنائی ہوئی دنیا میں بدصورتی نام کی کوئی چیز نہیں تو وہ بدصورتی کی جمالیات میں کیوں پناہ ڈھونڈ رہی تھی؟ اُس پر اچانک کھلا کہ دنیا میں سب کچھ خوب صورت ہے اور اِسی خوب صورتی کے اندر کہیں نہ کہیں بدصورتی بھی ہے جو خوب صورتی کا ہی حصہ ہے۔ فریحہ پریشان ہوگئی۔ اُسے اپنا فیصلہ پہلی بار غلط محسوس ہوا، وہ رو پڑی۔ اُس کے آنسو اُن ضائع ہوئے سالوں کے بجائے اُن سالوں کے کھو جانے پر تھے جنھیں اُس نے اپنی ایک نادانی کے سپرد کیے رکھا اور اب اُن کو ڈھونڈ نکالنا ممکن نہیں تھا، وہ مائع بن کے بہہ چکے تھے۔ اُس کے ذہن میں کئی ایسے ناکام نظریے آئے جنھوں نے قوموں کو تباہی کے کنارے تک دھکیل دیا تھا اور وہاں سے کوئی اُنھیں اپنی دانش سے واپس لے آیا تھا۔ کیا اُس کے ساتھ بھی ایسے ہی ہو رہا ہے؟ کیا اُس کی سوچ اُس کی بربادی کی وجہ تھی؟ وہ قطعاً برباد نہیں تھی، لیکن وہ آباد بھی تو نہیں تھی، عورت تبھی آباد ہوتی ہے جب اُسے کسی کے ساتھ محبت ہو اور پھر اُس کی ہو سکے یا نہ ہو سکے لیکن اُسے کسی نہ کسی طور چکھ تو لے۔ اُس نے نہ تو کسی کے ساتھ محبت کی اور نہ ہی کسی کو چکھا۔

اُسے تصویر والا آدمی کیوں یاد آیا؟ فریحہ نے سوچا کہ بعض سوچیں جہاں زندگی کا رُخ کسی طرف موڑ دیتی ہیں وہاں کچھ یادیں بھی زندگی کو صحیح راستے پر ڈال دیتی ہیں۔ کیا اُس آدمی کا پتا چلایا جا سکتا ہے؟ لیکن وہ اُس آدمی کا کیوں پتا چلائے؟ وہ رد کیا جا چکا تھا۔ اُس کی کمپنی کا اصول تھا کہ جو کوئی اِس لیے نہ رکھا جائے کہ معیار پر پورا نہیں اُترتا، اُسے کبھی نہیں رکھا جاتا تھا، چاہے وہ اپنا معیار بڑھا ہی کیوں نہ لے۔ تب وہ آدمی خوش شکل تھا اور اتنے سال گزر جانے کے بعد کیا وہ بدصورت ہو چکا ہوگا اور اگر ایسے ہوا تو وہ اپنی کمپنی کے اصولوں کی پاسداری کرے گی؟ اب ایک تجسس اُس پر سوار ہونے لگا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اتنے سال گزرنے کے بعد وہ خود بھی اُتنی پُرکشش نہ رہی ہو۔ اُسے بھابھی کی باتیں بھی

اکثر یاد آتیں کہ عورت کو کسی نہ کسی طرح آدمی کی ضرورت ہوتی ہے، مرد کے بغیر اُس کی تکمیل نہیں ہوتی، مرد کے بغیر وہ ایسے ہی ہے جیسے درخت جس کا سایہ ہی نہ ہو۔ کیا وہ ایک مرد رکھ لے یا ایسے حالات پیدا کرے کہ کوئی مرد اُسے رکھ لے۔ فریحہ کو اپنی اِس سوچ پر افسوس ہوتا، مایوسی ہوتی، غصہ آتا، پریشانی ہوتی کہ وہ اتنی نا آسودگی محسوس کر رہی ہے۔ لیکن وہ سوچتی رہتی کہ ایسا کیوں ہے؟ کہیں بھابھی اُس کے ساتھ کوئی کھیل تو نہیں کھیل رہی؟ اُسے بعض اوقات یہ بھی محسوس ہوتا کہ بھابھی شاید اُس کے بھائی کے ساتھ رہنے پر خوش نہیں کہ ایسے تکمیل کے مشورے کوئی بے تکمیل ہی دے گا۔ پھر اُسے ایک عجیب قسم کا خیال آتا: کیا وہ آدمی تکمیل پا گیا ہوگا؟

وہ آدمی اب فریحہ کی سوچ میں رہنے لگا۔ وہ مطمئن تھی اور پریشان بھی، وہ ایک عجیب قسم کی سوچ کی گرفت میں تھی۔ وہ اُس آدمی کا پتا چلانا چاہتی تھی اور اپنی سوچ سے جان چھڑانا بھی اُس کا مقصد تھا۔ وہ اُس کا تب ہی پتا چلا سکتی تھی اگر اُس کا نام معلوم ہو۔ وہ جانتی تھی کہ جدید ذرائع اتنے کارگر تھے کہ اگر کسی کا نام معلوم ہو تو اُسے ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ سب سے پہلا کام اُس کے نام کا پتا چلانا تھا اور اُس نام کے متعلق اگر کسی کو علم تھا تو وہ اُس کا بھائی تھا۔ وہ اپنے بھائی سے کسی نہ کسی طرح تو پوچھ ہی سکتی تھی لیکن اُس نے بھائی سے معلوم کرنا اتنا ہی مشکل جانا جتنا اُس آدمی کا سراغ لگانا۔ پھر اُسے اپنی بھابھی کا خیال آیا اور فریحہ نے اِس سوچ کو خوش آمدید کہا۔ اُس نے ایک طویل اور پُرپیچ تمہید کے بعد بھابھی سے پوچھ ہی لیا۔ بھابھی کو اُس آدمی کے متعلق جاننے میں کچھ دِن لگے لیکن ایک دِن اُس نے فریحہ کی مشکل حل کر دی۔ اُس کا نام محمد اشرف تھا اور اُس نے کئی برسوں پہلے والا معلوم پتا بھی بتا دیا جو وہ اپنے خاوند سے کئی کریدوں کے بعد حاصل کر سکی تھی۔ اب فریحہ نے گوگل پر محمد اشرف کی تلاش شروع کر دی۔ اُسے محمد اشرف کے متعلق معلومات حاصل کرتے چند ہفتے لگ گئے۔ فریحہ کے ذہن میں محمد اشرف کی تصویر تو تھی ہی، اُس نے ایک طویل فہرست میں سے جن تین ناموں کا آخری انتخاب کیا اُن میں ایک کی تصویر نہیں لگی ہوئی تھی اور باقی دو کی تصویریں مطلوبہ محمد اشرف کی نہیں تھیں، سو ایک ہی محمد اشرف تھا جس سے اُس نے ملنا تھا اور فریحہ نے اُس سے ملاقات کے امکانات پر غور کیا۔ وہ اِس ملاقات کو کسی طرح سے اتفاقیہ بنانا چاہتی تھی، اُس نے فکشن کے مطالعے کے بعد اتفاقات کی اہمیت کو جان لیا تھا اور وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ ایک اتفاق نے اُس کی زندگی کو کیسی کیسی محرومیوں اور آزمائشوں سے

بھر دیا تھا اور اب وہ ویسے ہی اتفاق کا ایک اور تجربہ کرنا چاہتی تھی۔

محمد اشرف کسی سرکاری دفتر میں معقول سے عہدے پر کام کر رہا تھا، فریحہ اپنی کمپنی کا خود ساختہ مسئلہ لے کے ایک دِن محمد اشرف کے دفتر پہنچ گئی اور اُس سے مل کے فریحہ کو حیرانی ہوئی۔ محمد اشرف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، وہ اُسی طرح تھا جیسے کہ دو ہائی کے لگ بھگ پہلے والی تصویر میں، صرف گردن کے نیچے کی جلد میں کساوٹ نہیں رہی تھی۔ اُس نے سوچا: کیا اتنے برس اُس پر بھی اثر کیے بغیر ہی گزر گئے ہیں یا اُس کا چہرہ کسی طور تبدیل ہوا ہے۔ یہ اُسے کوئی نہیں بتا سکتا، آئینہ بھی نہیں، وہاں تو وہ خود کو روز دیکھتی ہے اور وہی دیکھتی جو ہر روز دیکھتی ہے۔ محمد اشرف اُسے دیکھتا تھا، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے اور وہ کئی اُلجھنوں کے جمگھٹوں میں گھری اُسے دیکھتی تھی.....!

شر ینہہ کے پھولوں کی مہک

ابھی بہار اختتام پذیر نہیں ہوئی تھی۔ اپریل کے آخری دِن تھے اور بستی کے ارد گرد شر ینہہ کے پھولوں کی مہک وہاں کی بد بو اور گھٹن میں ٹھہری ہوئی بے بسی کو اپنے کندھوں پر لیے ارد گرد ہی بسیرا کیے ہوئے تھی۔ شر ینہوں کے سبز پتوں میں مہکتے ہوئے زرد پھول اپنے اندر سے خوشبو کے جھونکے باہر پھینکے جا رہے تھے جہاں بستی کی اپنی حیات اُنھیں اپنے ہی ڈھنگ سے خوش آمدید کہتی اور کوئی بھی اُس مہک کو اپنے اندر جذب نہ کرتا یا اُنھیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ارد گرد ایسی خواب ناک خوشبو ہے کہ روح تک معطر ہو جائے یا وہاں بسنے والوں کی روح تھی ہی نہیں، اُن کے صرف جسم تھے جو چلتے پھرتے تو تھے لیکن محسوس کچھ نہیں کرتے تھے۔ اُسی بے حسی کی بے بسی میں زاہدہ بھی اپنی زندگی کر رہی تھی۔ وہ جوان تھی اور اُس کی جوانی میں ایک تناؤ تھا جسے ڈھانپنے کے لیے لباس کی ضرورت تھی اور اُس ضرورت کو اُس کی جوانی کی ہٹ ہی پورا کر رہی تھی۔ اُسے اپنی زندگی پر حیرت ہوتی۔ وہ سوچتی: کیا وہ زندہ ہے یا اُن مُردوں میں شامل ہے جو ہر وقت اپنے مرنے کی جگہ پر موجود ہوتے ہیں؟ اُسے خیال آتا کہ وہ اکیلی ہے۔ وہ اکیلی کیوں تھی؟ بستی میں ہر جھگی میں لوگ آباد تھے جب کہ وہ اپنی جھگی میں اکیلی ہی جیے جا رہی تھی۔ اُس کا ایک ہی پہناوا تھا جو اُس پر پورا نہیں آتا تھا اور وہ خود کو اُس میں چھپاتی بھی نہیں تھی۔ چھپاتی بھی کیسے؟ وہ چھپا ہی نہیں سکتی تھی کیوں کہ اُس کا لباس پرانا اور جوانی بالکل تازہ تھی؛ شر ینہہ کے پھولوں سے نکلتی مہک کی طرح، الگ بات کہ نکلنے کے بعد وہ بستی کی غلاظتوں سے اُٹھتی بد بو میں خود کو

کھودیتی۔

وہ اکیلی تھی! اُس کی کوئی ماں نہیں تھی اور نہ ہی کوئی باپ اور وہ اُنہی لوگوں کی وجہ سے زندہ تھی جو اُس کے کچھ نہیں لگتے تھے اور جنھیں وہ پسند نہیں کرتی تھی اور جو اُسے بھی پسند نہیں کرتے تھے لیکن پھر بھی اُسے سہارا دیے ہوئے تھے۔ وہ سوچتی: کیا وہ کسی کی کوکھ سے پیدا ہوئی تھی؟ اگر وہ کسی کی کوکھ میں سے ایک جان لیوا، مختصر مگر طویل سفر طے کر کے روشنیوں، گندگیوں اور بدبوؤں میں آئی تھی تو کیا اُس کوکھ کا دامن صاف اور شفاف تھا؟ کیا وہ کسی مرد کے اُس قطرے کے بغیر ہی وجود پا گئی تھی جس کے بغیر وجود نہیں بنتا؟ اُس کی کوئی ماں نہیں تھی لیکن وہ ماؤں کی گود میں ہی پلی۔ اُسے پالنے والیاں اُسے وبالِ جان سمجھتیں لیکن پھر بھی پالے جاتیں؛ پہلی عورت جس نے اُسے مرنے سے بچایا اُس کے بارے میں زاہدہ کو کوئی علم نہیں تھا، یہاں تک کہ کسی کو نہیں تھا۔ وہ عورت اُسے اپنی پڑوسن کے حوالے کر کے خود کہیں چلی گئی۔ کیا وہ کسی کے ساتھ بھاگ نکلی تھی یا کوئی اُسے بھگا کے لے گیا تھا یا اُس نے کوئی اور زندگی اپنانے کا فیصلہ کر کے شرینہ کے پھول کھلنے سے پہلے ہی اپنا الگ باغیچہ بنا لیا تھا؟ دوسری ماں اُسے یاد تھی۔ وہ سیاہ رنگت کی ایک بھاری عورت تھی جو ہر وقت حالتِ جنگ میں رہتی۔ اُسے کوئی بھی موسم پسند نہیں تھا اور کسی نے کبھی اُس کی آنکھوں میں محبت کی نرمی نہیں دیکھی تھی۔ اُس کی اگلی ماں دوسری کے برعکس ایک دبلی، نازک عورت تھی جس کے ہونٹ ہمیشہ کھلے رہتے اور وہ زاہدہ کو پہلو میں لیے اپنے ماتھے سے تنگ آنگن میں لیے پھرتی رہتی۔ زاہدہ اپنی پچھلی ماں کے ساتھ بالکل بھی ہلی نہیں تھی اور اُسے دیکھتے ہی رونا شروع کر دیتی تھی لیکن یہ ماں اُس پر ہر وقت محبت نچھاور کرتی رہتی۔ پھر اچانک اُس ماں کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ اُن کے تنگ صحن میں عسرت کی کشادگی بھری ہوئی تھی اور اُس کے خاوند نے فیصلہ کرنا تھا کہ بیوی کو دوا مہیا کرے یا بغیر جڑوں والے اِس پودے کی آبیاری کرے۔

زاہدہ کو بستی کا ایک بے اولاد جوڑا لے گیا!

آدمی دیہاڑی دار تھا اور عورت کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا کرتی تھی۔ اُس کے پاس چند صاف اور رنگ دار جوڑے تھے جنھیں وہ ایک ترتیب سے پہنتی اور ہمیشہ اُنھیں صاف رکھتی۔ وہ زاہدہ کو بھی ساتھ لے جاتی۔ بستی والے شاید کچھ اندازے لگاتے، چند افواہوں کو جنم دیتے اور چند چشم دید واقعات بھی ہوتے لیکن زاہدہ کا ساتھ ہونا سب کا اپنے کام سے کام رکھنے کے لیے کافی تھا اور زاہدہ وہ

سب دیکھتی جو اُسے اگلے دِن تک بھول چکا ہوتا۔ وہ چند عورتیں تھیں جو روز نئے مردوں کے ساتھ بیٹھتیں، باتیں کرتیں، چہلیں ہوتیں، کبھی اندر اور کبھی صحن میں آنا اور جانا ہوتا جو وہ شروع شروع میں دل چسپی اور بعد میں اُکتاہٹ کے ساتھ دیکھتی۔ وہ یہ سب یاد رکھنے کے لیے نہیں دیکھتی تھی اور اُس نے وہاں کیا دیکھا اُسے آج بھی یاد نہیں تھا۔ اُسے کچھ بھی یاد نہیں تھا لیکن وہ زندہ تھی اور بستی والے اُس کے مخالف تھے اور سر پرست بھی۔ شناختی کارڈ بنانے والی سرکاری گاڑی جب بستی میں آئی تو ہر بالغ نے اپنا کارڈ بننے کے لیے دیا اور زاہدہ بھی گئی لیکن وہ افسروں کے سوالات کے جواب نہیں دے سکی۔ اُس کا کوئی باپ نہیں تھا اور کوئی ماں بھی نہیں تھی اور بستی میں بھی کسی کو نہیں پتا تھا اور نہ ہی کوئی اپنا نام دینے کو تیار تھا؛ وہ سب تو بس اتنا جانتے تھے کہ وہ اُسے وہاں دیکھے جا رہے تھے۔ ایک دِن وہ نہیں تھی اور اگلے دِن ایک کھردرے سے کپڑے میں لپٹی پہلی عورت کی گود میں تھی اور پوری بستی والے سارا دِن اُسے دیکھنے کے لیے آتے رہے اور سوال پوچھتے رہے اور اُس کا ایک ہی جواب تھا کہ شاید وہاں سے آئی ہو اور وہ آتے جاتے آج بھی اُسے دیکھتے کہ شاید وہ وہاں واپس چلی گئی اور پھر وہ اوپر آسمان کی طرف دیکھتے۔ بستی کی عورتیں قریب کی کالونی میں کوئی نا کوئی کام کرتیں تھیں اور جنھیں کوئی کام نہیں ملتا تھا وہ بھیک مانگ لیتیں۔ زاہدہ کو کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اُسے کچھ کھانے کو مل جاتا اور کبھی کبھار اُس کا تنگ لباس کسی اور تنگ لباس سے تبدیل ہو جاتا۔ وہ تنگ سی جھگی میں بیٹھی رہتی اور اپنی زندگی کے بے زندگی پن پر غور کرتی رہتی۔ وہ اُسے کہیں جانے کیوں نہیں دیتے تھے؟ وہ اکثر پوچھتی اور اُسے جواب ملتا کہ وہ اُن کے پاس ایک امانت تھی۔ وہ کس کی امانت تھی؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اُسے یہی بتایا جاتا کہ چوں کہ اُس کی ماں کو کم از کم کسی کو ہی دیکھنا چاہیے تھا، باپ تو کوئی بھی ہو سکتا تھا اور چوں کہ وہ بغیر ماں کے پیدا ہوئی تھی اِس لیے وہ کسی ان دیکھی طاقت کی امانت تھی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے سنبھالے ہوئے تھے کیوں کہ اُنھیں اُس طاقت کا خوف تھا۔ زاہدہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن وہ بھاگتی تب جب اُسے اپنی منزل کی خبر ہوتی۔ چناں چہ وہ اپنے بے زندگی پن میں گم زندگی سے نالاں ،زندہ تھی۔

جھگی کا صحن نہیں تھا۔ جھگی اتنی کھلی تھی کہ اُس میں ایک چار پائی آسکتی تھی اور دو یا تین موڑھے یا پیڑھیاں۔ چھپر کی ایک دیوار پر کیل نما لکڑی کا باریک ڈنڈا تھا جس پر گرمیوں یا حبس کے دنوں میں وہ

اپنے ڈوپٹے جیسا کوئی ٹکڑا ٹانگ لیتی یا دروازہ بند کر کے برہنہ لیٹی رہتی۔ وہ بعض اوقات سوچتی: اُسے یہ جھگی دے دی گئی تھی اور اُس کے سرپرست اُس سے نفرت کرنے کے باوجود اُسے سنبھالے ہوئے تھے اور اُنھیں اُس کے ناراض ہونے کا دھڑکا لگا رہتا تھا اور وہ سوچتی کہ وہ وہاں سے کیوں جائے؟ وہ محفوظ ہے اور چوفیرا اُس کا محافظ۔ یہ سوچتے ہوئے کسی حد تک اُسے تسلی بھی ہوتی اور وہ کہیں جانے کا خیال ترک کر دیتی۔

وہ اپنی جھگی میں کچے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ہوئی تھی۔ سال میں ایک مرتبہ بستی والے اُس کے فرش کی لپائی کر دیتے۔ وہ فرش چکنا اور ہموار تھا کہ وہاں بیٹھنا جسم کے نچلے حصے کے لیے کسی طرح بھی غیر آرام دہ نہیں تھا۔ وہ وہاں بیٹھی ہوئی تھی اور بہار کے آخری دنوں کی مستی اُس کے بدن میں رچی ہوئی تھی کہ وہ اندر داخل ہوا۔ زاہدہ کو باہر موٹر سائیکل کے بند ہونے کی آواز نہیں آئی، شاید اُس کے کانوں میں بہار کے آخری دنوں کی دھنیں بج رہی تھیں۔ زاہدہ نے اُسے تب دیکھا جب اُس نے موٹر سائیکل کو کھڑا کیا اور اپنی جناح والی کی نقل ٹوپی اُتار کر کھونٹے پر ٹانگی اور چارپائی پر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد اُس نے سگریٹ سلگایا۔ وہاں ایک طویل خاموشی تھی جس میں سگریٹ کا نیلگوں دھواں لہراتا تھا۔ وہ آدمی جوانی کی منزل سے گزر چکا تھا اور زاہدہ کو اُس کے چہرے کے کھردرے پن سے کچھ خوف بھی آیا اور کچھ ہمت بھی بندھی۔ وہ اُسے بستی کے مردوں سے مختلف لگا۔ بستی کے مرد جب اُسے دیکھتے تو اُن کے دیکھنے میں مردانگی کے بجائے خوف ہوتا تھا اور یہ آدمی جس کا چہرہ کھردرا تھا اور جو اب جوان نہیں رہا تھا، اپنی طرف اور نظر سے دیکھتے ہوئے محسوس ہوا۔ اُس نظر میں درخوات تھی اور حکم تھا، ایک کھلم کھلا اور چند مخفی پیغام تھے جنھیں وہ نہیں سمجھی۔ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ آنے والا بستی کے مردوں سے یقیناً مختلف تھا۔ وہ شاید وہاں سے بھیجا گیا تھا جہاں سے وہ آئی تھی اور ممکن ہے اب وہ اُس کا محافظ ہو اِسی لیے وہ بے تکلفانہ انداز میں اندر چلا آیا تھا ورنہ بستی کا ہر مرد اندر آنے سے پہلے آواز دیتا اور یا پھر گلہ صاف کرتا۔

''میں تمھیں ملنے آیا ہوں!'' اُس کی آواز بھاری اور ایک ٹھہراؤ لیے ہوئے تھی۔ وہ چاہتی تھی نو وارد کوئی اور بات کرے تاکہ اُس کے وجود کے ساتھ اُس کی آواز بھی کمرے کو بھر دے۔ اُس کی بھاری آواز سن کے اُسے اپنا آپ بھی خالی محسوس ہوا۔ وہ جواب دینا چاہتی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ

کیوں ملنے آیا تھا وہ لیکن اُسے اپنا گلا بند محسوس ہوا۔ وہ خواب کی اُس کیفیت میں تھی جہاں وہ اپنے ساتھ زیادتی کرنے والے کے رحم و کرم پر ہوا کرتی ہے۔ زاہدہ صرف اثبات میں سر ہلا سکی اور پھر بغیر دعوت کے وہ اُس کے پاس جا بیٹھی۔ اُسے وہاں بیٹھ کے عجیب قسم کی گھٹن محسوس ہوئی۔ وہ اِس طرح مردانہ قرب کی عادی نہیں تھی۔ آدمی کے پاس سے ملی جلی ہوئی خوشبو آ رہی تھی جس میں پسینہ، سگریٹ اور مردانگی کی کھٹی سی بو شامل تھی اور وہ اچانک اُس کھٹی سی بو میں بہنے لگی۔

''میں تمھارے جیسی عورتیں ڈھونڈتا ہوں۔ مجھے ایک عرصے سے معلوم تھا کہ تم یہاں ہو اور کوئی مرد تمھارے پاس نہیں آیا۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ زاہدہ کوئی جواب دے لیکن وہ خاموش رہی۔ اب وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ وہ کس طرح کی عورت تھی جس کی اُسے تلاش تھی۔

''کیسی عورت؟'' زاہدہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اُس کا بات کرنے کا ارادہ نہیں تھا اور اُسے اپنی اِس بے اختیاری پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ کچھ خوف زدہ اور کچھ شرمندہ سی سکڑ کے بیٹھ گئی۔ اُس آدمی نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور زاہدہ کو ساتھ لگانے کے بجائے خود اُس کے ساتھ لگ کے بیٹھ گیا۔ زاہدہ کو اُس کے جسم کی گرمی اور پٹھوں کی سختی نے مستی سے بھرنا شروع کر دیا اور وہ ایک دم تھوڑا ہٹ کے بیٹھ گئی۔ وہ چاہتی نہیں تھی کہ الگ ہو کے بیٹھے لیکن اُسے یہی مناسب لگا۔

''میں ایسی عورتیں ڈھونڈتا ہوں جن کو کسی مرد نے چھوا نہ ہو، کہیں سے بھی۔'' پھر اُس نے زاہدہ کی رانوں کو چھوا، ''یہاں بھی نہیں۔ ایسی عورت جو کسی مرد کی پہنچ میں نہ آئی ہو۔'' زاہدہ سکتے میں اُسے دیکھنے لگی۔ اُس نے سوچا: کیا یہ ممکن ہے؟

''ایسی خبر کیسے ملتی ہے؟'' اب وہ خوف زدہ ہونے کے بجائے متجسس تھی۔ وہ جو کسی کی نہیں تھی اور جس نے کسی کو قبول نہیں کیا تھا خود کو اِس کھوجی کی طرف مائل ہوتے محسوس کر رہی تھی۔

''میں جنگلوں میں پلا ہوں۔'' وہ ایک بھاری قہقہہ لگا کے ہنسا۔ ''جنگل میں رہنے والا سونگھ کے اپنے شکار تک پہنچتا ہے۔ میں سود پر پیسے دیتا ہوں۔ کچھ لوگ اِسے حرام کاروبار کہتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ کوئی کاروبار حرام نہیں، صرف کاروبار ہوتا ہے۔ میں اپنی سواری پر وصولی اور پیسے دینے کے چکروں میں بستیوں میں پھرتا رہتا ہوں۔ یہ بستیاں جنگلوں کی طرح ہیں اور میں یہاں ہی بستا ہوں۔ اب تمھارے پاس آ گیا ہوں۔ میں تمھیں اپنی مردانگی سے فتح کروں گا۔''

آدمی نے زاہدہ کو ہاتھ سے پکڑا اور اپنے ساتھ لگا کر اُسے چارپائی پر احترام کے ساتھ لٹا لیا! دروازہ تو تھا نہیں، نہ کسی نے اندر جھانکا اور نہ ڈھیلی چارپائی نے کراہیں بھریں۔ زاہدہ مکمل ہوتے جا رہی تھی۔ اُسے لگا کہ وہ کسی غیبی مخلوق کے بجائے اردگرد بسنے والی عورتوں کی طرح ایک عورت ہی ہے اور پھر اُسے شک گزرتا کہ کوئی ابھی تک جھانکنے کیوں نہیں آیا؟ اُس نے پہلی بار کسی سے کچھ مانگا۔ اُسے تو ہمیشہ کچھ نہ کچھ دیا ہی جاتا تھا۔ اُسے درخواست کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ اُس نے بغیر کسی جھجک کے کہا: مجھے بھوک لگ گئی ہے۔ وہ موٹر سائیکل لے کے نکل گیا اور کھانے سے بھرے لفافے لے کر آیا۔ وہ ہر صبح کہیں نکل جاتا۔ زاہدہ کو علم نہیں تھا کہ وہ کہاں جاتا ہے؟ اُسے اب اُس کا انتظار رہتا۔ زاہدہ کو محسوس ہوتا کہ وہ آدمی اپنی انگلیوں سے اُسے اُدھیڑ کے نیا وجود دے رہا تھا۔ اُسے اپنا وجود کچھ اور ہی طرح کا لگتا۔ وہ خوش تھی اور حیران بھی کہ وہ کون تھی؟ کیا کوئی غیبی مخلوق یا عام عورت؟ اُسے غیبی عورت سے نفرت ہوتے محسوس ہوتی، پھر وہ سوچتی کہ آدمی کہیں غیبی مرد تو نہیں؟ کسی نے آ کے پوچھا ہی نہیں کہ اُس کے ساتھ کون رہتا ہے؟ شاید وہ کسی کو نظر ہی نہیں آتا؟ وہ اپنا نام بھی نہیں بتاتا تھا۔ وہ ہمیشہ سنجیدہ رہتا، کبھی ہنستا ہی نہیں تھا اور نہ کوئی بات کرتا۔ چارپائی پر آنکھیں بند کیے لیٹا رہتا اور سگریٹ کے دھوئیں چھوڑتا جاتا۔ زاہدہ کو انتظار رہتا کہ وہ جلد آئے اور وہ بھی رات سے پہلے واپس پہنچ جاتا اور ہمیشہ کھانا بھی لاتا جو دونوں مل کے کھاتے۔ آدمی نے کمرے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ وہ اُس کے لیے نیا لباس لایا اور نہ کوئی ڈوپٹہ لا کے دیا اور نہ ہی زاہدہ نے تقاضا کیا۔ اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ نیا لباس بھی مانگا جاتا ہے۔ اُسے صرف بھوک لگتی تھی اور پیٹ بھر کے کھاتی۔

جھگی میں ایک کھونٹی جس پر وہ اپنی ٹوپی لٹکاتا، چارپائی تھی جس پر، جب وہ ساتھ نہ ہوتی، اکیلا لیٹا رہتا۔ ایک کونے میں موٹر سائیکل کھڑا ہوتا۔ وہاں اُس کی موجودگی ہی ایک تبدیلی تھی اور زاہدہ کا اُس سے سوال پوچھنے کی خواہش۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کہاں جاتا ہے؟ کیا اُسے کسی اور عورت کی مہک تو نہیں آئی؟ کیا وہ ہر عورت کے ساتھ ایسے ہی رہتا ہے؟ زاہدہ کو اپنے اندر ایک چھری گھستے ہوئے محسوس ہوئی۔ وہ کسی اور عورت کے ساتھ ایسے کیوں رہے گا؟

پہلی قے خزاں کے آغاز میں آئی۔ اُس وقت وہ گھر پر نہیں تھا اور زاہدہ جھونپڑی کے باہر اکڑوں بیٹھی اپنی انتڑیاں خالی کر رہی تھی اور آس پاس کی عورتوں نے اُسے سنبھالا دیا ہوا تھا۔ وہ پریشان

نظر نہیں آ رہی تھیں تو کسی کے چہرے پر حیرت یا خوشی بھی نہیں تھی۔ وہ بس اُسے سنبھالے ہوئی تھیں۔ کوئی نمک لے آئی تو کوئی اچار اور کوئی اُسے کلیاں کرا رہی تھی اور کسی کا کندھے دباتے ہوئے تقاضا تھا کہ وہ باہمت رہے۔ زاہدہ کو اپنا آپ کسی گہرائی کی طرف پھسلتے ہوئے محسوس ہوا۔ کسی نے قے کی وجہ نہیں پوچھی اور نہ ہی اُس آدمی کے وہاں رہنے کا سبب۔ ایسے لگ رہا تھا کہ جو ہوا اُن کے علم میں تھا اور اُنھیں توقع تھی کہ یہ ہوگا۔ زاہدہ کو چار پائی پر لٹا دیا گیا اور جب وہ آیا تو وہ چار پائی پر ادھ موئی پڑی تھی۔ زاہدہ کو کسی بیماری کا تجربہ ہی نہیں تھا اور صبح کی قے اُسے نڈھال کر گئی تھی۔ وہ اُسے کچھ بتا نہیں پائی اور کھانے کی خوشبو اگلی قے کی وجہ بنی۔ اُس نے کھانا نہیں کھایا اور دونوں خاموش لیٹے رہے۔ پہلی مرتبہ تھا کہ آدمی نے جھونپڑی کی خاموشی کو توڑا۔ ''قے کا مطلب سمجھتی ہو؟ جب ایک عورت کسی مرد کا بیج اپنی کھیتی میں ڈلوا رہی ہو تو اُس بیج میں پھوٹ بھی ہوتی ہے اور جب پھوٹ ہو تو کیا ہوتا ہے؟ قے آتی ہے جس کا مطلب ہے کہ تمھارے حمل ٹھہر گیا ہے یعنی تم ماں بننے والی ہو۔'' زاہدہ یہ اعلان سُن کے پریشان ہوئی۔ اُس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ ماں بنے گی۔ وہ تنہا رہی تھی اور اُسے ہمیشہ لگا کرتا کہ تنہائی نے ہی اُسے جنم دیا ہے اور وہ بھی تنہائی کو ہی جنمے گی۔ اُسے خوشی، حیرانی، پریشانی اور کسی حد تک صدمہ ہوا کہ وہ ماں بنے گی۔ وہ کیسے کسی بچے کو جنم دے گی جب کہ اُسے کسی نے جنم نہیں دیا تھا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ وہ غیبی عورت نہیں تھی اور ایک آدمی نے اُس کے اندر اپنا بیج ڈالتے ہوئے اُسے لطف و لذت کی ایسی سطح پر پہنچا دیا جہاں اصل عورت ہی جا سکتی تھی۔ پھر اُسے خیال آیا کہ ایسے تو نہیں کہ وہ اصل عورت ہو اور اُس کے ساتھ لیٹا ہوا مرد، جس کا کوئی نام ہی نہیں، غیبی ہو اور اُن دونوں نے اصلی اور غیبی کے ملاپ سے کوئی اور مخلوق پیدا کرنی ہو۔ اُسے پتا ہی نہ چل سکا اور وہ سو گئی۔

زاہدہ اپنے دِن سوتے ہوئے ہی گزار رہی تھی۔ اُس کے گھر میں آئینہ نہیں تھا اور نہ ہی کبھی اُس نے خود کو دیکھنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ وہ اپنی شکل سے آشنا ہی نہیں تھی، وہ جب دوسری عورتوں کو دیکھتی تو سوچتی کہ وہ خود کیسی ہوگی؟ اُسے سب کی شکلیں ایک ہی سی لگتیں اور وہ سوچتی: کیا میں بھی ایسی ہی ہوں؟ اب وہ چاہتی تھی کہ آئینے میں اپنی شکل دیکھے۔ وہ جھونپڑی میں چلتے پھرتے سوئے رہتی اور سوتے میں چلتی پھرتی رہتی۔ جھونپڑی میں عورتوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ وہ خوشی کا اظہار کیے بغیر خوش گپیوں میں مصروف رہتیں۔ وہ زاہدہ کی نہانے میں مدد کرتیں۔ جھونپڑی کے ایک کونے میں اُنھوں

نے چادریں تان کے غسل خانہ بنادیا تھا جہاں اُسے نہلایا جاتا۔ اُس کے بال سنوارے جاتے اور وہ نیند میں جاگتے ہوئے اور جاگنے میں سوتے ہوئے اُن کی باتیں سنتی۔ وہ نہ تو خوش تھی اور نہ پریشان اور نہ ہی اُسے اپنے جسم میں رونما ہوتی تبدیلی میں دل چسپی تھی۔ اُس کی جھونپڑی میں شام ہونے تک رونق لگی رہتی اور وہ اُس ہنگامے سے بے خبر اپنے آپ میں گم رہتی۔ اُسے اپنے ہونے والے بچے کا خیال رہتا کہ وہ کیا ہوگا؟ وہ طے نہ کر پاتی کہ اُسے بیٹا چاہیے یا بیٹی؟ کبھی وہ بیٹی چاہتی جس کے پاس کوئی موٹر سائیکل سوار آئے گا اور ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا کہ اُس کے آنے تک وہ اِسی جھونپڑی کے رحم و کرم پر ہوگی؟ اور کیا وہ اور اُس کا اپنا موٹر سائیکل سوار بھی یہاں ہی رہیں گے؟ اور اگر بیٹا ہوا تو وہ جنگلوں میں کنواری لڑکیوں کی خوشبو سونگھتا پھرے گا؟ وہ پریشان تو نہیں تھی لیکن اُسے یہی اُلجھن کچو کے لگاتی رہتی کہ اُسے کیا چاہیے؟ وہاں بیٹھنے والی عورتیں کبھی بیٹیوں کی بے وفائی کی باتیں کرتیں اور کبھی بیٹوں کی بے حیائی کی۔ کوئی اُسے یہ نہ بتا پاتی کہ اُسے کیا جننا چاہیے؟

زاہدہ کا پیٹ اب بڑا ہو گیا تھا اور اُسے کھانے میں مزی مزا آنے لگا۔ آدمی اب کھانے کے ساتھ پھل بھی لاتا جو وہ شوق سے کھاتی۔ وہ سوچتی کہ ایسے پھل تو اب اُسے ہمیشہ ہی ملتے رہیں گے ۔سردی آگئی تھی اور وہ دونوں چار پائی پر ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کے، بدنی حدت کی ساجھے داری کرتے، سوئے رہتے اور زاہدہ محسوس کرتی کہ اُسے زیادہ جگہ کی ضرورت ہے اور بہتر ہوتا کہ آدمی دوسری چار پائی ہی لے آئے لیکن اُس نے پہلے جنسی ملاپ کے بعد کھانے کا تقاضا کرنے کے بعد کبھی کچھ نہیں مانگا تھا۔ وہ اب بھی اُس کے ساتھ اپنی بدنی خواہش پوری کرتا جب کہ اکثر اوقات وہ اِس حالت میں نہ بھی ہوتی کہ مناسب ردِعمل دکھا سکے۔ وہ محسوس کرتی کہ آدمی کو اُس کے کسی بھی طرح کے ردِعمل کے نہ ہونے کی پروا نہیں تھی۔ وہ کچھ مطمئن اور کچھ غیر مطمئن سی اپنے دِن گزار رہی تھی۔ اردگرد کی عورتوں نے ایک دائی لانا شروع کردی جو قسمت بھی بتا سکتی تھی لیکن کسی نے اُسے زاہدہ کی قسمت بتانے کا نہیں کہا تھا۔ جس دِن دائی آتی اُس کی جھونپڑی میں عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا اور وہاں ماحول روز کی خوش گپیوں کے بجائے گھٹن زدہ سنجیدگی اختیار کیے ہوتا۔ عورتیں اپنی، خاندان کی اور رشتے داروں کی قسمت پوچھتیں۔ دائی کے ماتھے پر مسلسل سوچ کی لکیریں ہوتیں اور وہ ہر کسی کی قسمت بتانے سے پہلے اُس کا ماتھا دیکھتی، ہاتھ کی لکیریں دیکھتے ہوئے چند سوال پوچھتی اور جن لوگوں کو وہ دیکھ نہ سکتی

اُن کی شکلیں سمجھ کر قسمت بتاتی؛ یہ ایسا عمل تھا جس پر زاہدہ نے کبھی توجہ ہی نہیں دی تھی کہ اُسے اِس تمام میں دل چسپی ہی نہیں تھی۔ کبھی اُسے یہ بھی خیال آتا کہ وہ اپنی قسمت کا حال کیوں نہ پوچھے۔ پھر وہ خود ہی جواب دیتی کہ اُس کی قسمت کا حال تو سب کو معلوم ہے لیکن اُسے سب کا سب کچھ جاننا بھی کھٹکتا رہتا۔ وہ سوچتی: اگر اُنھیں سب کچھ معلوم تھا تو اُسے کیوں معلوم نہیں تھا؟ اُسے اتنا تو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ خود کو جان سکے۔

سردی کا اختتام تھا لیکن بہار ابھی نہیں آئی تھی۔ جو فیراسردی کے بوجھ کو اُتار پھینک کے خود کو بہار کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ زاہدہ خود میں ایک تبدیلی محسوس کرتی۔ وہ اب پریشان رہتی اور خوف زدہ بھی۔ وہ یہ نہ جان سکتی کہ اُسے پریشانی کیا تھی اور کس چیز کا خوف تھا؟ وہ بس ایک گھبراہٹ میں رات کو بھی جھونپڑی میں چکر کاٹتی رہتی اور اُس کا بدن کانپ رہا ہوتا۔ بعض اوقات وہ بلند آواز میں شور کرنا چاہتی لیکن چارپائی پر لیٹے آدمی کے کبھی ہلکے اور کبھی بھاری خراٹے اُسے روک دیتے۔ وہ اُس سے خائف ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کا خیال بھی کرتی تھی۔ اُسے یہ ناپسند تھا کہ کسی وجہ سے اُس کی نیند میں خلل آئے۔ وہ خاموش ہی اپنی پریشانی اور خوف کے بوجھ سہتی رہتی اور اُسے یہ بھی خیال آتا کہ وہ شاید یہ سب اِس لیے سہے جا رہی تھی کہ وہ تنہائی کی جنی تھی!

دائی اب اُسے خاص توجہ سے دیکھتی۔ وہ سب سے پہلے اُسے ہی دیکھتی اور کچھ دیر اُس کے ٹوٹتے ہوئے بدن کو دباتی بھی رہتی۔ دائی کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن اتنی کم بھی نہیں تھی کہ اُسے دائی نہ سمجھا جائے۔ اُس کا رنگ سفید اور گردن پر جھریوں کی باریک لکیروں نے اُسے ایسی کشش دے دی تھی کہ زاہدہ سوچتی کہ اُس عمر میں اُسے بھی ایسے لگنا چاہیے۔ وہ دائی کو دیکھتے ہوئے ایسے ہی خیالوں میں کھو جاتی اور بھول جاتی کہ دائی اُس کے ساتھ کوئی بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتی رہتیں۔ اب زاہدہ کو اپنی تنہائی سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ سوچتی رہتی کہ اُسے کسی کے ساتھ باتیں کرنا چاہئیں۔ اُس کا جی کرتا وہ وہاں آنے والی عورتوں کی طرح باتیں کرتی جائے۔ وہ کیا باتیں کرے گی؟ اُسے وہ باتیں پسند نہیں تھیں جو وہاں کی جاتی تھیں۔ اُن کے قہقہے اُسے اپنی سوچ میں چبھتے ہوئے محسوس ہوتے۔ اُسے ایک دم خیال آیا کہ وہ دائی کے ساتھ باتیں کر سکتی ہے۔ دائی قسمتوں کے حال بھی بتاتی تھی۔ اُس نے کبھی اپنی قسمت کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ کیا قسمت کے بارے میں جاننا

ضروری تھا؟ وہ تنہائی کی جنمی تو تھی ہی پھر بھی اُسے اپنے بارے میں مزید جاننا چاہیے۔ کیا اُس کا بچہ لمبی عمر پائے گا؟ اُسے دل چسپی نہیں تھی کہ وہ لڑکا پیدا کرے گی یا لڑکی؟ اُسے ایک بچہ چاہیے تھا جو اُس کی چھاتی سے دودھ پیتا رہے۔ اُسے ایک دم محسوس ہوا کہ اُس نے اب تک جو زندگی گزاری تھی اُس میں اُس کا اپنا کچھ بھی نہیں تھا۔ اُس کی زندگی میں اردگرد کی عورتیں تھیں جو ہمیشہ اُس کے کام آئیں اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اُنھیں اُس کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ اُسے اُن کے ایسے رویے پر حیرت ہوتی؛ وہ سوچتی: اُسے اتنا مختلف کیوں سمجھا جاتا تھا؟ کیا وہ اُس سے خائف تھیں؟ اُسے اپنے آپ پر ہنسی آتی کہ وہ جو سب سے کمزور تھی وہ اُس سے خائف تھیں۔ اُسے دائی میں ہی نجات نظر آئی۔ دائی اُسے اُن سب سے مختلف نظر آتی تھی۔ اُس نے دائی کو روکنے کا فیصلہ کرلیا لیکن وہ جا چکی تھی۔

اب موسم کچھ گرم ہو چکا تھا اور بہار آ چکی تھی۔ آدمی رات کو خود کو پھٹی ہوئی رضائی میں ڈھانپے سویا رہتا جب کہ زاہدہ کو گرمی کا احساس رہتا۔ ایک دِن جب دائی جانے لگی تو زاہدہ نے اُسے چپکے سے شام کو چکر لگانے کا کہا۔ دائی کے جانے کے بعد وہ اُس کے انتظار میں بے چینی سے جھونپڑی میں پھرتی رہی۔ اُس نے سوچا کہ وہ دائی سے کیا باتیں کرے گی؟ اُس کے پاس کہنے کو کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ پریشانی، بے چینی اور ایک تجسس میں ڈوبی ٹہلتی رہی۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں گم رہی اور اُسے پتا ہی نہ چلا کہ دائی وہاں پہنچ چکی تھی۔ دائی دھیمے سے مسکرائی اور زاہدہ کو مسکراہٹ کی مٹھاس سے اپنی چھاتی میں ایک پھڑ پھڑاہٹ محسوس ہوئی۔ دائی نے پہلے اُس کا معائنہ کیا اور اُسے اطلاع دی کہ بچے کی پیدائش کا عمل کسی بھی وقت شروع ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر وہ زاہدہ کا بدن دباتی رہی اور زاہدہ کو اپنی تھکاوٹ اپنے جسم سے نکل کے جھونپڑی کے باہر جاتے ہوئے لگی۔ وہ تازہ دم ہوگئی۔

''میرا حال بھی بتاؤ؟'' زاہدہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

دائی ایک بار پھر مسکرائی۔ وہ مسکراتے ہوئے اُس کا ماتھا دیکھے جا رہی تھی اور اُسے دائی کے ماتھے پر لکیریں بنتی محسوس ہوئیں۔ ''تمھارا آدمی کیا کام کرتا ہے؟'' دائی نے زاہدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ اب مسکرا نہیں رہی تھی۔ زاہدہ اُس کے چہرے پر یکسوئی کو غور سے دیکھے جا رہی تھی۔

''پتا نہیں۔'' زاہدہ کے جواب میں معصومیت تھی۔

''کیوں نہیں پتا؟'' دائی کی آواز میں حیرانی تھی۔

''میں نے پوچھا ہی نہیں۔ اُس نے بھی نہیں بتایا۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ زاہدہ کا اعتماد جاتا رہا تھا۔ ''اُس کا نام کیا ہے؟'' دائی ہاتھ کو اُلٹ پلٹ رہی تھی۔

''پتا نہیں۔'' دائی نے سر نہیں اُٹھایا۔ وہ ہاتھ دیکھے جا رہی تھی۔

''نکاح کیسے ہوا؟''

''نہیں ہوا!'' زاہدہ اب خوف زدہ تھی۔ دائی نے اُس کا ہاتھ فوراً چھوڑ دیا جیسے اُس میں سنپولیے ہوں۔ اب وہ زاہدہ کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور زاہدہ کی آنکھوں سے ایک دم آنسو بہنے لگے۔ دائی نے اُس کا ہاتھ پھر سے پکڑ لیا۔ اب وہ لکیریں دیکھنے کے بجائے آہستہ آہستہ ہاتھ دبا رہی تھی اور زاہدہ کا اعتماد واپس لوٹ رہا تھا۔

''عورتوں کا ایک ٹولہ روز یہاں بیٹھا ہوتا ہے۔ کیا وہ جانتی ہیں؟'' دائی کی آواز میں تیز چھری کا کاٹ تھی۔

''ہاں!''

''ہاں!''

''جی! ہاں!''

''کسی نے اعتراض بھی نہیں کیا؟''

''نہیں جی!''

''کیوں؟''

''وہ خوف زدہ ہیں۔''

''کیوں؟''

''اُن کے خیال میں مَیں ایک غیبی لڑکی ہوں۔ میری کوئی ماں نہیں اور میرا کوئی باپ نہیں۔ میں جب سے ہوں بس اِن سب کے رحم و کرم پر ہوں۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میرے رحم و کرم پر ہوں۔'' وہاں ایسی خاموشی چھا گئی جسے توڑنے کے لیے الفاظ کے علاوہ بھی کچھ چاہیے تھا۔ دونوں

اپنے اپنے خیالات میں گم تھیں کہ اچانک موٹر سائیکل اندر داخل ہوا۔ آدمی نے دونوں کو غور سے دیکھا اور پھر ایک دلیرانہ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

''اِس لڑکی کو تم نے خراب کیا؟'' دائی کی آواز میں الزام تھا۔ اُسے دائی کی آواز پر حیرت ہوئی، اُس کا لہجہ ہمیشہ دھیما اور میٹھا رہا تھا۔ وہ سٹارٹ موٹر سائیکل پر اُسی آسن میں بیٹھا رہا۔ اُسی وقت دائی اُٹھی تو ساتھ ہی زاہدہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دائی کا چہرہ اپنی نرماہٹ کھو بیٹھا تھا۔ ''کیوں؟'' دائی نے سختی سے پوچھا۔

''ہم دونوں ضرورت مند تھے۔''

''اور میں؟'' دائی نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''پہلی تھیں اور یہ اٹھارویں۔ مجھے شرینہہ کے پھولوں کی تازہ مہک آنا شروع ہو گئی ہے.....!'' دائی غصے سے لرزتی ہوئی اُس کی طرف بڑھی تو وہ موٹر سائیکل کو گھما کے باہر نکل گیا اور جھگی میں تنہائی دوزانو ہو کے رونے لگی!

مراجعت

سخی محمد کو اپنی ذات پر لگے زخموں سے زیادہ اُن زخموں کی فکر تھی جو اُس کی زندگی پر لگے تھے۔ وہ ایک ایسے گرداب میں چکر کاٹے جا رہا تھا جس میں سے نکلنا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ حالات اُس کی خواہشوں اور سوچ کے مطابق تھے اور وہ اپنی خوشیوں میں کسی کو شریک کیے بغیر اپنے ہی آپ میں خوش تھا۔ وہ ابھی چھوٹا ہی تھا، اتنا چھوٹا بھی نہیں کہ اُسے چھوٹے اور بڑے میں فرق نہ ہو کہ اُسے رنگ اچھے لگنے لگے۔ وہ ہر طرف رنگوں کا متلاشی تھا، اُن رنگوں کا جو اُس کے سامنے کئی اشکال میں بکھرے ہوئے تھے اور ایسے رنگ بھی جو اُس کی نظر سے اوجھل تھے۔ وہ ساری شام شہر کے پارکوں میں پھرتا، سورج کو طلوع اور غروب ہوتے دیکھتا، خزاں میں پتوں کے رنگ تبدیل ہوتے دیکھتا اور درختوں کی اُن اُجڑے ہوئے رنگوں میں اُداسی کے ساتھ شامل ہوتا، بہار میں اُن اُداس رنگوں کی جگہ شوخ اور دمکتے ہوئے رنگ لہکتے ہوئے دیکھتا اور اُن لہکتے ہوئے رنگوں میں اپنی خوشی بھرنے کی کوشش کرتا، گرمیوں کی جھلسا دینے والی گرمی میں ہر طرف آگ کے رنگوں میں سے ٹھنڈک کشید کرنے کی کوشش کرتا اور پھر برسات کے سبزوں میں درختوں اور زمینوں کو ہری چادر میں لپٹے ہوئے دیکھتا۔

سخی محمد کے گرد رنگ تھے: سُرخ، آتشیں، گلابی، عنابی، کالے، خاکستری، سلیٹی، بھورے، بادامی، سفید، کافوری، دھاتی، سُرخی دھاتی مایل بھورے، زرد، پیلے، ہرے، زہر مہرے، نیلے، آسمانی، لاجوردی اور کئی رنگوں کی آمیزش سے وجود دیے ہوئے رنگ جو اصلی نہ ہوتے ہوئے اصلی تھے اور

اصلی ہوتے ہوئے نا اصلی تھے۔ وہ پوری دنیا میں صرف رنگ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جدھر دیکھے اُسے رنگ ہی رنگ نظر آئیں۔ اُس کی نظریں رنگ تو دیکھتی تھیں لیکن یہ رنگ بوسیدہ اور پامال شدہ تھے۔ رنگ چاہے اُداس ہی کیوں نہ ہوں وہ اُن میں ایک تازگی دیکھنا چاہتا تھا۔ اُسے کسی نے بتایا کہ دیہات میں رنگوں کی اصل شکل نظر آتی ہے اور اُس نے دیہات میں رہنے والوں کے ساتھ تعلقات بنائے اور پھر اُن سے ملنے جانا شروع کر دیا۔ وہ دیہات کے کچے راستوں پر غیر آرام دہ سفر کرتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچتا اور شام کو سورج کے غروب ہونے سے پہلے کسی مناسب جگہ پر بیٹھ کے سورج کے باقی ماندہ سفر کو دیکھتے ہوئے بدلتے رنگوں کو اپنی سوچ کی زنبیل میں بھرتے جاتا۔ سردی کی پروا کیے بغیر وہ سورج کے طلوع ہونے تک آسمان کے رنگوں کو دیکھتا رہتا۔ اُسے محسوس ہوتا کہ بظاہر ایک ہی رنگ لیے رات کئی رنگوں کا مجموعہ ہے۔ آسمان میں ستارے اُسے بے لباس نظر آتے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ شہر میں یہی بے لباس ستارے اُسے اپنے ستر ڈھانپے ہوئے کیوں محسوس ہوتے؟ یہاں گاؤں میں اُسے اُنہی ستاروں کی برہنگی میں ایک پاکیزگی نظر آتی۔ ہر ستارے کا ایک جداگانہ رنگ تھا اور وہی رنگ اُسے کائنات کا رنگ لگتا۔ وہ خود کو اُس رات کے ہر لمحے میں کائنات کا اٹوٹ حصہ محسوس کرتا اور ہر ستارے کو بے ستر دیکھتے ہوئے فیصلہ کرتا کہ زندگی میں کبھی وہ گاؤں آن کے آباد ہوگا۔

سخی محمد ایک اُلجھن کا شکار تھا۔ یہ اُلجھن اُسے کبھی اصلی اور کبھی خود ساختہ لگتی۔ وہ سوچتا کہ وہ اپنی اِس اُلجھن کی حقیقت کا کیسے پتا چلائے؟ بعض اوقات وہ باغوں کے چکر لگانے کے بجائے اپنے گھر کے پچھلے صحن میں بیٹھ کے سوچتا رہتا۔ اُسے اپنے گھر کا وہ حصہ پسند نہیں تھا کیوں کہ وہاں اینٹوں کا غیر ہموار فرش تھا جس کے رنگ کی یکسانیت اُسے ایک اُفسردگی کا شکار کر دیتی۔ وہ تو رنگوں کی رنگینیوں کا طلب گار تھا اور کہاں یہ یک رنگی! لیکن وہ وہیں بیٹھ کے سوچتا اور اپنی اُس اُلجھن کا حل تلاشتا۔ جب اُسے کوئی راستہ نظر نہ آتا تو وہ کسی باغ میں رنگوں سے اپنی آنکھوں کو بھرنے کے لیے نکل جاتا اور اُس فرار سے تکمیل نہ پا کے واپس گھر کے پچھلے صحن میں پناہ ڈھونڈتا۔

سخی محمد کو اکثر محسوس ہوتا کہ اُس کی زندگی ایک طرح کی یکسانیت کا شکار ہے۔ وہ ہر روز وہی کر رہا تھا جو اُس نے گزرے ہوئے کل میں کیا تھا اور اُسے یقین تھا کہ اُس نے آنے والے کل میں بھی یہی کرنا ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ اِس نتیجے پر پہنچا کہ جو اُس کے ساتھ ہو رہا ہے اُس میں کوئی

شک نہیں اور اُسے ایک وقفے کی ضرورت تھی۔ وہ رنگ جنھیں دیکھنا اُس کی زندگی کا حاصل تھا اب اُن نوعیت بدل گئی تھی۔ وہ اُسے کبھی ویسے ہی نظر آتے جیسے وہ اُنھیں دیکھنا چاہتا تھا اور کبھی وہ سکڑتے ہوئے نظر آتے، کچھ اِس طرح کہ وہ اپنے وجود سے کہیں زیادہ مختصر محسوس ہوتے اور کبھی اِس کے برعکس اُن کے نقوش کہیں زیادہ پھیلے ہوئے نظر آتے۔ جو بات اُس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی، وہ اُس کے متعلق سوچنے سے خائف تھا: کبھی اُسے کوئی رنگ نظر نہ آتے؛ بس ہر سو پھیلی ہوئی ایک سفیدی..... چاندنی راتوں میں دور تک پھیلی ہوئی برف سی ویرانی.....اور پھر ایک دِن سب رنگ جاتے رہے: ہر طرف بکھری ہوئی ایک سفید چادر تھی جس میں سے باوجود کوشش کے وہ کوئی رنگ بھی نہ نکال سکا۔ اُس کی کاپی پر کوئی لکیر نہیں تھی اور اُس کے لیے سیدھی قطار میں لکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کالی روشنائی استعمال کرتا تھا، اب وہ سفید کاغذ پر سفید روشنائی سے لکھتا جو اُسے کبھی نظر آجاتی اور کبھی نہ آتی۔

یحیٰی محمد نے اِسے اپنے حالات کا وار جانا اور اُس نے طے کرلیا کہ اُسے اُن کے ساتھ سمجھوتا کرنا ہوگا کیوں کہ اُس کے پاس ایسے حالات کا مقابلہ کرنے والے اوزار نہیں تھے اور یہ بھی اُس کے علم میں نہیں تھا کہ اُسے کن ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ اُس نے اپنے ساتھ ہونے والے المیے کے متعلق کسی کو نہیں بتایا اور اپنی تمام تر توجہ تعلیم پر مرکوز رکھی۔ وہ ہمیشہ ہر جماعت میں بہترین طالبِ علم ہوتا۔ وہ جان گیا تھا کہ اُس کے رنگ جاتے رہے تھے اور اُن رنگوں کی نظر نہ آنے والی لہروں پر وہ آگے بڑھے چلا جارہا تھا۔ اُنہیں دنوں میں اُسے ایک شدید احساس ہونے لگا۔ وہ محسوس کرتا کہ اُس کا بدن ہر وقت ایک تناؤ میں رہنے لگا تھا اور بعض اوقات یہ تناؤ اتنا شدید ہوجاتا کہ وہ دروازوں، دیواروں اور درختوں سے ٹکرانا چاہتا۔ وہ اپنی اِس کیفیت سے نالاں بھی ہوتا اور اِس میں اُسے ایک مخفی لذت بھی ملتی۔ اُس کا جی کرتا کہ وہ کسی کے ساتھ جھگڑا مول لے، کسی کے چہرے پر کس کے مکا مارے اور مکے کی شدت کی وجہ سے وہاں کسی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز سنے یا کوئی اُسے مار مار کر اتنا بے حال کردے کہ وہ زمین پر بے خود پڑا اپنے ہی درد میں کراہتا رہے۔ یہ کیفیت کئی دِن جاری رہتی۔ اُن دِنوں میں وہ گھر سے نکل جاتا اور دیر تک سڑکوں اور پارکوں میں پھرتا رہتا۔ اب وہ رنگوں کا متلاشی نہیں تھا، اُسے کچھ بھی نہیں چاہیے ہوتا تھا.....وہ تو بس چلے جانا چاہتا تھا۔ اُسے عورتوں کو دیکھنے میں ایک طرح کا سکون ملتا۔ اُسے عورتوں کے رنگ اور پیرہن بے رنگ نظر آتے لیکن اُن میں ایک ایسی دل کشی تھی جو اُس کی

کیفیت کو مزید والہانہ پن دیتی۔ وہ ہر چیز سے ٹکرا جانے کا خواہاں تھا، اِسی طرح ہر عورت اُسے اپنی طرف اشارہ کر کے بلاتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اُس نے اپنی فینٹسی میں ایک ایسا محلول تیار کر لیا تھا جسے پینے سے وہ آدمی کسی کو نظر نہیں آتا اور وہ خود ہر کسی کو بے لباس دیکھ سکتا تھا۔ اُسے ایک پرانی کہاوت یاد تھی جس میں بادشاہ ننگا تھا جب کہ اُسے بتایا گیا تھا کہ اُس کا لباس کسی کو نظر نہیں آئے گا اور پھر ایک بچے نے یہ کہہ کہ بادشاہ ننگا ہے پورا کھیل بگاڑ دیا۔ سخی محمد چاہتا تھا کہ وہ خود تو کسی کو نظر نہ آئے لیکن وہ ہر عورت کو بے لباس دیکھے۔ وہ سوچتا کہ جب وہ عورتوں کو بے لباس دیکھ رہا ہو اُس وقت پورے شہر یا اُس علاقے کے سب بچے سکولوں میں ہوں تا کہ کوئی اُسے عورتوں کو تاڑنے والا نہ کہہ سکے۔ عورتوں کو دیکھنے سے جہاں اُس کا دیوانہ پن ایک نا قابل بیان شدت اختیار کر جاتا وہاں اُسے گہرے سکون کا احساس بھی ہوتا۔ اُسے ہر وہ عورت اپنی طرف متوجہ کرتی جس کی چال میں ایک مستانہ قسم کی لچک ہوتی، جس کے چہرے سے بے چینی چھلک رہی ہوتی، جس کے جسم میں ابھی عمر رسیدگی کا خمیر نہ ہوتا قطع نظر کہ وہ اُس کی طرف مائل تھی کہ نہیں! سخی محمد کا اپنے دیہات کے رہنے والے چند ہم جماعتوں کے ساتھ ابھی تک رابطہ تھا۔ پہلے وہ رنگوں کی تلاش میں اُنھیں ملنے جایا کرتا تھا اور اب وہ اُن کے پاس عورتوں کو دیکھنے جاتا۔ اُسے اُن دیہات میں رنگ شہر کے رنگوں سے قدرے صاف، گہرے اور واضح نظر آیا کرتے تھے اور اب وہیں جو عورتیں اُسے نظر آتیں وہ شہر کی عورتوں سے مختلف تھیں۔ اُسے اُن کے رنگوں میں گندمی مائل سفیدی یا گہری ہونے سے پہلے والی شام کا سانولا پن نظر تو نہیں آیا کرتا تھا لیکن وہ ایسا فرض ضرور کرتا اور وہاں کی عورتوں کے جسم لباس میں ڈھکے ہونے کے باوجود بغیر لباس کے دیکھنے کی اہلیت حاصل کر چکا تھا۔ اُسے اُن کے بدنوں میں کسرت کا گدرا پن نظر آتا اور وہ اُن کی چال میں ایسی لاتعلقی محسوس کرتا کہ اُس کا جی چاہتا کہ وہ چلتے ہی چلی جائیں اور وہ اُن کے پیچھے چلتے ہوئے اُن کی ٹانگوں کے پٹھوں کی سختی کو محسوس کرتا جائے۔

سخی محمد کی یہ کیفیت چند دِن رہتی۔ جیسے یہ کیفیت شدت اختیار کرنے لگتی وہ اپنی تعلیم سے بھی بے گانہ ہو جاتا۔ اُسے محسوس ہوتا کہ اُس کے حواس قابو میں نہیں رہے اور پھر ایک رات وہ ایسے طوفان کی زد پر آ جاتا جو اُسے لذت کی اُن بلندیوں تک لے جاتا جہاں سے واپس آنے سے وہ خوف زدہ ہوتا۔ جہاں یہ ایک تسکین بخش احساس تھا وہاں وہ اُس کیفیت میں داخل ہونے سے خائف تھا جو اُسے

اِس مقام تک پہنچا دیتی اور ساتھ ہی وہ اُس میں داخل ہونا بھی چاہتا تھا۔ یحیٰ محمد اب یہ طے کر چکا تھا کہ رنگ تو دماغ کی کسی نس میں بگاڑ کی وجہ سے چھن چکے تھے وہ اپنے اِس شوق کو کسی طرح بھی کھونا نہیں چاہتا تھا اور اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ محنت کر کے کسی اچھی ملازمت تک رسائی حاصل کرے گا اور عورتوں کے ساتھ جسمانی تعلق میں اپنی اِس بھوک، کمی اور جنون کو ڈبو دے گا۔ اُسے اکثر خیال آتا کہ کیا ایک عورت اُس کی اتنی شدید خواہشات کی تکمیل کے لیے کافی ہوگی؟ وہ ہر بار اِسی نتیجے پر پہنچتا کہ تعداد کے بجائے اُسے تکمیل کے بارے میں سوچنا چاہیے؛ اُسے عورتیں یا بیویاں تبدیل کرنے میں کوئی جھجک یا پرہیز نہیں ہونا چاہیے۔

یحیٰ محمد کو ایک قابلِ رشک سرکاری ملازمت مل گئی۔ وہ ضلع کے چند اہم افسروں میں سے ایک تھا اور اُس نے اپنے والدین پر شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ جس رات وہ بیوی لے کے گھر آیا وہ اُس کے جنون کی آخری حد والے چند دن تھے۔ خواب گاہ میں جانے سے پیشتر والی چند فضول لیکن ثقافتی طور پر اہم رسوم اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے نزدیک بیٹھی خوش شکل جوان عورت کے بدن کی خواہش میں اپنے حواس پر قابو رکھنے کی کوشش میں تھا کہ قہقہوں، مسکراہٹوں، معنی خیز چست فقروں، چٹکیوں، دھکوں اور ہمدردی کے مصنوعی اظہار کے ساتھ اُسے اور اُس کی بیوی کو خواب گاہ تک پہنچا دیا گیا۔ اب وہ کئی سالوں کی محرومی کو ختم کر کے اپنی تکمیل کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اُن دونوں کے درمیان میں کوئی بھی ناقابلِ عبور رکاوٹ تو نہیں تھی لیکن پھر بھی چند رکاوٹیں اُسے پار کرنا تھیں۔ اُس نے جب وہ تمام رکاوٹیں پار کر لیں تو وہ مسہری پر اوندھے منہ ایسے گرا کہ اُس کی بیوی کو بھی اُس کے ساتھ ہمدردی نہیں تھی۔ سب کچھ ایک سرعت کا شکار ہو گیا۔ اب رنگ نہیں تھے اور وہ خالی، ادھ موا، اوندھا لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ شاید لذت کی بلندیوں تک لے جانے والے طوفان ہی بہتر تھے؟ پھر اُسے خیال آیا کہ ناکامی تو کامیابی کا آغاز ہوتی ہے لیکن ہر بار ایسے ہی ہوتا اور اِس ہونے اور نا ہونے کے عمل میں تین سال نکل گئے اور اُس کی بیوی علیحدہ ہونے کا سوچنے لگی۔

''میں تمھاری اِس بے بسی، محرومی، غصہ، پریشانی اور تلخ فیصلے کی وجوہات سے انکار نہیں کرتا۔ مجھے ایک موقع دو اور اگر میں ناکام ہو گیا تو تمھیں روکوں گا نہیں، تمھیں جانے کے لیے کھلا راستہ مہیا

کروں گا۔'' اُس نے ایک شام کی چائے پر بیوی سے کہا اور اُس نے اپنے تحفظات کا اظہار کیے بغیر خاموشی سے اثباتِ میں سر ہلا دیا۔ سخی محمد نے اب ماہرین نفسیات اور جنسیات سے رابطہ کیا جنھوں نے اُسے مشورے اور ادویات دیں، وہ ننگ دھڑنگ بابوں کے پاس گیا جنھوں نے گالیوں میں لپٹی دعائیں دیں، وہ بزرگوں کے پاس گیا جنھوں نے پھونکے مار مار کے پانی دیا اور سنیاسیوں کے پاس گیا جنھوں نے جڑی بوٹیوں سے کشید کی گئی ایسی ادویات دیں جو گیدڑ کو بھی شیر بنا سکتی تھیں لیکن اُس کی سرعت کا کسی کے پاس حل نہیں تھا۔ اب وہ مایوس نہیں ہوا۔ اُس نے سوچا کہ شاید ایسے ہی ہوتا ہے۔ اُسے رنگ پسند تھے اور اب وہ ہر طرف ایک سفید چادر دیکھتا تھا، اُسے عورت کے جسم کی چڑھائیاں اور اُترائیاں پسند تھیں جن پر وہ کوہ پیمائی کی ہر کوشش کے آغاز میں ہی پھسل جاتا تھا۔ اُس نے بغیر کسی پچھتاوے یا احساسِ شکست کے اپنی بیوی کو آزاد کر دیا۔

سخی محمد اپنی نوکری کی سیڑھی پر ایک پائدان اوپر چڑھ چکا تھا اور اُسے آخری سرا اتنا دور نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اب اُس کے اندر وہاں تک پہنچنے کی اُمنگ نہیں رہی تھی۔ وہ جہاں تھا اب وہاں بھی نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ کیا وہ ایسے رتبے یا مقام کا اہل تھا؟ جس شخص کے شب و روز میں سکون اور طمانیت نہ ہوں اُسے ترقی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اُس نے ایک طویل سوچ بچار کے بعد فیصلہ کر لیا کہ وہ موجودہ نوکری چھوڑ کر محکمہ تعلیم میں اپنا تبادلہ کروا کے کسی دور اُفتادہ گاؤں کے پرائمری سکول میں ماسٹر لگ جائے گا۔ اُسے ایسا کرنے سے بہت سے لوگوں نے روکا جس میں اُس کے والدین، بہن بھائی، افسرانِ بالا، ماتحتین، دوست اور اُس کی سابقہ بیوی تک شامل تھے۔ وہ اپنے فیصلے پر قائم رہا اور ہر دفتر سے اُس کی درخواست پر چند خدشات کے بعد منظوری ملتی رہی اور وہ جہاں جانا چاہتا تھا، ایک دِن پہنچ گیا۔ اُسے اُس سکول میں خوش آمدید نہیں کیا گیا۔ جس اُستاد کی جگہ اُس کی تعیناتی ہوئی وہ مقامی تھا اور اکثریت کا رویہ جارحانہ تھا اور سخی محمد کو ایسے حالات کی توقع تھی۔ اُس نے جارحانہ اور منفی رویوں کو محسوس کیے بغیر اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ اُس نے چند دنوں میں ہی کسی کی بیٹھک کرائے پر لے کے وہاں سکونت اختیار کر لی۔ وہ جلد ہی اپنی نئی زندگی کے کھانچے میں چکر کھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ لوگوں میں اُس کا اعتماد بحال ہو گیا اور وہ بھی اب بغیر کسی جھجک کے گاؤں کا حصہ بن گیا۔ بعض لوگوں نے اُسے گاؤں کے سربراہ کا رتبہ بھی دینا شروع کر دیا۔ وہ صبح اور شام چلتے ہوئے دور تک

نکل جاتا اور اب اُسے نہ تو ارد گرد پھیلی سفید چادر نظر آتی اور نہ ہی وہ عورتیں جو اُس کے پاس سے کبھی لاتعلقی اور کبھی ایک اُمید کے ساتھ گزر جاتیں۔ وہ اپنی ذات کے سمیت ہر قسم کی دل چسپی سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ اُس نے سوچا کہ چوں کہ اب اُس نے اپنے آخیر تک یہیں رہنا ہے تو کیوں نہ اپنا مکان بنا لیا جائے؟ گاؤں سے کچھ فاصلے پر اُس نے زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ خرید کے اُس پر دو کمروں کا گھر بنا لیا۔ یہ گھر گاؤں سے اتنے فاصلے پر تھا کہ گاؤں چاہے جتنا بھی پھیل جاتا اُس نے گاؤں سے باہر ہی ہونا تھا۔ ایک چار دیواری کے اندر دو کمرے، ایک باورچی خانہ اور ایک غسل خانہ تھے۔ دونوں کمرے اُس کی بیٹھک اور خواب گاہ تھے، وہ جہاں چاہتا سو جاتا۔ چھت پر اُس نے ایک بے ڈھنگا لیکن اونچا چوبارہ تعمیر کیا جو چوبارہ بھی تھا اور ایک مینار نما ڈھانچا بھی جہاں سے وہ دور تک دیکھ سکتا۔ جس دِن وہ باہَر گھومنے نہ جاتا وہاں بیٹھ کے دور تک دیکھتا رہتا۔ چوبارے سے اُسے تاحدِ نظر پھیلی ہوئی سفید چادر نظر آتی اور وہ اُس میں سے مختلف رنگ نکالتا رہتا۔ اُس کے ذہن میں اب رنگ جاگنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ سوچتا کہ شاید یہ گاؤں میں گزارے پچیس سالوں کی تنہائی کا اثر تھا کہ اُسے رنگ یاد آنے لگے جب کہ وہ باقی سب بھول چکا تھا۔ جب سے وہ اپنے گھر میں آیا تھا ایک عورت اُس کے کام کرتی تھی۔ وہ عورت بھی سخی محمد کی ہمت اور حوصلے سے متاثر تھی اور اُسے یہ بتانا بھی چاہتی تھی لیکن اُن دونوں میں بات کم ہی ہوئی تھی۔ سخی محمد چوبارے سے دور تک سفید چادر میں دیکھتے ہوئے کبھی کبھار چکرا جاتا۔ اُسے محسوس ہوتا کہ اُس کی آنکھیں چادر پر سے پھسل پھسل جا رہی ہیں۔ جب بھی چکر آتا، وہ دیر تک آنکھیں بند کر کے ساکت بیٹھا رہتا۔ اِن چکروں میں اُسے متلی کا بھی احساس ہوتا اور جب وہ آنکھیں کھول کر دور تک پھیلے ہوئے اُفق کی طرف چکر کے انتظار میں دیکھتا تو اُسے چکر نہیں آتا تھا۔ چکر نہ آنا جہاں اُس کے لیے باعث اطمینان تھا وہاں اُسے پریشانی بھی ہوتی۔ وہ سوچتا کہ چکر آنے کے بعد اُسے چکر کیوں نہیں آتے اور جب آجاتے ہیں تو پھر دوبارہ کیوں نہیں آتے۔ وہ کسی ڈاکٹر سے ملے، کسی ماہر نفسیات سے مشورہ کرے لیکن پھر اُسے خیال آتا کہ وہ سب اُس کے مسئلہ کی نہ تو وجہ جان سکے اور نہ ہی مداوا۔ اُس نے اپنی محرومی اور بے بسی کو اپنے طور ہی جھیلنے کا فیصلہ کیا جیسا کہ وہ پہلے کرتا آیا تھا۔

سخی محمد سوچتا کہ ریٹائر ہونے کے بعد وہ کیا کرے گا؟ یہ تو طے تھا کہ اُس نے اپنی زندگی اِسی گاؤں اور گھر میں گزارنا تھی۔ اُس نے سوچا کہ وہ ملازمت میں توسیع کے لیے کوشش کرے گا جس کی

اُسے اُمید بھی تھی کیوں کہ اُس کے تعلق دار ابھی تک ملازمت میں تھے اور کوئی نہ کوئی اُس پر یہ مہربانی کر ہی دے گا۔ اگر ایسے نہ ہو سکا تو وہ اپنی پینشن پر ہی زندگی گزارے گا اور گاؤں والوں سے درخواست کر کے بغیر تنخواہ کے سکول میں تعلیم دینے کا عمل جاری رکھے گا۔

سخی محمد شاموں کو جب چوبارے پر بیٹھتا تو اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے اُسے ایک عجیب قسم کا احساس ہوتا۔ اُس کے سامنے پھیلی ہوئی سفید چادر سفید ہونے کے باوجود اب سفید نہیں تھی۔ وہ اُسے اب کسی حد تک میلی نظر آتی اور وہ سوچتا کہ گاؤں میں بھی ماحولیاتی آلودگی نے اُس سفید رنگ کو جس کے علاوہ کوئی رنگ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا اب اتنا میلا کر دیا تھا کہ وہ اُس میلے پن کو دیکھ سکتا تھا۔ اُسے خوشی بھی ہوتی اور وہ ایک گہری پریشانی میں ڈوب جاتا۔ وہ سوچتا: پہلے اُس سے رنگ چھیننے کے بعد ایک سفید چادر حوالے کر دی گئی اور اب وہی چادر اِتنی میلی کر دی گئی کہ وہ رنگ کور ہونے کے باوجود اُس میل کو دیکھ سکتا تھا۔ کبھی اُسے یہ تبدیلی ایک خوش گواری میں مبتلا کر جاتی کہ وہ سفید رنگ کے علاوہ کوئی اور رنگ بھی دیکھ سکتا تھا۔ وہ جب بھی اِس میلی یا کبھی کبھار سفید چادر کو دیکھتا تو اُسے اپنی آنکھوں پر ایک بوجھ محسوس ہوتا اور اِس بوجھ کو دور کرنے کے لیے وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا اور آنکھیں کھولنے پر اُسے چادر کبھی زیادہ سفید یا زیادہ میلی نظر آتی اور وہ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔ یہ عمل اُس وقت تک جاری رہتا جب تک اندھیرا ہر چیز کو ڈھانپ لیتا اور وہ اپنے سامنے کچھ بھی نہ دیکھ رہا ہوتا۔

سخی محمد کو کام کرنے والی عورت رات کا کھانا دے کر اپنے گھر چلی جاتی تھی۔ ایک رات وہ کھانا لے کے آئی تو سخی محمد نے اُسے غور سے دیکھا اور وہ اُسے کشش سے خالی نظر نہ آئی۔ اُسے ایک انوکھا احساس ہوا۔ اُسے اپنے مثانے میں ایک کیچوے کی سی سست حرکت محسوس ہوئی۔ اُس نے جلدی سے عورت کی طرف دیکھا کہ وہ اُس کی کیفیت کہیں بھانپ تو نہیں رہی ؟ اُسے تسلی ہوئی کہ وہ رکابی، چھابا، پونا، گلاس اور جگ رکھنے میں اتنی محو تھی کہ سخی محمد پر اُس کی نظر نہیں پڑی۔

''کیا یہاں دھول کی مقدار میں اضافہ ہو گیا ہے کہ سب کچھ میلا نظر آتا ہے؟'' سخی محمد کو اپنی آواز پھٹ کر گلے میں سے نکلتے ہوئے محسوس ہوئی۔ بچوں کو پڑھاتے ہوئے وہ اونچی آواز میں بولنے کا عادی ہو گیا تھا لیکن اُس وقت اُسے اپنی آواز خود کو بمشکل سنائی دی۔ اُس عورت نے چونک کے اُس کی طرف دیکھا جیسے سخی محمد نے اُس کے کانوں کے پردے پھاڑ دیے ہوں۔

"نہیں ماشر جی! ایسا تو کچھ نہیں۔ دو دِن پہلے تو ابھی بارش نے سب کچھ صاف کر دیا تھا۔"
اُسے عورت کا جواب سُن کے اپنے مشاہدے اور سوچ پر غصہ تو آیا ہی لیکن عورت کی آواز کی مٹھاس نے اُس کیچوے کی رفتار کو تھوڑا سا ہلکورا دیا۔ سخی محمد کو لگا کہ اُس کی آواز میں مٹھاس کے بجائے ایک دعویٰ تھا کہ وہ ایک عرصے سے وہاں تھی اور اُس کی آواز میں ہمیشہ سے ہی ایسی مٹھاس تھی۔ اپنی سوچ کا رُخ موڑنے کے لیے اُس نے جلدی سے سالن کی طرف دیکھا تو اُسے پھولوں والی رکابی میں سالن کی سرخی نظر آئی اور چپاتیوں کی طرف دیکھا تو وہ عنابی رنگ کے پونے میں لپیٹی ہوئی تھیں۔ سخی محمد چکرا گیا اور وہاں بیٹھے رہنے کے بجائے خوف زدہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کھڑے کھڑے لڑکھڑاتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھال رہا تھا کہ عورت نے "ماشر جی" کی چیخ لگا کر اُسے پکڑ لیا۔ سخی محمد کو عورت کی زرد قمیص میں سرخ پھول نظر آئے۔ اُس نے اپنے دیکھے کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کے لیے آسمان کی طرف دیکھا تو وہاں ستاروں کی کہکشاؤں میں سے وہ رنگ بہہ رہے تھے جنھیں وہ کبھی دیکھا کرتا تھا۔ اب وہ اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا اور عورت بھی اُسے اپنی بانہوں میں لے کے سنبھالے ہوئے تھی!

راہ گم کردہ مسافر

حبیب نے جب راشدہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تو اُس کی اپنی عمر اٹھارہ برس کی تھی اور راشدہ کی پندرہ سال!

راشدہ کو جب اُس نے دیکھا تو فوراً پہچان گیا؛ یہ وہی لڑکی تھی جو ہر رات خواب میں آ کے اُسے چپچپاہٹ سے بھری ہوئی جاگ دے جاتی تھی اور وہ کچھ دیر تک خود کو خشک رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سو جاتا تھا۔ پھر وہ اِن خوابوں اور چپچپاہٹ سے اُکتا گیا۔ اب اُسے، راشدہ کے علاوہ کسی چیز میں دل چسپی نہ رہی۔ وہ اِس تمام عمل سے اتنا اُکتا گیا کہ اُس کی کوشش ہوتی کہ وہ سوئے ہی نہ اور ایک دن اُس نے اپنے بڑے بھائی محبوب کو جھجکتے ہوئے، اپنا مسئلہ سنا دیا۔ محبوب تجسس بھری مسکراہٹ کے ساتھ اُسے اپنی آپ بیتی سناتے دیکھتا رہا۔ محبوب کو خوشی تھی کہ اُس کا بھائی جوان ہو گیا ہے اور وہ جلد ہی اُس کی شادی کا سوچنا شروع کر دے گا۔ اُس نے حبیب کو اپنے جاننے والے ایک حکیم سے ملنے کا مشورہ بھی دیا۔

حبیب ایک اہمیت کو اپنے ساتھ چپکائے ہوئے حکیم کے مطب پر پہنچا۔ حکیم کے سفید رنگ پر چاندی کے تاروں والی ڈاڑھی پھیلی ہوئی تھی اور حبیب اُس کی سرخ انگارہ آنکھیں دیکھ کے کچھ گھبرا سا گیا۔ حبیب نے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو حکیم نے اُس کی نبض تھام کے خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر دونوں خاموشی کے آسن میں بیٹھے رہے۔ پھر حکیم نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

''مردانہ کمزوری!'' حکیم نے کلائی چھوڑتے ہوئے کہا۔

''ہو نہیں سکتا۔'' حبیب نے حکیم کی بات کو سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہنا شروع کیا،''میں ہر طرح کی طاقت کا کام کسی رکاوٹ یا تھکاوٹ کے بغیر کر سکتا ہوں۔ میرا بھائی بھی میری طاقت کی گواہی دے گا۔'' حبیب نے اپنی دانست میں حکیم کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

''یہ وہ طاقت نہیں جس کا تم مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو!'' محبوب نے بتایا تھا کہ حکیم اگر کوئی سخت بات کہہ دے تو وہ بُرا نہ منائے کیوں کہ اُس کے علاج کا طریقہ ہی یہ تھا کہ مریضوں کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئے۔ حکیم کا لہجہ سخت تھا۔''یہ وہ کمزوری ہے جس کی وجہ سے تم عورت کو خوش نہیں کر سکو گے۔''

اب حبیب کو اپنی کمزوری کا علم ہوا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے جسم میں واقعی طاقت نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو وہ راشدہ کو کیا جواب دے گا؟ تھوڑی دیر پہلے کا قابلِ نفرت حکیم اچانک اُسے اچھا لگنے لگا۔ حبیب نے اُس کی طرف اپنائیت اور پسندیدگی سے دیکھا، اُسے محسوس ہوا کہ حکیم ہی اُس کی یہ کمی دور کر سکتا ہے۔''اِس کا علاج ہے؟'' اُس کی آواز میں خوف اور اُمید کا ملا جلا تاثر تھا۔

''اِسی لیے محبوب نے تمھیں یہاں بھیجا ہے۔'' حکیم کا لہجہ اتنا کھردرا تھا کہ حبیب تھوڑا سا خائف ہو گیا۔''یہ پُڑیاں دیکھ رہے ہو؟'' حکیم نے پُڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ حبیب نے پُڑیوں کی طرف ایسے دیکھا کہ اُس کی زندگی کا دارومدار اِسی پر ہو۔''خاکی کاغذ والی!'' حبیب نے اثبات میں سر ہلایا۔''اِنھیں بالکل نہار کھانا ہے؛ کلی کرنے سے بھی پہلے۔ منہ کے اندر لگی لیس کے ساتھ۔'' حبیب نے اپنی جھرجھری چھپائی۔ اُس کے ذہن میں اپنے خوابوں کی چچپاہٹ آ گئی۔''سفید کاغذ والی شام شروع ہونے سے پہلے گائے کے دودھ کے ساتھ کھانی ہیں۔'' حکیم نے دونوں قسم کی پُڑیاں اکٹھی کرتے ہوئے کہا۔

''گائے کا دودھ نہ ملے تو کیا کروں؟'' حبیب نے بے بسی سے پوچھا۔

''ماں کو بتانا۔'' حکیم نے پڑیاں لفافے میں ڈالتے ہوئے حبیب کی طرف بڑھائیں۔ حبیب سنتا آیا تھا کہ آدمی کو غصے میں خود پر اختیار نہیں رہتا: وہ اکثر سوچتا کہ اُسے تو کبھی غصہ نہیں آیا تھا۔ اُسے اچانک حکیم دور اور نزدیک ہوتے محسوس ہوا۔ اُس نے حکیم کے پُڑیاں بڑھاتے

ہاتھ کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ حکیم کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر خوف بھر گیا۔ اُسے حبیب کے مضبوط ہاتھ میں اپنا ہاتھ بے جان سا لگا۔ اُس نے جلدی سے اپنا کمزور ہاتھ حبیب کی مضبوط گرفت میں سے نکالا۔ ''کوئی بھی دودھ ہو؛ بھینس یا گائے کا۔ اور ہاں جب تک میری دوا کھا رہے ہو عورت کے متعلق سوچنا بھی نہ۔'' حبیب نے سوچا کہ وہ تو عورت کے متعلق سوچتا ہی نہیں تھا، اُسے پتا ہی نہیں تھا کہ عورت کے متعلق کیسے سوچتے ہیں؟ صرف راشدہ اُس کے خوابوں میں آجاتی ہے۔

حبیب نے باقاعدگی سے دوا کھانا شروع کر دی۔

حبیب کا گھر محلّہ موری والے دروازے میں تھا، کہا جاتا ہے کہ وہ شہر کا قدیم ترین رہائشی علاقہ ہے اور وہاں ایک قلعہ ہوا کرتا تھا جس کے آثار موجود تھے۔ اُس محلے کی چند گلیاں چوڑی اور چند اتنی تنگ تھیں کہ اُن میں سے صرف ایک آدمی گزر سکتا تھا اور مخالف سمت سے آنے والے کو راستہ دینے کے لیے دیوار کے ساتھ جُڑ کے کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ یہ تنگ گلیاں قلعے کے دفاعی نظام کا حصہ تھیں جن میں حملہ آور سپاہ کو دھوکے سے داخل کروا کے ختم کر دیا جاتا تھا۔ حبیب کا گھر ایک تنگ گلی میں تھا اور راشدہ کا تین چھوڑ کر۔ حبیب رات کو کھانے کے بعد اپنے گھر کے سامنے تنگ گلی کے اندھیرے میں اپنے خیالات میں گم بیٹھا رہتا۔ دِن کی محنت کے بعد گلی کے اندھیرے میں اپنے خیالوں میں گم بیٹھنا اُسے اگلے دن کے لیے ایک تازگی دیتا تھا۔

ایک رات وہ ایسے ہی گلی میں، گھر کے سامنے، اپنی سوچوں میں گم بیٹھا تھا کہ راشدہ اپنے گھر سے نکلی۔ حبیب نے دِل میں اُن لڑکوں کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے کمیٹی کی طرف سے روشنی کے لیے لگائی گئی ٹیوب لائٹ کو غلیلوں سے مشق کرتے ہوئے توڑ دیا تھا۔ وہ راشدہ کا راستہ روک کے کھڑا ہو گیا۔ راشدہ شرارت سے ہنسی: ''سنا ہے کہ باجی تمھاری گندی شلواریں دھوتے تنگ آگئی ہے اور تم اپنے علاج کے لیے حکیم سے ملے ہو۔'' حبیب نے دِل میں اپنے بھائی کو گندی گالی دی۔ ''تم ایسا کیوں کرتے ہو۔'' وہ پھر ہنسی۔ حبیب کو اب اُس کی ہنسی پیاری لگی۔ اُس ہنسی میں شرارت کے ساتھ معصومیت بھی تھی۔

''کرتا نہیں ہوں کوئی کرواتا ہے۔'' اُس کا جی راشدہ کو چھونے کو کر آیا اور اُس نے گال کو چھو لیا۔ راشدہ کا گال نرم اور تھوڑا سا بھیگا ہوا تھا۔ ''اِس وقت کہاں جا رہی ہو؟'' حبیب کو اُس کا اکیلے

جانا عجیب سا لگا۔ اِس تنگ گلی میں کوئی بھی اُس کا راستہ روک سکتا تھا۔ اُسے اچانک اپنا آپ اُسی طرح بے قابو ہوتے لگا جیسے کہ حکیم کے ساتھ غصے میں ہوا تھا۔ اُس وقت اُبال نے اُسے آپے سے باہر نہیں ہونے دیا؛ وہ خاموشی سے اُس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

''اُس طرف میری خالہ رہتی ہے اُس کے گھر۔'' راشدہ نے ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کام ہے کوئی؟''

''نہیں!''

''پھر؟'' اُس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''ڈرتی نہیں ہو؟''

''ڈرنا کیوں؟ ساری گلیاں آباد ہیں اور میں ایسے ہی جب دِل کرتا ہے کہیں چلی جاتی ہوں۔''

''ایسے ہی؟''

''ہاں! ایسے ہی!''

''واپس کب آؤ گی؟''

''پتا نہیں! دو دن یا شاید تین دن یا شاید چار دن!''

''جب بھی آؤ، رات کو آنا۔ میں انتظار کروں گا۔''

دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ حبیب کا دل کیا کہ راشدہ کو اپنے گھر لے جائے اور پھر کہیں نہ جانے دے۔ اُس نے دوبارہ راشدہ کا گال چھوا۔ اِس بار وہ خشک اور گرم بھی تھا۔

''ٹھیک ہے! انتظار کرنا۔'' راشدہ نے سرگوشی کی۔ حبیب کو محسوس ہوا کہ وہ مشکل سے بول پائی ہے۔

حبیب تین راتیں اُس کی واپسی کے انتظار میں اپنے گھر کی دہلیز کے سامنے بیٹھا رہا۔ ایک رات وہ اُسے عشا کی اذان کے دوران میں مخالف سمت سے آتی ہوئی نظر آئی۔ حبیب خوشی اور پریشانی کی اُس کیفیت میں سے گزر گیا جس سے وہ آشنا نہیں تھا۔ اُسے لگا کہ راشدہ کا دور سے آتا ہوا سایہ جیسا وجود دراصل سایہ ہی ہے اور وہ خود طویل انتظار کی وجہ سے حقیقت اور خواب کے درمیان میں کہیں

گم گیا ہے۔ اُسے اپنے آپ کو پا جانے کی شدید خواہش نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ جب اپنے بے یقینی کے خیالوں میں گم تھا تو راشدہ چلتی ہوئی آ رہی تھی اور پھر اچانک اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

حبیب نے اُس کے گال چھوئے، وہ نرم اور گرم تھے !

''اتنے دِن وہاں رہیں؟'' حبیب کی آواز میں تشویش تھی۔

''ہاں ! پتا ہی نہیں چلا۔'' راشدہ نے اتنی معصومیت سے کہا کہ حبیب کو اپنی کئی نسلوں کی غربت کی محرومی میں ڈوبی ہوئی خائف سی چاہت کو دبانا مشکل ہو گیا۔ اُس کے اندر چاہت کا طوفان تھا لیکن وہ اپنے ہی خوف میں ڈوبا راشدہ کو بار بار چھو کے اِس طوفان کو کنارے لگانا چاہتا تھا۔ اُسے اپنا دم گھٹتے ہوئے محسوس ہوا تو اُس نے ایک لمبی سانس لی؛ راشدہ نے بھی لمبی سانس کھینچی۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''میں اب جاؤں؟'' راشدہ نے بات کرتے ہوئے سوال کیا۔ وہ اُلجھن میں تھا کہ کیا وہ جانا چاہتی تھی؟

''گھر والوں کے خیال میں تو تم ماسی کے گھر ہو۔'' حبیب اُسے روکنا چاہتا تھا، ''تھوڑی دیر رکنے میں ہرج کوئی نہیں۔'' اُس نے راشدہ کو ایسے لہجے میں تجویز پیش کی کہ حکم لگے۔

''بہانے بنانے تو بہت جلد سیکھ لیے کسی نے۔'' راشدہ نے شوخی سے مسکراتے ہوئے گلی میں چاروں طرف دیکھا اور کسی کو آتے نہ دیکھ کے مطمئن ہو گئی۔ حبیب کے اندر ایک اُمید زندہ ہو گئی۔ اُس کی بھابھی رخسانہ اور راشدہ قریبی رشتے دار تھیں اور یہی وجہ تھی کہ راشدہ کو اُس کے چھپاتے خوابوں کے بارے میں علم تھا۔

''جو میں نے کہا کیا بہانہ تھا؟'' حبیب نے بھی اُسی طرح جواب دیا، ''تم ماسی کے گھر سے آئی ہی نہیں، میرے پاس کب کھڑی ہو؟'' حبیب نے ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ تنگ گلی اُنھیں اپنے کلاوے میں لیے ہوئے تھی۔ گلی میں سے مغرب کے بعد آمد و رفت کم ہو جاتی تھی، حبیب کو کسی کے آنے کا اُس طرح سے خوف نہیں تھا۔

''میں پھر ماسی کے گھر ہی جاتی ہوں جہاں تمھارے خیال میں مَیں ہوں۔'' راشدہ نے، جس طرف سے وہ آئی تھی اُدھر واپس جانے کی اداکاری کی اور حبیب نے اُسے روکنے کی۔ وہ تنگ گلی

بنائی ہی اِس لیے گئی تھی کہ جس کا راستہ روک لیا جائے وہ آگے نہ جا سکے۔ حبیب، راشدہ کے سامنے کھڑا تھا اور وہ واپس جانے کی اداکاری میں اُس سے ٹکرائی اور حبیب بھی اُس سے ٹکرا گیا اور وہ دونوں اِسی اداکاری میں ایک دوسرے سے ایسے لپٹے کہ اُنھیں وقت کا ہوش ہی نہ رہا۔ حبیب کو یاد آیا کہ حکیم نے اُسے عورت کے متعلق سوچنے سے منع کیا ہوا تھا۔ راشدہ اُس کے ساتھ چمٹی شاید ماسی کے پاس نہ جانے کی کوشش میں تھی کہ حبیب قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔ راشدہ یک دم گھبرا کے پیچھے ہٹی۔

''کیا ہوا؟''

''حکیم نے کہا تھا کہ جب تک میری دوا کھاتے ہو عورت کے متعلق سوچنا بھی نا۔''

''تم کہنا میں سوچتا نہیں، صرف راستہ روکتا ہوں۔'' اب راشدہ ہنس رہی تھی۔ ''دوا سے کچھ فرق پڑا؟''

حبیب تلملا سا گیا۔ اُسے اندھیرے میں راشدہ کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا اور اُسے ہنسی میں سے کوئی معنی کشید کرنا مشکل لگا۔ اُس نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ بھابھی رخسانہ کی معرفت محبوب سے بات کر کے راشدہ سے رشتے کی بات چلوائے گا۔ اُسے یہ ثابت کرنا تھا کہ حکیم کی دوا کا کوئی اثر ہوا ہے کہ نہیں!

وہ کچھ دیر ٹیوب لائٹ کے لیے لگائے کھمبے کی طرح ناکارہ سا کھڑا رہا۔ وہ راشدہ میں اُکتاہت کو زندہ ہوتے محسوس کر سکتا تھا۔ حبیب نے سوچا کہ اگر کچھ دیر وہ ایسے ہی کھڑا رہا تو راشدہ کسی طرف چلی جائے گی۔ وہ اُسے روکے رکھنا چاہتا تھا۔ راشدہ نے ماسی کے گھر جانے کے لیے اُسے دھکیلنا بند کر کے بے ڈھبے سے طریقے سے خود کو الگ کر لیا تھا۔ حبیب نے تھوڑا سا آگے کو جھک کے کہا: ''ماسی کے گھر نہیں جاؤ گی؟'' اُسے اپنی آواز کھوکھلی سی لگی۔ اُس نے اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے راشدہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔ ''نہیں جانے دوں گا۔''

راشدہ نے باری باری دونوں بازو آزاد کروائے اور ایک لمبی سانس لی۔ ''اگر وہاں نہیں جانے دینا تو اپنے گھر لے جاؤ۔'' راشدہ کی آواز کی شدت نے اُسے خوف زدہ کر دیا۔ ''میں نے کہیں تو جانا ہے، پھر یہاں کیوں نہیں؟'' اُس نے حبیب کے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھیرے سے کہا، حبیب کو سننے میں دشواری ضرور ہوئی مگر سمجھنے میں نہیں۔

راشدہ، حبیب کے ساتھ شادی کے بعد تین سال گھر سے باہر نہیں نکلی، اُس کے والدین تین گھر اوپر رہتے تھے اور خالہ کا گھر تین گلیاں نیچے تھا۔ حبیب کا خیال تھا کہ راشدہ کو گھر میں وہ سب کچھ مل گیا جسے ڈھونڈنے وہ عزیزوں کے گھروں میں جاتی تھی۔ آبادی کے جنوب مغرب میں ایک نہر بہتی تھی جس کے کناروں پر رہائشی کالونیاں بن رہی تھیں اور محبوب نے ایک کالونی میں پانچ مرلے کا احاطہ لے رکھا تھا جس پر اُس نے اپنے لیے چھوٹا سا گھر تعمیر کر کے آبائی گھر حبیب کو دے دیا۔ اُن کی بہن خالدہ کی جلال پور بھٹیاں میں شادی ہو چکی تھی۔ راشدہ نے اُس تنگ گلی میں تنگ گھر کو اپنی نفاست سے کھلا کر دیا۔ حبیب جب کام سے آتا تو اُس کے نہانے کے لیے صابن، تولیہ اور تیل کی بوتل غسل خانے میں رکھی ہوتی۔ وہ جیسے ہی غسل سے فارغ ہوتا، بھاپ دیتی ہوئی چائے کا پیالہ منتظر ہوتا۔ راشدہ اُسے ہر شام دھلا ہوا لباس پہننے کو دیتی۔ شادی کے پہلے سال کے بعد اُن کے ایک بیٹا پیدا ہوا اور دونوں ایک دوسرے میں اتنے گم تھے کہ اُنھیں وقت کی پرواز کا احساس ہی نہ ہوا۔ تین سالوں کے بعد راشدہ پہلی مرتبہ تین دنوں کے لیے گھر سے غائب ہوئی۔ وہ ننھے اقبال کو اپنے ساتھ لے کر نہیں گئی؛ حبیب کا خیال تھا کہ وہ گلی میں جھانکنے گئی ہے اور کسی بھی وقت آ جائے گی۔ وہ تنگ سے صحن میں بیٹھے اقبال کی شرارتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ وہ اچانک باہر چلی گئی۔ حبیب نے اُس کا انتظار کیا اور جب وہ واپس نہ آئی تو گلی میں جا کے جھانکا، وہ اُسے کہیں نظر نہ آئی۔ وہ پریشان سا صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ بہت کم اپنے سسرال جاتا تھا، اُس شام وہ اقبال کو گود میں لیے اُن کے ہاں چلا گیا۔ اُس کے وہاں جانے سے ایک چھوٹا سا زلزلہ آ گیا۔ حبیب کو اپنا جتنا گھر بہت کھلا لگنے لگا۔ حبیب کے سسرال کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس کو کیسے سنبھالیں۔ وہ مسکراتے ہوئے ارد گرد دیکھتا رہا، اُسے راشدہ کہیں نظر نہیں آئی اور وہ جس طرح داخل ہوا تھا خاموشی سے اُسی طرح باہر نکل گیا۔ تین دن ہو گئے تھے اور وہ ننھے اقبال کو چپ کرانے کی کوشش میں تھا کہ راشدہ اُسی طرح گھر میں داخل ہوئی جیسے وہ گئی تھی۔ اُس نے حبیب کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی کو دیکھا جسے دو دنوں سے مونڈا نہیں گیا تھا۔

''کوچی اور بلیڈ سے اپنے گال صاف کرو اور نہاؤ۔ میں صاف کپڑے نکالتی ہوں۔'' اُس نے ننھے اقبال کو گود میں لے کر اُس کا چہرہ دیکھا اور اُسے نل کے سامنے لے جا کے نہلانے لگی۔ جب حبیب نہا کے آیا تو راشدہ نے صاف ستھرے ننھے اقبال کو حبیب کے حوالے کر کے جھاڑو تھام لیا۔ صحن کو

صاف کر کے وہ چولھے کے آگے بیٹھ کے کھانا بنانے میں جُٹ گئی اور پھر نہا کر مسکراتی ہوئی حبیب کے سامنے آن موجود ہوئی۔ حبیب اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا اور دھیرے دھیرے مسکراتا رہا۔ راشدہ نے چارپائی پر کھانا رکھا اور دونوں آلتی پالتی مار کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

حبیب کو اچانک اپنا گھر بیگانہ سا لگنے لگا؛ ہر شے سلیقے سے وہاں پڑی ہوئی تھی جہاں اُسے ہونا چاہیے، وہ تین دنوں میں ایک گہری بے ترتیبی کا عادی ہو گیا تھا۔ حبیب نے لقمہ منہ میں ڈالا تو اُسے سواد نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ تین دنوں میں یہ ذائقہ بھول ہی گیا تھا۔ اُسے پچھلے تین دنوں میں اپنے بنائے ہوئے بدذائقہ کھانے یاد آ گئے۔ اُسے راشدہ کو اپنا قیدی بنانے کا خیال آیا۔

''تم ایسے غائب کیوں ہو جاتی ہو؟'' حبیب نے ایک دم پوچھا۔ اُسے راشدہ کی بتائی ہوئی بات یاد آ گئی کہ وہ کسی کو بتائے بغیر اپنی ماسی کے ہاں چلی جاتی ہے۔ اُس کے سوال سے مفاہمت کی طرف بڑھتا ماحول ا یک دم بھاری ہو گیا۔ راشدہ نے ایک لمبی سانس لے کے حبیب کی طرف دیکھا؛ اُس کے ہونٹوں پر ایک خوابیدہ سی مسکراہٹ تھی۔ دونوں کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے؛ حبیب کو یک دم راشدہ اور اپنے آپ سے خوف محسوس ہونے لگا۔

''ایک بہت پرانی کہانی ہے جو میری دادی سنایا کرتی تھی۔ کسی ملک میں نہایت نیک دل اور انصاف کرنے والا بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اُس نیک دل حاکم کو ایک بھکارن پسند آ گئی جو خوب صورتی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ بادشاہ نے شادی کر کے بھکارن کو اپنی ملکہ بنا لیا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ملکہ کو بھوک لگنا ختم ہو گئی اور اُس کی صحت روز بروز گرنے لگی۔ کئی معالج اور بزرگ آئے، کوئی دوا یا دعا کارگر نہ ہوئی؛ بادشاہ پریشان اور رعایا دکھی۔ بھوک تو جیسے ہوائیں اُڑا کے لے گئی تھیں۔ ایک دِن ایک بزرگ آیا جس نے بادشاہ سے ملکہ کے ساتھ ملاقات کی درخواست کی۔ بزرگ سے پہلے آنے والے صرف نبض پڑھتے تھے اور پھر اپنی دوا یا دعا تجویز کرتے تھے۔ بزرگ نے کچھ دیر ملکہ کے ساتھ گزارا۔ سب حالات جاننے کے بعد اُس نے بادشاہ سے ملاقات کی درخواست کی جسے بادشاہ نے قبول کر لیا۔ بزرگ نے بادشاہ کو بتایا کہ ملکہ کو گھوم پھر کے کھانے کی عادت ہے؛ اُسے بھوک تو لگتی ہے لیکن وہ ایک جگہ پر بیٹھ کے نہیں کھا سکتی۔ اُس کے لیے ایسی عمارت تعمیر کی جائے جس میں کئی آلے ہوں اور اُن میں کھانا کئی حصوں میں رکھ دیا جائے۔ ملکہ کہیں سے روٹی لیتی، کہیں سے اُس پر سالن ڈالتی

اِس طرح اُس کا کھانا کئی جگہوں پر بکھرا پڑا ہو؛ جسے وہ مزے لے لے کے کھاتی۔ ملکہ کی بھوک واپس آ گئی اور وہ ملک ہنسی خوشی ایک بار پھر آباد ہو گیا۔''

راشدہ نے بات ختم کر کے ایک لمبی سانس لی؛ حبیب کا ذہن اُس کی تھالی کی طرح خالی تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا راشدہ کو دیکھتا رہا۔ پھر راشدہ دھیما سا مسکرائی: ''میں نے تمھاری بات کا جواب نہیں دیا؟'' اقبال اُس کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ اُس نے جھک کے اُس کا منہ چوما۔ ''میں جب کچھ عرصہ ایک جگہ رہ لوں تو میری تلیوں میں گدگدی اور کچھ کچھ خارش ہونے لگتی ہے۔ جی کرتا ہے کہ کسی طرف، دور چلی جاؤں؛ لیکن کہاں جاؤں؟ اِسی لیے کبھی خالہ کے چلی گئی اور کبھی ہائی سکول کے پاس چچا کے گھر۔ اپنے گھر سے نکل کے ایک آزادی کا احساس ہوتا ہے۔ نیا صحن، نئے لوگ، نئی باتیں۔ ماسی اور میری ماں کو کھانا پکانا اُن کی ماں یعنی میری نانی نے سکھایا تھا۔ دونوں کے پکائے ہوئے کھانے کا ذائقہ مختلف ہے، حالانکہ بالکل ایک جیسا ہونا چاہیے۔ پتا کیوں؟'' گرمی کے باوجود حبیب کو ہلکی ہلکی ٹھنڈ کا احساس ہو رہا تھا؛ اُسے لگا کہ وہ دیر سے بارش میں کھڑا ہے۔ اُسے ایک جھرجھری آئی۔ ''میں بتاتی ہوں۔'' وہ ہلکا سا ہنسی۔ راشدہ کو اپنی باتوں کا مزہ آ رہا تھا۔ ''اُن کے کھانے میں اپنے اپنے سسرال کا ذائقہ بھی شامل ہو گیا ہے۔ میں جہاں جہاں جاتی ہوں اُن کی باتیں اور حالات وہی ہیں جو ہمارے ہیں لیکن اُن میں کچھ اپنا بھی ہے جو میرا نہیں ہے؛ مجھے اُس کی تلاش ہے جو میرا نہیں۔'' وہ رکی اور جھک کے اقبال کو پیار کیا۔ ''تمھارا کہیں جانے کو دل نہیں کرتا؟''

حبیب نے پھر ایک جھرجھری لی۔ اُس نے سوچا کہ اُسے اپنے کام اور راشدہ کو محبت کرنے کے علاوہ کچھ پتا ہی نہیں۔ پھر اُس نے سوچا کہ وہ یہ سب جان کے کیا کرے گا؟ وہ کبھی کہیں گیا ہی نہیں، اُسے اپنے شہر کے باہر کا کچھ پتا نہیں۔ کیا یہ سب جاننا زندگی کا حصہ ہے؟ محبوب نے تو اُسے صرف محنت کرنا ہی سکھایا تھا۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اُسے راشدہ میں ایسی طاقت نظر آئی جس سے وہ واقف نہیں تھا۔ اُس نے ڈر کے مارے صحن میں نظر دوڑائی، ہر سایہ ساکت تھا، اُس کا خیال تھا کہ وہاں کچھ اور بھی نظر آئے گا۔

حبیب حیرت میں گم اُسے دیکھتا رہا۔

اور پھر وہ چارپائی سے اُٹھی، راشدہ کو اپنا بدن تھکا تھکا سا لگا۔ اُس نے اقبال کو حبیب کی گود

میں ڈالا، تھالیاں، چھابا اور گلاس نیچے رکھے اور چارپائی پر لیٹ گئی۔ ''اب تو حکیم کی دوا نہیں کھاتے؟'' وہ شرارت سے ہنسی اور حبیب نے بھابھی رخسانہ کو زیرِ لب گالی دی۔

راشدہ کے ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ حبیب کا خیال تھا کہ بیٹی کے پیدا ہونے کے بعد وہ گھر سے غائب ہونا چھوڑ دے گی۔ اُسے تکلیف اُس وقت ہوئی جب اُس کے غیر حاضری کے دوروں میں کوئی فرق نہ آیا؛ وہ اُسی طرح تین دنوں کے لیے غائب ہو جاتی۔ حبیب کو اعتراض بھی تھا اور اُسے سہولت بھی تھی کہ وہ ننھی رفعت کو ساتھ لے جاتی ہے۔ اُسے رفعت کا ساتھ لے جانا پسند تو نہیں تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ لڑکی کو ماں کا سنبھالنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

حبیب کا اپنے گھر کے ساتھ رشتہ بہت گہرا ہو گیا۔ راشدہ کی تلیوں میں جب گدگدی اور خارش ہوتے اور وہ رفعت کو لیے کسی طرف نکل جاتی تو وہ گھر میں پناہ ڈھونڈتا۔ گھر کے دو کمرے اُسے بادشاہ کے محل سے بھی بڑے لگتے جہاں بھکارن ملکہ کے لیے بے شمار آلے رکھے گئے تھے۔ حبیب کے سامنے کئی مسائل تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ اُس کی راشدہ کے ساتھ محبت تھی۔ وہ گھر کے سامنے گلی میں راشدہ کے ساتھ اپنی ملاقات ذہن میں بسائے ہوئے جی رہا تھا جس میں دونوں نے ایک دوسرے کا راستہ روکا تھا۔ اِسی یاد کے سہارے اُس کی زندگی ہو رہی تھی بالکل موسموں کی طرح جو اپنی ترتیب سے آتے اور جاتے رہتے ہیں؛ اُن میں کوئی تغیر نہیں آتا۔ اُس کا اپنی زندگی پر کوئی دخل نہیں تھا؛ اُس کا سب کچھ راشدہ کے لیے تھا۔ راشدہ جتنا عرصہ گھر میں رہتی، حبیب اُس کی رفاقت کو اپنی سوچ کے ساتھ چمٹائے ہوئے، اُسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی کوشش نہیں کر پا رہا ہوتا۔ وہ ایک طویل انتظار میں جی رہا تھا؛ وہ جب گھر میں ہوتی تو اُسے اُس کے جانے کا انتظار رہتا اور جب وہ چلی جاتی تو اُس کی واپسی کے انتظار میں جی رہا ہوتا۔ وہ کئی بار سوچتا کہ کیا یہی زندگی ہے؟ اُس کا جی چاہتا کہ کبھی اُس کی تلیوں میں گدگدی یا خارش ہوں اور وہ بھی راشدہ کی طرح کہیں نکل جائے۔ اُسے ایسے نکلنا بے مقصد زندگی لگتا اور وہ سوچتا کہ اُس کی زندگی کا مقصد تو راشدہ ہے؛ وہ والی راشدہ جس نے ماسی کے گھر جانے کی اداکاری کی تھی! کیا اُسے موجودہ راشدہ سے کوئی غرض نہیں؟ وہ اُس رات بھی اپنی ماسی کے گھر سے آئی تھی اور وہ تین راتیں گلی میں اُس کا منتظر رہا تھا۔ اُسے راشدہ سے غرض تھی اور راشدہ کا انتظار اُس کی زندگی کا حصہ تھا۔ انتظار ہی اُس کی محبت تھی!

راشدہ، اقبال کو پڑھانا چاہتی تھی اور وہ اُسے کسی اُستاد کے پاس بھیجنا چاہتا تھا تا کہ چار یا پانچ سال کے بعد وہ صاحبِ روزگار ہو جائے۔ اقبال گھر میں جھگڑے کا پہلا سبب بنا۔ حبیب کے ذہن میں کمائی تھی جب کہ راشدہ اپنے بچوں کو صاف ستھرا ماحول دینا چاہتی تھی جس میں تعلیم اولین جگہ رکھتی تھی اور کمائی اتنی اہم نہیں تھی۔ اُسے پہلے تو راشدہ کی بات نہ ماننے پر حیرت ہوئی اور پھر راشدہ کی اطاعت کی عادت نے اقبال کو سکول میں داخل کروا دیا۔ اُسے اقبال کی تعلیم پر اُٹھنے والے اخراجات پسند نہیں تھے۔

زندگی اپنے ہونے کا احساس دلائے بغیر چلتی رہی!

راشدہ اُس کا اُسی طرح خیال رکھتی جیسے شروع کے دنوں میں رکھتی تھی۔ حبیب کو محسوس ہوتا کہ اُسے راشدہ کی پابندیوں کی عادت ہو گئی ہے۔ جب راشدہ اپنے ہی کھوج میں نکلتی اور وہ گھر میں اُس کے موجود نہ ہونے سے خود کو آزاد محسوس کرتا تو وہ اپنے آپ کو اُس مرغ کی طرح سمجھتا جسے رات بھر دڑبے کے اندر حبسِ بے جا میں رکھا گیا ہو۔ اُسے آزادی کی عادت نہیں تھی، وہ تو گھر میں راشدہ کی غیر حاضری میں بھی اُس کی موجودگی کو محسوس کرنا شروع کر دیتا۔ گھر کی چپ میں جہاں وہ اپنے آپ کو طاقت ور محسوس کرتا وہی خاموشی اُسے کمزور بنا دیتی۔ راشدہ کو روشنی میں نیند نہیں آتی تھی اور حبیب چھوٹی عمر سے ہی بتی جلا کے سونا چاہتا تھا، راشدہ کی غیر حاضری میں وہ ہمیشہ صحن اور کمرہ روشن رکھ کے سوتا۔ رات کے کسی وقت اُسے خیال آتا کہ شاید راشدہ کہیں روشنی کی وجہ سے سو نہ سک رہی ہو، وہ فوراً گھر میں اندھیرا کر دیتا۔ وہ اکثر سوچتا کہ راشدہ نے اُسے بھکارن ملکہ کی کہانی کیوں سنائی؟

ایک شام حبیب چار پائی پر نیم دراز تھا اور راشدہ پائنتی پر کھیس بچھائے بیٹھی اُس کے پاؤں پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اقبال کے پڑھنے کے لیے اُنھوں نے اُس کی عمر کے مطابق پلاسٹک کی چھوٹی سی کرسی اور میز خریدے ہوئے تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھا، ہل ہل کے، اونچی آواز میں سبق یاد کر رہا تھا جب کہ راشدہ اُسے خوشی اور غرور سے دیکھ رہی تھی۔ صحن میں بتی جل رہی تھی لیکن ابھی اتنا اندھیرا نہیں ہوا تھا کہ صرف بتی کی روشنی ہی میں نظر آتا۔ حبیب ہمیشہ اِس وقت سے خوف زدہ رہا تھا، اُسے لگا کرتا تھا کہ یہ وقت اُس سے اُس کی آزادی چھین رہا ہے۔ اُسے کس سے آزادی چاہیے تھی؟ راشدہ سے یا اپنے آپ سے؟

راشدہ نے صحن میں چاروں طرف نظر دوڑائی، اُسے ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُس نے ایک لمبی سانس لے کے اپنی تلیوں کو سہلایا اور چار پائی سے نیچے پاؤں لٹکا لیے۔ اُسے ہر چیز ترتیب میں ہونے کے باوجود کہیں بے ترتیبی محسوس ہوئی جسے اُس کی نظر گرفت میں نہیں لے پا سک رہی تھی۔ اُس نے چار پائی کے ساتھ رکھے ہوئے اپنے جوتے پہنے اور صحن کا چکر لگایا؛ وہ کہیں چھپی ہوئی بے ترتیبی ڈھونڈ رہی تھی۔ نلکا چلا کے اُس نے چہرے پر چھینٹے مارے، حبیب کی طرف دیکھ کے اپنائیت سے مسکرائی اور رفعت کو گود میں اُٹھا کے باہر کی طرف چل پڑی۔ دروازے پر جا کر اُس نے حبیب کی طرف دیکھا، دونوں کی نظر ملی۔ حبیب کو راشدہ کی نظر میں ایک التجا لگی، جیسے وہ کہنا چاہتی ہو کہ اُسے واپس بلا لیا جائے۔ حبیب کو اپنے ردِعمل پر حیرت ہوئی۔ وہ بت بنے اُسے دیکھتا رہا۔ وہ لمحہ جو آنکھ کے اوپر مکھی کے بیٹھ کے اُڑ جانے سے بھی مختصر تھا، اُسے زندگی سے بھی طویل لگا۔ اُسے لگا کہ زندگی کی جنگ جسے وہ ہارے بغیر جیت نہیں سکا تھا، شاید ہار رہا تھا۔ اُسے کون شکست دے رہا تھا؟ پلک جھپکنے سے پہلے ہی راشدہ دہلیز پار کر کے گلی میں چلی گئی تھی۔

حبیب اُس مٹتے سے اندھیرے میں اپنی روشنی نکالنے کی کوشش کر رہا تھا !

اچانک اُسے لگا کہ وہ گہرے اندھیرے کے نیچے دبا سانس لینے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ اِس اندھیرے کے کونوں پر ابھی روشنی کی ہلکی سی لکیر تھی جو اُسے معدوم ہوتے محسوس ہوئی۔ اُس نے اُس پتلی لکیر کے مٹ جانے سے پہلے راشدہ کا پیچھا کرنے کا سوچا۔ اگر وہ لکیر اُس گہرے اندھیرے میں مدغم ہوگئی تو اتنے بھاری اندھیرے کے بھار تلے شاید اُس کے پھیپھڑے ہی جواب دے جائیں۔ وہ دروازے کے رُخ کا تعین کر کے گلی میں نکل گیا، اُس وقت راشدہ، رفعت کو اپنے پہلو میں اُٹھائے ہوئے، کھلی گلی میں داخل ہو رہی تھی۔ راشدہ نے مُڑ کے اپنے گھر کی طرف نہیں دیکھا، شاید اُسے یقین تھا کہ حبیب پیچھے نہیں آئے گا۔ حبیب اپنی اُکھڑی ہوئی سانس کی پروا کیے بغیر بھاگتا ہوا چوڑی گلی کے دہانے پر جا پہنچا۔ راشدہ ایک بے نیازی سے چلے جا رہی تھی، حبیب کو لگا کہ وہ خواب میں چل رہی ہے۔ اُس نے آواز دے کے اُسے جگانے کا سوچا اور پھر اُسے خیال آیا کہ کہا جاتا ہے کہ نیند میں چلنے والے کو اگر جگایا جائے تو وہ وہی بن جاتا ہے جو اُس وقت سوچ رہا ہو۔ وہ اپنی سانسوں کو قابو میں رکھے اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اگلی گلی میں مڑ گئی جہاں اُس کی ماسی کا گھر تھا۔ حبیب کو

راشدہ کا پیچھا کرنا جاسوسی اور غیر اخلاقی عمل لگا...... وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔
صحن میں اقبال اُسی طرح اپنا سبق رٹے جا رہا تھا۔

حبیب کو انتظار کرتے پورے نو دن ہو گئے۔ اِس طرح پہلے کبھی ہوا نہیں تھا، راشدہ ہمیشہ تیسرے دِن آ جایا کرتی تھی۔ اُس کے لیے زندگی انتظار سے شروع ہو کے انتظار پر ہی ختم ہوتی۔ وہ اقبال کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ اُس کے لیے بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ ایک دن حبیب اُسے اپنے ساتھ لے گیا جہاں وہ اپنے تایا زادوں کے ساتھ ایک رونق میں زندگی گزارنے لگا۔ حبیب تنہائی کی اُداسی میں اپنے گھر کی پناہ میں چھپا زندہ رہنے کی کوشش میں تھا یا اپنی اُداسی کو تنہائی میں چھپا کے راشدہ کا انتظار کر رہا تھا۔ دسویں دِن وہ راشدہ کی ماسی کے گھر اُس کا پتا کرنے گیا۔ اِس سے پہلے وہ کبھی اُن کے گھر نہیں گیا تھا۔ جیسے ایک بار سسرال میں ہوا تھا، اُسے دیکھتے ہی ہر طرف مسکراہٹوں کی بارش ہونے لگی۔ گھر والے ایک عجیب طرح کی بے بسی کا شکار تھے۔ وہ خوشی میں ڈوبے حبیب کو دیکھتے تھے اور اپنے خلوص بھرے جذبات اُس پر آشکار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حبیب شکست خوردہ سا اُنھیں دیکھتا تھا اور اپنی نظر چاروں طرف دوڑا کے راشدہ کو کھوجتا تھا۔ تبھی اُسے پتا چلا کہ وہ تین دِن وہاں رہ کے ہائی سکول کے سامنے اپنے چچا کے گھر چلی گئی تھی۔ حبیب مایوسی کے بوجھ تلے دبا، اپنے پھیپھڑوں کو ڈھینے سے بچاتا ہوا راشدہ کے چچا کے گھر کی طرف چل پڑا۔ تھوڑا طویل فاصلہ اُس نے دس منٹ میں طے کیا اور شرمندہ سا گھر میں داخل ہوا۔ راشدہ تین دن وہاں گزار کے میاں چنوں میں اپنی پھوپھی کے گھر چلی گئی تھی۔ حبیب نے راشدہ کے پھوپھا کی دکان کا پتا سمجھ لیا اور اگلے دِن بس میں سوار میاں چنوں پہنچ گیا۔ اُسے پھوپھا کی دکان ڈھونڈتے زیادہ دقت نہیں ہوئی اور وہ جلد ہی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والے پنسار کے سامنے کھڑا تھا۔ تعارف کے بعد پھوپھا، حبیب کے ساتھ بزرگانہ خلوص سے پیش آیا اور کاروبار منقطع کر کے اُس کی خاطر میں لگ گیا۔ راشدہ تین دن وہاں گزار کے اپنی پھوپھی زاد کو ملنے گوجرہ چلی گئی تھی۔ حبیب نے اپنی مایوسی چھپانے کی کوشش میں گردن اور نظر جھکا لی۔ پھوپھا نے باتوں میں یہ بھی کہا کہ راشدہ کا بیٹی کو گود میں اُٹھائے اتنا سفر اکیلے ہی کرنا مناسب نہیں تھا۔ حبیب کی حالت اچانک وہی ہو گئی جو حکیم کے ساتھ گائے کے دودھ والے مسئلے پر ہوئی تھی، اُسے اپنے آپ پر اختیار نہ رہا۔ وہ پھوپھا کو گلے سے پکڑنا چاہتا تھا۔ پھوپھا نظر نیچی کیے اپنی بات کیے جا رہا تھا اور اُس نے حبیب

کے مزاج میں برہمی اور پھر قبولیت کو نہیں دیکھا۔ پھوپھا نے اُسے اپنی بیٹی اور راشدہ کے موبائل ٹیلی فون نمبر بھی کاغذ پر لکھ کے دیے۔ حبیب پوچھنا چاہتا تھا: کیا راشدہ کے پاس موبائل ٹیلی فون تھا؟

وہ واپس اپنے گھر کی پناہ میں آ گیا اور اُس نے راشدہ کو ڈھونڈنے کے بجائے وہیں اُس کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ تنہائی اور اُداسی کی دلدل میں اتنا دھنس گیا تھا کہ اُسے ہر وقت اپنا سانس رکتے ہوئے محسوس ہوتا۔ وہ راشدہ کا انتظار تو کرتا تھا لیکن اب اپنے طریقے سے۔ اُس نے ڈاڑھی مونڈنا ترک کر دی تھی، نہانا بھی چھوڑ دیا تھا اور محبوب کے اصرار کے باوجود لباس بھی تبدیل نہیں کر پاتا تھا۔ اُسے اقبال کے ساتھ کوئی دل چسپی نہیں رہی تھی۔ حبیب بھاری سانسیں لیتا دروازے کی طرف دیکھتا رہتا۔

گھر میں کسی اور فرد کی موجودگی کو ضروری سمجھتے ہوئے محبوب نے، حبیب کو بتائے بغیر خالدہ کو بلا لیا تھا۔ حبیب اپنی بہن خالدہ کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے خوش ہوا تھا لیکن پھر اپنی تنہائی میں گم ہو گیا۔ خالدہ اپنی پریشانی کو چھپائے اُس کا دل بہلانے کی کوشش میں رہتی لیکن حبیب اپنے ہی کسی اندھیرے میں گم روشنی سے گریزاں تھا۔ وہ لمبی سانسیں لیتے ہوئے اپنے سینے کو ہلکا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا۔ خالدہ جب بھی کمرے میں آتی وہ اپنی جیب کو زور سے پکڑ کے سانس بحال رکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ اب وہ خود کلامی بھی کرنے لگا تھا!

سردی شدت کی تھی! مغرب کی نماز کا وقت تو نہیں ہوا تھا لیکن خالدہ اذان کے انتظار میں تھی کہ اُسے حبیب کی آواز سنائی دی۔ یہ وہی وقت تھا جب راشدہ گھر سے گئی تھی۔ اُسے اپنے بھائی کی آواز میں دکھ کی تہیں محسوس ہوئیں۔ اُس کے ذہن میں اپنے بھائی کی مختصر سی زندگی کی تمام دل چسپیاں، وابستگیاں اور محرومیاں گھوم گئیں۔ اُسے لگا کہ اُس آواز میں پوری دنیا سمائی ہوئی ہے۔ وہ سردی کی پروا کیے بغیر ننگے پاؤں حبیب کے کمرے کی طرف بھاگی۔ ابھی مکمل اندھیرا نہیں ہوا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح کمرے کا بلب جل رہا تھا اور حبیب کی نظر اُسے دیکھے بغیر دروازے کے پار دیکھ رہی تھی۔

''راشدہ!''

خالدہ اُس بلاوے کے دکھ کی گہرائی میں ڈوب گئی۔ وہ ایک پل کے لیے دروازے میں رُکی تو اُسے محسوس ہوا کہ حبیب کو نام لینے میں غلطی لگی ہے اور اُس نے اُسے بلایا ہے۔ حبیب نے اپنا دایاں

ہاتھ ایسے اُٹھایا کہ کسی کو رکنے کا اشارہ کر رہا ہو۔ ’’راشدہ!‘‘ حبیب کی آواز میں التجا تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ حبیب نے اُسے آواز نہیں دی ہے۔ ’’ٹھہرو میں آرہا ہوں۔‘‘ خالدہ ایک چیخ کے ساتھ اُس کی طرف بھاگی۔ حبیب کا اُٹھا ہوا ہاتھ بے جان ہو گیا جسے راشدہ نے نیچے گرنے سے پہلے ہی تھام لیا۔ حبیب کا دوسرا ہاتھ چھاتی پر جیب کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ خالدہ نے پیار سے جیب پر حبیب کی گرفت ڈھیلی کر کے اندر سے کاغذ کا مسلا ہوا ٹکڑا نکالا۔

کاغذ کے اُس ٹکڑے پر دو موبائل ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے!
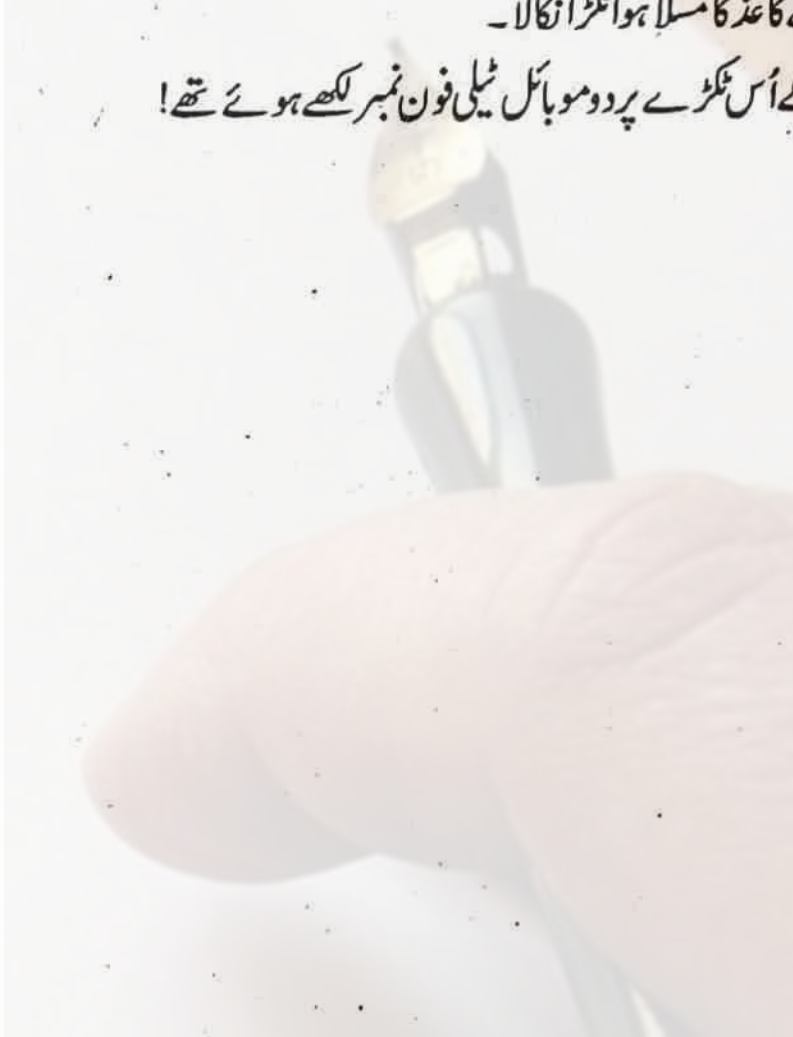
بات کچھ اور تھی

اندھیرا اُس کی آنکھوں میں گھس رہا تھا!

تھوڑی دیر پہلے تک وہ اپنے کمرے میں سرہانے والی لیمپ جلائے روشنی کے جزیرے میں کھلی آنکھوں سے لیٹا تھا اور اندھیرے کے خوف سے روشنی ہی رکھنا چاہتا تھا۔ اُسے اندھیرا ایک آسیب محسوس ہوتا جو اُسے نگل جائے گا۔ وہ جلتی ہوئی بتی میں بھی آنکھیں بند کرنے سے خائف تھا کہ مبادا اندھیرا آنکھوں میں گھس جائے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اندھیرا آنکھوں میں گھس گیا تو پھر اُسے صبح ہونے تک ایک عذاب میں سے گزرنا ہوگا۔ وہ اِس اندھیرے سے اتنا خائف تھا کہ کئی مرتبہ خودکشی کا بھی اُسے خیال آیا لیکن وہ روشنی میں زندہ رہنا چاہتا تھا کیوں کہ اُس نے سنا تھا کہ قبر میں بھی اندھیرا ہوتا ہے۔ وہ قبر کے اندھیرے سے کیوں خائف تھا؟ اُس نے تو سنا ہوا تھا کہ مرنے کے بعد انسان کچھ محسوس نہیں کرتا۔ اُسے روشنی پسند تھی اور وہ روشنی کو اپنی آنکھوں میں بھرے رکھنا چاہتا تھا جب کہ اُس وقت اندھیرا اُس کی آنکھوں میں گھس رہا تھا۔

اُس کا دن مصروف گزرتا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے سے گھر میں چھوٹی چھوٹی مصروفیات میں الجھا رہتا۔ اُس کے گھر ایک جوان عورت کام کرنے آتی تھی جو کسی بھی طرح اگر بدشکل نہیں تھی تو خوب صورت بھی نہیں تھی۔ اُس کی خوب صورتی پر اثرانداز ہونے والا سب سے بھاری بوجھ اُس کی عسرت تھی۔ وہ اگر فاقہ زدہ نہ ہوتی تو شاید خوب صورت ہوتی اور اگر خوب صورت ہوتی تو اُس نے اپنی

عسرت کا مداوا کر لینا تھا۔ اُس کے خاوند نے کسی اور عورت کے ساتھ ساز باز کر کے اُسے اپنی زندگی سے الگ کر دیا تھا۔ وہ اگر اُسے الگ نہ کرتا تو وہ شاید خود ہی الگ ہو جاتی کیوں کہ وہ اُسے بانجھ ہونے کے سبب اکثر اُس پر تشدد کرتا رہتا تھا۔

وہ گھر کو سارا دن روشن رکھتی۔ پردے ہر وقت ہٹے ہوتے اور روشنی بن بلائے مہمان کی طرح ہر طرف مسکراتی نظر آتی۔

اُس کے ہر طرف روشنی تھی لیکن اُس کے اندر کہیں اندھیرا تھا جس سے وہ خائف رہتا اور وہ اپنے خوف کو کم کرنے کے لیے وہیں جاتا جہاں اُسے جانا چاہیے تھا۔ جہاں وہ جاتا وہ جگہ سب کے علم میں تھی لیکن پھر بھی وہاں کوئی جاتا نہیں تھا۔ اُس جگہ کا دبدبہ اور تمکنت ہی اتنی تھی کہ کوئی بھی جاننے کی کوشش نہ کرتا۔ صرف وہ ہی جانتا تھا کہ وہاں کس کی رہائش تھی! وہ جب بھی زندگی کے کسی قسم کے دباؤ تلے آجاتا اور خودکشی ہی اُسے راہِ فرار محسوس ہوتی تو وہ وہاں جاتا۔ وہاں اُس کی تحلیل نفسی تو نہیں کی جاتی تھی لیکن اُسے حوصلہ دیا جاتا اور واپس زندگی کی سڑک پر چلا دیا جاتا۔

اُسے اندھیرے سے خوف تھا جسے دور رکھنے کے لیے اُس نے سرہانے والی بتی جلائی ہوئی تھی اور چاہتا تھا کہ ابھی کچھ دیر جاگ لے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اندھیرے کا ایک ریلا اُس کا منتظر ہے جو اُسے اپنے ساتھ کسی طرف بہا لے جائے گا اور اُس کے پاس اِس طوفان میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ جاگتے رہنا چاہتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ جب نیند نے اُس کے کواڑوں کو چپکے سے کھولا تو اُسے اپنی نیند کو کسی کے حوالے کرنا ہی پڑنا ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ اندھیرے کے آنکھوں میں گھسنے سے خائف تھا۔

وہ اُس گھر میں جانے سے کبھی خائف نہیں ہوا تھا جہاں کہیں چندھیا دینے والی روشنی تھی اور کہیں گھپ اندھیرا اور کہیں روشنی اور اندھیرے کے گلے ملنے کا نظارہ۔ وہ اتنا کچھ کیسے سنبھال سکے گا؟ اُس گھر میں وسیع لان تھے جہاں خوش رنگ جھاڑیاں تھیں، جہاں پھولوں کی کیاریاں تھیں جن میں رنگ برنگے پھول کھلے تھے جو مصنوعی بھی لگتے، جہاں درختوں کے جھنڈ تھے جن پر پرندے بیٹھتے اور جو اُن کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ تھی اور جہاں وہ پرندے بھی تھے جن کا نام و نشان مٹتا جا رہا ہے۔ وہ پہروں اُن پرندوں کو شور کرتے سنتا رہتا، وہ سوچتا کہ کبھی رات نہ ہو اور اُس کے کان اِس موسیقی کو اپنے

اندر جذب کرتے رہیں۔

وہ جب اِس گھر میں آتا تو اُسے ایک شدید قسم کے احساسِ کمتری کا سامنا ہوتا تھا۔ اُسے اپنا گھر، جو اپنے علاقہ میں بڑا گھر تصور کیا جاتا تھا، ایک جھگی لگتا اور ایسا تب تک ہوتا رہا جب تک وہ ملازمہ وہاں رہنے کے لیے رضامند نہیں ہو گئی۔ وہ ملازمہ جھگی کی رہنے والی تھی اور اُسے دو بیڈ روم والا گھر ایک خواب کی دنیا لگا تھا۔ اُس کا نام تو سروری تھا لیکن وہ اُسے ملازمہ ہی کہنا پسند کرتا۔ ملازمہ خوش تھی کہ اب موسم کی شدت اُس پر اثر انداز نہیں ہو گی، وہ یہاں سایوں اور دھوپ میں زندگی گزارے گی۔ وہ ایک جھگی سے اُٹھ کے وہاں آئی تھی اور گھر کی متعدد آسائشیں اُسے خوف زدہ کرتی تھیں؛ وہ ایسی زندگی کی عادی تھی جہاں انسانوں کے باہمی تعلق میں ایک اجنبیت تھی اور مفاد ہی زندگی کا مقصد تھا۔ اُسے اپنا مالک ایک ہمدرد انسان لگا گو کبھی کبھی اُس میں اپنے خاوند کا عکس بھی نظر آتا۔ اُس کا خاوند نامعقولیت کا شکار آدمی تھا۔ وہ دِن میں تین گھروں میں کام کیا کرتی تھی اور اُس کا خاوند ایک گھر میں گارڈ تھا جہاں اُسے ہفتہ وار ایک چھٹی ملتی تھی۔ وہ گھر پر تھا اور اُسے بھوک نے شدید تنگ کیے رکھا اور جب ملازمہ اپنے دِن کے کام نمٹا کے گھر گئی تو خاوند نے اتنا مارا کہ اُس کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی، مار کی وجہ اُس کا کام چھوڑ کے گھر آ کے اُسے کھانا نہ دینا تھا۔ وہ مارتا رہا اور یہ کہتی رہی کہ اُس کی جیب میں پیسے تھے اور وہ بازار جا کر کھا سکتا تھا۔ ٹوٹے ہوئے بازو کے ساتھ وہ اپنے خاوند کے کسی کام کی نہیں رہی تھی؛ وہ جن گھروں میں کام کرتی تھی انھوں نے ایسی عورتیں تلاش کر لیں جن کے گھریلو حالات اچھے تھے اور جو اپنے خاوندوں کے دکھڑے بیان کر کے مالکنوں کو بے زار نہیں کرتی تھیں۔ وہ جب ایک سالم اور ایک ٹوٹے ہوئے بازو کے ساتھ اُس کے گھر گئی تو وہ اُسے نہ تو خوب صورت لگی اور نہ بدصورت، جوان لگی اور نہ ڈھلتی عمر کی؛ وہ اپنے لٹکتے ہوئے بازو کے ساتھ صرف مضحکہ خیز لگی تھی اور اُس کی ہنسی نکل گئی اور وہ کافی دیر تک ہنستا رہا اور سروری کو اپنے خاوند اور اِس آدمی میں، جو جوانی اور ڈھلتی عمر کے کہیں درمیان میں تھا، کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ وہ مایوسی، غصے اور بے بسی سے جانے کے لیے مڑنے لگی تو اُس نے روک لیا۔ وہ اُسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا اور اُس مسکراہٹ میں ایک ایسی اپنائیت تھی جس سے اُس کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا؛ اُس کی شناسائی تو صرف ایسے خود غرض لوگوں کے ساتھ تھی جن میں مطلب پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اُس کے اِس طرح دیکھنے سے سروری کے ذہن میں وہ چند مرد گھوم گئے جن

کے ساتھ اُس کا واسطہ رہا تھا اور جن کی نظر میں ہمیشہ اپنائیت کے بجائے خودغرضی ہوتی تھی۔

وہ رک گئی!

وہ ابھی آدھی مڑی تھی۔ وہ نہ تو اُس کی طرف دیکھ رہی تھی اور نہ ہی نظر بچائے ہوئے تھی۔ وہ رکنا نہیں چاہتی تھی لیکن جا نہیں پا رہی تھی اور رکنا چاہتی تھی لیکن رکا نہیں جا رہا تھا۔ وہ اُسی طرح آدھی مڑی اور آدھی سیدھی کھڑی تھی ۔ یہ ایک مضحک حالت تھی۔ وہ دونوں ہی کچھ طے نہیں کر پا رہے تھے۔ اُسے سروری ایک عام عورت نہیں لگی تھی اور سروری اپنے سامنے کرسی پر بیٹھے آدمی کو ایک ترچھے زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے دیکھنے میں حیرت کے ساتھ بے یقینی تھی اور نفرت بھی کہ وہ کچھ دیر پہلے تک اُس کے نیم اپاہج ہونے کا مذاق اڑاتا رہا تھا اور اب اچانک اُس کی نظر میں اپنائیت کی چکاچوند خیرہ کیوں کر رہی تھی؟ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اُن کے دیکھنے میں لاتعلقی تو نہیں تھی لیکن اپنائیت بھی نہیں تھی۔ پھر وہ سیدھی ہوئی۔ اب اُن کے ایک دوسرے کو دیکھنے کا زاویہ بدل گیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اُس کی مسکراہٹ میں اپنائیت کے ساتھ ساتھ دل چسپی بھی تھی، ایسی دل چسپی جو پاؤں میں پڑی ایک زنجیر کی طرح تھی۔

''تم میرے ہاں کام کرو لیکن میں تنخواہ نہیں دوں گا۔'' اُس کی آواز میں ٹھہراؤ اور حکم تھا۔ سروری کے پاؤں وہیں جم گئے۔ وہ کھڑی تھی اور کچھ کہنا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ کیا وہ چلی جائے ؟ کیا وہ رکی رہے؟ وہ خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی اور پھر اُسی خاموشی کے ساتھ باورچی خانے میں چلی گئی۔ سروری نے گھر کو سنبھال لیا۔ وہ جب چھوٹی تھی اور شہر کے باہر، جہاں سے کھیت شروع ہوتے تھے، وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک جھگی میں رہتی تھی اور پاس ہی راتوں کو ایک پرندہ مسلسل بولتا تھا۔ اُس نے ماں سے پوچھا کہ یہ ہر رات کیوں شور کرتا ہے؟ ماں نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ ٹٹیو لی تھی اور اُس کا گھونسلا زمین پر ہوتا ہے اور یہ رات کو ٹانگیں آسمان کی طرف کر کے سوتی ہے۔ اُس کے خیال میں وہ آسمان کو زمین پر گرنے سے روکے ہوئے ہے۔ سروری نے بھی گھر کو ایسے ہی سنبھال لیا۔ وہ سوچتی کہ اگر وہ گھر کو نہ سنبھالتی تو گھر نے یقیناً ڈھے جانا تھا۔ وہ، سروری کو ڈیڑھ بازو کے ساتھ گھر کے کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا اور اُسے تسلی بھی ہوتی کہ اب وہ گھر سے کہیں باہر بھی جا سکتا ہے، خاص کر درختوں پر پرندوں کے اُس شور کو سننے کے لیے جو کسی اور جگہ نہیں سنا جا سکتا۔

سروری گھر میں اپنے ساتھ ایک رونق لائی اور رونق کے آتے ہی ہر طرف کئی رنگوں کے گلاب کھل اُٹھے۔ وہ جہاں بھی ہوتی وہاں سے اُس کے گنگنانے کی آواز آتی۔ وہ اُس گنگناہٹ میں گم آواز کے اندر چھپے لوچ اور گداز کو تلاش کرتا رہتا جو وہاں موجود نہیں تھے اور اُس کے کانوں تک ایک کھر دری بھنبھناہٹ ہی پہنچتی۔ اب سروری گھر کا حصہ تھی، جس طرح وہ اپنی آرام کرسی پر بیٹھا وقت گزار دیتا ہے یا سروری سارا دِن گھر میں چکر کاٹتی رہتی ہے۔ اُس نے ایک دِن سروری کو گھر میں آنے کا کہہ دیا۔ اُس نے مہمانوں کے لیے مختص کیا کمرہ سروری کو دے دیا کہ اُس کے پاس، جب سے اُس نے یہ کمرہ مہمان خانہ بنایا تھا، کوئی مہمان ہی نہیں آیا تھا۔

سروری دِن کو اپنے کمرے میں سونے لگی!

وہ رات کو اُس کے کمرے میں آجاتی۔ سروری اپنے ایک ہاتھ سے اُس کا بدن محسوس کرتی اور وہ نا آسودگی اور تشنگی کی کشتی میں تکمیل کی منزل کے سفر میں اپنے آپ کو پا جانے کے لیے نیم آسودہ رہتا جو اُسے سروری کو اگلی رات کو آسودگی کے حصول کے لیے پھر ایک بار پھر آزمانے کا سبب بنتا۔ وہ نیم آسودہ تھا اور اُسے آسودگی کی تلاش تھی اور یہی تلاش اُسے آسودگی تک لیے جاتے محسوس ہوتی۔ سروری اُسے تکمیل کے کنارے تک لے جا کے نیم آسودگی کی حالت میں چھوڑ کے خود کسی اور سمت نکل جاتی جہاں وہ گھنے جنگلوں اور جھلستے صحراؤں میں بارش کی بوندیوں کے تلے شانت ہوئے جاتی۔

سروری اب گھر کی مالکن تھی لیکن اُس نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ دو زندگیاں جی رہی تھی۔ ایک زندگی وہ تھی جو اُس کی اپنی تھی اور دوسری وہ جس سے اُس کی کسی بھی طرح شناسائی نہیں تھی۔ اپنی زندگی میں وہ خود مختار تھی۔ وہ جب چاہتی، بغیر کسی جھجک کے کہہ سکتی تھی: ''صاب جی! تم سنبھالو اپنا گھر، میں جا رہی ہوں۔'' یہاں اُس کی اپنی زندگی ختم ہو جاتی۔ وہ سوچتی: ''میں کہاں جاؤں گی؟ اُس نامراد خاوند کے پاس جس نے میرا بازو توڑ دیا؟'' وہ خوف زدہ ہو جاتی۔ اُسے اپنے اردگرد اُس نامراد خاوند کی شکل نظر آتی جس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا اور وہ ڈنڈا اُس کے سر پر بھی لگ سکتا تھا جس سے اُس کی موت واقع ہو سکتی تھی۔ وہ مرنے سے ڈرتی تھی اور یہ بھی سوچتی کہ اُس نامراد کے ساتھ زندگی کسی بھی موت سے کم نہیں تھی۔

وہ فیصلہ کرتی کہ وہی زندگی جیے گی جو اُس کی اپنی تھی!

صاحب جی اُسے کسی بھی وقت گھر سے نکال سکتا تھا۔ اُس کے کمرے میں آرام دہ پلنگ تھا اور وہ تمام سہولتیں موجود تھیں جن کو استعمال کرنا اُس نے جاننے کی کوشش ہی نہ کی۔ وہ جس رات اپنے کمرے میں ہوتی، ہمیشہ فرش پر سوتی تا کہ اُس کے جسم کو اپنی جھونپڑی میں گزری زندگی یاد رہے ورنہ صاب جی پلنگ بہت آرام دہ تھا۔ وہ ہمیشہ ملازموں کے غسل خانے کو استعمال کرتی۔ گھر میں کوئی ملازم تو نہیں تھا لیکن اُن کے لیے ایک رہائشی کمرہ اور غسل خانہ بنائے گئے تھے۔

اپنے شکوک اور ذہنی رو کے باوجود وہ ایک پرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ صاحب جی گھر سے کم ہی باہر جاتا تھا۔ سروری کو دل چسپی بھی نہیں تھی کہ وہ کہاں جاتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ کبھی پریشان واپس آتا اور کبھی اتنا خوش کہ اُس کے سامنے کسی ناچ کے پھیرے لیتا۔ سروری کو حیرانی بھی ہوتی کہ وہ کون سی جگہ تھی جہاں صاحب جی اِس قسم کی حالت میں آتا ہے؟ گو اُسے دل چسپی نہیں تھی کہ وہ کہاں سے آتا ہے لیکن وہ جاننا بھی چاہتی تھی کہ ایسی کون سی جگہ یا لوگ تھے جو اُس کے مزاج پر ایسے متضاد قسم کے اثرات نقش کرتے تھے؟

سروری کے ذہن میں ایک دن آیا کہ ہر عورت کی اپنے عاشق کی وفادار ہونے سے ہی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ دیر تک سوچتی رہی کہ عاشق اور خاوند میں کوئی فرق ہوتا ہے؟ وہ نامعقول آدمی جس نے اُس کا بازو توڑ کر اُسے اپاہج کر دیا تھا اُس کا خاوند تھا لیکن عاشق نہیں اور صاحب جی، جس کے گھر میں وہ بغیر تنخواہ کے کام کر رہی تھی اور جس کی وہ داشتہ تھی، اُس کا خاوند نہیں تھا۔ وہ سوچتی کہ اُسے کس کی ضرورت تھی؟ خاوند کی یا عاشق کی؟ وہ ہر مرتبہ اِس فیصلے پر پہنچتی کہ اُسے عاشق کی ضرورت تھی جو اُسے پسند کرے اور اُس کی عزت کرے، نامعقول خاوند کی طرح نہیں جس نے اُس کا بازو توڑ دیا تھا۔ صاحب جی اُس کی عزت کرتا تھا اور اُس نے سوچا کہ عورت کو وہی آدمی چاہیے جو اُس کی عزت کرے اور اُس کے بدن کو ایک امانت سمجھے۔ صاحب جی نے ہمیشہ اُسے اہمیت دی تھی، سوائے اُس پہلی ملاقات کے جب اُسے دیکھتے ہی اُن کی ہنسی نکل گئی تھی۔ اگر اُسے اپنے خاوند کے ساتھ کوئی دل چسپی نہیں تھی تو وہ صاحب جی کے بیج سے خود کو حاملہ کیوں نہ کر لے۔ اگر اُس کے حمل ٹھہر جاتا ہے تو اُس کی اولاد کو ہمیشہ کے لیے حرامی سمجھا جائے گا۔ وہ کیوں نہ اِس الزام کو سر لے کے صاحب جی کے بیج سے اپنی گود ہری کر لے لیکن کیا اولاد پر حرامی ہونے کی مہر لگانا ضروری تھا؟ صاحب جی ایک خوش شکل

آدمی ہے جب کہ اُس کا خاوند معمولی شکل وصورت کا آدمی تھا۔ وہ اپنے بچے کو حرامی ہونے کے باوجود حرامی ہونے سے کیسے بچا سکتی تھی؟ اُس کے ذہن میں ایک ہی حل آیا کہ ظاہر کرے کہ بچے کا باپ اُس کا خاوند تھا جب کہ بیج صاحب جی کا ہو۔

اُس نے صاحب جی کو اپنے بچے کا باپ بنانے کا فیصلہ کرلیا،!

اب سروری کو انتظار رہتا کہ صاحب جی پورے دن کے لیے کب گھر سے غیر حاضر ہوں۔ سروری کے ذہن میں ایک منصوبہ بن اور مٹ رہا تھا کہ وہ کس طرح صاحب جی کے بچے کو حرامی نہ ہونے دے جب کہ اُس نے ہونا تو حرامی ہی تھا۔ پھر بجلی کے اچانک کوندے کی طرح ایک خیال اُس کے ذہن میں آیا۔ وہ اپنے خاوند سے رابطہ کرے اور جب اُس کے پاس جائے تو اپنے آپ کو مکمل طور پر محفوظ بنا کے جائے کہ اُس نامعقول سے کہیں حاملہ نہ ہو جائے۔ اُسے یہ بھی خیال آتا کہ اگر وہ اتنا مرد ہوتا تو اُسے تب ہی حاملہ کر دیتا جب وہ اُس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ پھر وہ سوچتی کہ قدرت کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں اور کیا پتا وہ ہو جائے اور جو وہ چاہتی تھی نہ ہو۔

اب وہ چاہتی کہ صاحب جی گھر سے غیر حاضر رہا کرے۔ سروری چاہتی تھی کہ وہ روزانہ ایک طویل وقت کے لیے باہر جائے اور وہ یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ صاحب جی کہاں جاتا ہے؟ وہ اتنی متجسس تھی کہ اُس کا پیچھا کرنے کو بھی تیار تھی لیکن وہ پیچھا کر بھی نہیں سکتی تھی کہ صاحب جی شاید کار میں چلا جائے گو وہ جانتی تھی صاحب جی کبھی کار میں نہیں گیا، وہ گھر سے ہمیشہ پیدل ہی نکلتا تھا اور واپسی پر بھی اُس کے پاس کوئی سواری نہیں ہوتی تھی۔ صاحب جی کو گھر سے باہر گئے ہوئے جب زیادہ دن ہو جاتے تو وہ بے چین رہنے لگتا تھا؛ وہ شاید گھر کی یکسانیت سے اُکتا جاتا تھا اور یا پھر جہاں وہ جاتا تھا وہاں کی کشش اُس پر حاوی ہو جاتی تھی!

ایک دِن صاحب جی باہر جانے کو تیار ہو گیا اور یہ اتنا اچانک تھا کہ وہ طے نہ کر پائی کہ اُس کا پیچھا کرے یا اپنے خاوند کے پاس چلی جائے۔ اُس نے صاحب جی کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا کہ وہ نہیں جانتی تھی کہ کوئی دوسری عورت اُس کے خاوند کے ساتھ ہے کہ نہیں؟ اُس نے پہلے صاحب جی کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُسے ایسا کرنا دل چسپ لگنے کے ساتھ مشکل بھی لگا اور اُس نے سوچا کہ وہ اپنی زندگی میں ہمیشہ مشکل کام ہی کرتی آئی تھی۔ وہ صاحب جی کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ یہ ایک عجیب قسم کا

تجربہ تھا۔ وہ خوف زدہ تھی کہ اگر اُس نے مڑ کے دیکھ لیا تو کیا جواب دے گی؟ وہ جس طرف جا رہا تھا وہ اُس علاقے سے واقفیت نہیں رکھتی تھی اور اگر صاحب جی نظروں سے گم ہو گیا تو کیا وہ واپس پہنچ پائے گی؟ وہ دکانوں، کھمبوں اور کھوکھوں کی نشانیاں رکھتے ہوئے صاحب جی کے پیچھے چلتی گئی۔ اب وہ شہر سے باہر تھے اور وہ تھکنا شروع ہو گئی تھی۔ سامنے ایک بڑی عمارت تھی جسے دیکھ کے وہ گھبرا گئی۔ عمارت کے اردگرد اونچی دیوار تھی جس کے پیچھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر عمارت اتنی اونچی تھی کہ اُس کی ہیبت دیوار کے اوپر سے بھی محسوس کی جا سکتی تھی اور پھر وہ خوف زدہ ہو کے پیچھے ہٹنے لگی اور اتنی دور ہو گئی کہ اُس کا خوف جاتا رہا اور وہ صاحب جی کے انتظار میں بیٹھ گئی۔

اُسے واپس جانے سے خوف تھا!

صاحب جی بڑے پھاٹک کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ہمیشہ کی طرح پھاٹک کے ایک طرف بنے شیشے کے کمرے میں سے ایک مشین کے چلنے کی گونج سنائی دی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اب کئی کیمروں کے سامنے تھا اور ہر زاویے سے اُس کی تصویریں بن رہی تھیں۔ وہاں کے ہر ملازم کی بھی اِسی طرح روزانہ تصویریں بنتیں، اُن تصویروں کی کمپیوٹر تصدیق ہوتی اور پھر شناخت کے اگلے مرحلے کا آغاز ہوتا۔ دسوں انگلیوں کے نشانات کی پڑتال ہوتی اور تب کہیں اُس گھر میں داخلے کی نوبت آتی۔ وہاں ہر آنے والے کی تفصیل موجود تھی لیکن پرکھ بھی ایک قانون تھا جسے توڑا نہیں جا سکتا تھا۔

صاحب جی جب اندر داخل ہوا تو اُس نے خود کو آزاد محسوس کیا۔ اُس کی نظر نے ہر طرف طواف کیا جیسے وہ ہر بار کرتا آیا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا، اُسے محسوس ہوا کہ پھول جو مست خرام ہوا کے سامنے جھک کے سیدھا ہو رہے تھے، اُسے اُداس لگے۔ وہ جس موسم میں بھی آتا، پھول اِسی طرح مسکرا کے اُسے خوش آمدید کہا کرتے آئے تھے۔ آج اُسے اُن مسکراتے ہوئے پھولوں کے چہروں پر اُداسی لگی۔ اُن کی اداسی اُسے کچھ پریشان ضرور کر گئی لیکن اُس نے فوراً ہی اُس اُداسی کی کینچلی کو جھاڑ گرایا۔ وہ اپنی پسندیدہ جگہ کی طرف چل پڑا۔ درختوں کا جھنڈ کچھ فاصلے پر تھا جو اُسے ہمیشہ ایک گھنا جنگل لگتا آیا تھا۔ وہ پرندوں کا شور سننے کے لیے بے چین ہو اُٹھا۔ یہ شور سنتے ہوئے اُسے محسوس ہوتا وہ اُس زمانے میں چلا گیا ہے جب انسان سوائے ہواؤں اور پرندوں کی آوازوں کے کسی شور سننے کا عادی ہی نہیں تھا۔ وہ دھیرے دھیرے، سہج سہج، چلتا جھنڈ کے قریب ہونے لگا اور پرندوں کا شور اُس کے کان

تک پہنچنے لگا۔ یہ شور کم اور اُن ہزاروں آوازوں کی گونج زیادہ تھی جو کانوں کے بجائے چھاتی میں محسوس ہوتی تھی۔ وہ جب جھنڈ کے قریب ہوا تو شور ایک دم تھم گیا۔ وہاں ایک گہری خاموشی تھی اور وہ اُس خاموشی کی کوکیں اپنے کانوں میں محسوس کر رہا تھا۔ اُسے یہ خاموشی فائر کے بعد کی ایک دہشت لگی۔ وہ خود بھی دہشت زدہ ہو کے پرشکوہ گھر کی طرف چل پڑا۔

وہ جب کمرے میں داخل ہوا تو وہ ہمیشہ کی طرح اُسی صوفے پر بیٹھی تھی۔ اُسے لگا کہ وہ وقت کی گرفت سے آزاد تھی۔ وہ دِن میں کئی مرتبہ آئینہ دیکھتا تھا اور اُسے یہ خبر تھی اپنی شکل میں کوئی واضح تبدیلی کبھی محسوس نہیں ہوتی کیوں کہ وہ شکل ہر روز دیکھی جاتی تھی، لیکن پھر بھی اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے چہرے میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ وہ صوفے پر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی اُسی طرح لگ رہی تھی جیسے اُس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ ہر بار وہ اُسے زیادہ باوقار لگی شاید یہی اُس کے چہرے پر وقت نے چھنڈا تھا۔ وہ اُسے دیکھ کے مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ اندرونی تھی۔ اُس کی آنکھیں اِس مسکراہٹ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

''اِس بار تم جلدی آ گئے۔'' وہ اُس کے سامنے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا۔

وہ اُسے دیکھتے ہوئے اُس کے پیچھے دیوار پر لگی سکرین پر باہر کا نظارہ بھی کر رہی تھی۔ کیمرے گھر کے ہر کونے کو سامنے لا رہے تھے۔ ''میں تو کچھ دیر سے آیا ہوں۔''

وہ مسکرائی۔ اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ اُس کی آنکھوں کے نیچے نہایت باریک جھریوں کی چند لکیریں اُبھر کے غائب ہو گئی ہیں۔ اُسے افسوس بھی ہوا کہ وہ جس نے کبھی بوڑھی نہیں ہونا تھا، شاید بوڑھی ہونا شروع ہو گئی ہے۔ وہ اُسے ہمیشہ کی طرح چھونا چاہتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اب وہ اصلی نہیں تھی۔ اُس کے سامنے جو عورت بیٹھی تھی وہ کوئی اور تھی اور جو اُس کے اندر تھی، وہ کوئی اور تھی۔ اُسے محسوس ہوتا کہ وہ دونوں کو جانتا ہے، کبھی وہ ایک کو جانتا ہے اور کبھی کسی کو بھی نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اُس نے اب کیا کہنا ہے!

''باقر! تم نے مجھے قیدی بنا کر ایک آزادی دے دی ہے۔'' یہ بیان باقر کے لیے ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا۔ ''میرا جسم یہاں قید ہو گیا ہے اور میں بغیر خواہش کے بن گئی ہوں۔'' باقر کے ذہن میں ملازمہ آ گئی جس کے اندر خواہش کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ ''اگر وہ نہ کیا جاتا جو کیا تو کیا ہوتا؟'' یہ

فقرہ پہلے کبھی نہیں کہا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ وہی باتیں کرتے آئے تھے جو ہر بار ہوتیں۔ باقر کچھ پریشان ہوا اور متجسس بھی۔ وہ چاہتا تھا کہ مزید کچھ کہا جائے اور یہ بھی چاہتا تھا کہ بات یہیں ختم ہو جائے۔

''اُسے کوئی بھی روک نہیں سکتا تھا۔'' باقر نے عاجزی اور دبو پن سے کہا۔

''تم چاہتے تو مجھے روک بھی سکتے تھے۔'' اُس کی آواز میں درشتی تھی۔

''میں کیسے روک سکتا تھا؟'' باقر نے اپنے غبار کو قابو کرتے ہوئے دبو پن میں ہی جواب دیا۔

''جس طرح میں نے قائل کیا تھا کہ ہم یہ کر گزریں۔'' اُس کی آواز میں شکایت تھی۔ باقر کو بات چیت کا یہ رُخ اچھا نہیں لگا۔ اُنھوں نے کبھی ماضی کو دہرایا نہیں تھا اور آج اُسے جیسے سب کچھ یاد آ رہا تھا جسے وہ اُس کے کہنے پر بھول چکا تھا۔ اُسے وہ کسی جنم میں واپس لے کر جا رہی تھی جہاں سے وہ لاعلمی میں ہی گزر چکے تھے۔

''تم زندگی میں ہمیشہ تجربے کرنے میں یقین رکھتی تھیں اور یہ بھی ایک تجربہ تھا۔ میں نے تجربہ کیا نہیں، تمھارا ساتھ دیا تھا۔'' باقر کی آواز میں ٹھہراؤ اور اعتماد کی دلیل تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ ماضی کو دہرانا چاہتی ہے تو وہ کیوں اُسے روکے؟ شاید وہ کسی طرح سکون حاصل کر سکے۔

''باقر! تم جانتے ہو کہ یہاں کچھ بھی اصلی نہیں۔'' اُس کی آواز میں کچھ ایسا بھاری پن تھا جسے وہ کبھی طنز سمجھا اور کبھی شکست۔ باقر نہیں چاہتا تھا کہ وہ شکست تسلیم کرے۔ باقر نے خالی نظر سے اُسے دیکھا۔ ایسا کیا تھا جو وہ جانتا نہیں تھا اور وہ اُسے بتانا چاہتی تھی؟ اُسے دوسری بار ملازمہ کا خیال آیا جو کچھ چھپاتی نہیں تھی اور نہ ہی ظاہر کرتی تھی، بس اپنے بدن کے پرت کھولے جاتی تھی۔ ''گیٹ کے اندر داخل ہونے کے بعد کچھ بھی وہ نہیں جو تم دیکھتے ہو۔ وہ پھول جو ہوا کے آگے جھکتے ہیں اصلی نہیں۔ میں یہاں سے ایک بٹن دباتی ہوں تو وہ ہلنا شروع کر دیتے ہیں۔'' پھر وہ ہنسی۔ اُس کی ہنسی میں خوشی، کامیابی اور غرور تھا۔ ''تم نے کبھی غور کیا کہ پھول اتنے سالوں سے اُتنے ہی ہیں۔'' وہ پھر ہنسی۔

''مجھے بیوقوف بناتی رہی ہو؟'' اُس نے ہنستے ہوئے شکایتاً کہا۔ باقر کو بیوقوف بنائے جانا پسند نہیں آیا لیکن وہ کوئی جھگڑا ابھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''نہیں ۔ میں نے زندہ رہنا تھا۔ یہ میری تفریح تھی۔تم نے کبھی پرندے اُڑتے ہوئے دیکھے ہیں؟ وہ تو بس شور کیے جاتے ہیں اور وہ موسیقی میں اکثر سنتی ہوں۔آج میں نے سوئچ آف کر دیا اور تم وہ سن نہیں سکے جو تمھیں پسند ہے۔''

باقر خاموشی سے کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا۔''جو ہم بن گئے ہیں یہ سب اُس کی توسیع ہے۔'' یہ سوال کے بجائے ایک بیان تھا۔اُس نے تیکھی نظر سے باقر کی طرف دیکھا اور پھر اُس کے چہرے پر لاتعلق قسم کا تاثر دیکھ کے مسکرا گئی

''میں چاہتی تھی کہ ہم وہ کریں جو ابھی تک نہ ہوا ہو۔اِسے حادثہ کہیں یا منصوبہ۔تم نے اپنے آپ کو بنجر کر دیا اور میں نے پلاسٹک سرجری سے اپنے آپ کو نئی عورت بنا لیا۔میں تم سے عمر میں بڑی ہوں لیکن پرکشش ہوں۔اِس کشش کی وجہ میرے جسم پر کی جانے والی پلاسٹک سرجری ہے۔'' وہ ہنسی۔''تم بنجر ہو گئے اور میں نے اپنا سب کچھ.....'' وہ خاموش ہو گئی۔

''ہم نے طے کیا تھا کہ ہم کبھی یہ بات نہیں کریں گے۔یہ تو خلاف ورزی ہوئی۔'' اب باقر کے لہجے میں جارحیت تھی۔

''خلاف ورزی نہیں،اچھے باقر!'' اُس کی آواز میں طنز تھا۔''یہ معاہدے کا اختتام ہے۔میں شاید ہار گئی ہوں۔میں نے جو کیا شاید مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ہم دوست تھے اور پھر ہم ایک معاہدے میں بندھ گئے۔میں یہ معاہدہ ختم کر رہی ہوں۔'' اُس نے لمبی سانس لی۔

''تمھارے کہنے پر میں نے اپنی زرخیزی ختم کروادی۔تم نے اپنے لیے بھی کچھ ایسا ہی کیا،بلکہ اِس سے بھی زیادہ۔اب معاہدہ رہے نہ رہے،کیا فرق پڑتا ہے۔'' باقر کی آواز میں دکھ تھا۔وہ اب خاموش تھا اور اپنے سامنے دیکھتا تھا کہ وہاں سے کیا جواب آئے۔سامنے بیٹھے جسم میں حرکت ہوئی اور ایک ریموٹ کے بٹن کو دبایا گیا تو باقر کے دائیں ہاتھ کی کھڑکی کھل گئی،ایک اور بٹن دبایا گیا تو پرندوں کی آواز سے کمرہ گونجنے لگا اور سبک خرام ہوا سے پردے ہلنے لگے۔

''میں ایک اور تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔'' اُس نے باقر کی طرف غور سے دیکھا۔باقر جانتا تھا کہ اُس نے اپنی عمر تجربوں کی نذر کر کے کچھ سے کچھ بن جانا قبول کر لیا ہے لیکن ابھی تک اُس کے تجربے ختم نہیں ہوئے۔وہ ہمیشہ کی طرح کچھ خوف زدہ بھی ہوا۔وہ جو بھی تجربہ کرتی اُسے ساتھ شامل

ہونا پڑتا۔ اُن کا رشتہ ہی کچھ ایسا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ زمین سے انسان ختم ہو جائیں اور یہاں دوبارہ ہر طرف جنگل ہی نظر آئیں۔ انسان زمین کا دشمن ہے اور اُس نے ایسے تجربات کا آغاز اپنے آپ سے کیا ہے۔ وہ اپنی جائداد بھی ایسے تجربات کی نذر کیے جا رہی تھی۔ ''تم میرے ہم خیال تو نہیں ہو لیکن ایک ایسے ضرورت مند جو مجھے پسند نہ کرتے ہوئے بھی پسند کرتے ہو کیوں کہ ہم ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ میں یہ سب بیچ دینا چاہتی ہوں۔ مجھے اِس کی بہت قیمت مل رہی ہے۔ یہاں جلد ہی چند کاروباری کمپلیکس تعمیر ہونا شروع ہو جائیں گے۔'' باقر ہمیشہ کسی ایسی ہی سوچ کی توقع رکھتا تھا۔

''یہ بیچ کے کہاں جاؤ گی؟''

''اسی طرح شہر سے باہر ایک شہر بساؤں گی جو جھگیوں کا ہوگا۔'' باقر کے ذہن میں فوراً ملازمہ آئی۔ وہ بھی ایک جھگی میں رہتی آئی تھی اور اُس نے کسی وقت ایک جھگی میں ہی واپس جانا تھا۔ ''میں اُن میں لوگوں کو آباد کروں گی۔ جو لوگ وہاں آئیں گے وہ اپنے بنجر ہونے کا سرٹیفکیٹ ساتھ لائیں گے۔ وہ لوگ وہیں رہیں گے لیکن بچے نہیں ہوں گے۔ زمین کو انسان سے پاک رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ انسان کی زرخیزی ختم کر دی جائے۔''

باقر کو اپنی زندگی کی محرومی کے اندر زندہ رہنا جیے جانے کا ایک بہانہ لگا تھا۔ کیا باقی لوگ اِس طرح زندہ رہنے کے طریقے کو قبول کر لیں گے؟ کیا ایسی سوچ کو ریاست اور معاشرہ قبول کر لے گا؟ باقر نے اپنی سوچ کہہ ڈالی۔ وہ دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ ''تم کہیں یہ تو نہیں سوچ رہے کہ جو میں کرنے جا رہی ہوں، یہ ایک انتقامی کارروائی ہے۔ چوں کہ میں نے ایک محرومی خود پر تسلط کر لی ہے اس لیے اب اِسے سب پر ٹھونسنا چاہتی ہوں۔''

''یہ بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ ایسا کرنے کے لیے چند سر پھرے رضا کار تو ڈھونڈے جا سکتے ہیں لیکن یہ شاید اجتماعی سوچ نہ بن سکے۔ زمین ہے ہی رہنے کے لیے، خالی خولی درخت کس کام کے۔ اگر پسند کرو تو جھگیوں میں یا تو رضا کار بساؤ اور یا یہاں، اپنی اِس جائداد پر نئی قسموں کے درخت develop کرنے کا کوئی ادارہ بناؤ جو ایسے درخت دریافت کرے جو زمین کے مزاج کو بدل دیں۔ تمھیں سرمائے کا مسئلہ تو ہے نہیں۔''

وہاں کچھ دیر خاموشی رہی!

وہ پرندوں کا شور ختم کر چکی تھی اور ہوا سے پردوں میں سرسراہٹ بھی نہیں رہی تھی۔ باقر کو وہ چپ ایک سوال لگی اور وہی سوال ایک جواب بھی۔ باقر کو یہ خاموشی اور اُس چپ میں سے اُٹھتی گونج کسی حد تک پریشان کر رہی تھی۔ وہ اب وہاں سے کچھ عرصے کے لیے چلے جانا چاہتا تھا۔ پہلے وہ یہاں سے اُٹھ کے اپنے گھر کی تنہائی میں جایا کرتا تھا اور اب وہاں ملازمہ اُس کی منتظر ہوتی ہے۔ وہ عورتوں کی صحبت بھول ہی چکا تھا، اُسے صرف تنہا رہنے کی عادت ہوگئی تھی۔ اُس کی خواہش رہی تھی کہ اُس کا میل ملاپ ایسی عورتوں سے ہو جن کی تعقلی سطح اُس کے برابر ہو مگر ایسی عورتیں اُسے مل نہیں سکیں، سو اُس نے تنہائی کو قبول کر لیا۔ اُسے حیرت ہوتی کہ وہ ایک کسے ہوئے بدن والی عورت، جو نیم اپاہج تھی اور جس کا بدن ہی اُس کا دماغ تھا، وہ اُس کے ساتھ زندگی سے حظ کیوں کر اُٹھانے لگا تھا؟ اگر وہ اُس کے پاس کام کی تلاش میں نہ آئی ہوتی تو! اُسے اپنے آپ سے ایک لمحے کے لیے مایوسی ہوئی اور پھر اُسے خیال آیا کہ کسے ہوئے بدن والی جاہل ملازمہ ڈھیلے جسم والی ہر دانش ور عورت سے بہتر تھی۔

باقر نے دیکھا کہ وہ سامنے بیٹھی اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ کیا وہ جان چکی تھی کہ وہ کیا سوچ رہا تھا؟ اُس نے اُسے ملازمہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کیوں کہ کسی عورت سے جنسی خواہش نہ رکھنا بھی معاہدے کا حصہ تھا جسے وہ توڑ چکا تھا۔ پیشتر کہ وہ کوئی سوال پوچھتی، وہ اُٹھ کے باہر کی طرف چل پڑا۔ اُن کے بیچ آنے اور جانے کے لیے خوش آمدی اور الوداعی کلمات نہیں کہے جاتے تھے۔

باقر جب پھاٹک سے باہر نکلا تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ ہمیشہ کی طرح باہر کی وسعت میں قید ہو گیا ہے اور اپنی آزادی اُس کمرے کی تنگی میں چھوڑ آیا ہے۔ وہ اب جلد از جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا تاکہ ملازمہ کی جاہلانہ گفتگو سنتے ہوئے دِن کے کھچاؤ کو دور کر سکے۔ اب اُسے سمجھ آ گئی کہ وہ ملازمہ کے ساتھ کو کیوں پسند کرتا ہے؟ اُس کے ساتھ بات چیت میں کوئی جھجک نہیں ہوتی۔

باقر ابھی تھوڑا ہی گیا تھا کہ ایک درخت کی اوٹ سے سروری اچانک اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ وہ اُسے اِس طرح اپنے سامنے کھڑے دیکھ کے پہلے پریشان، پھر ناراض اور پھر خوش ہوا کہ واپسی کا راستہ اُس کی ٹر ٹر سنتے ہوئے آسانی سے کٹ جائے گا اور اب وہ سمجھ پایا کہ یہی ٹر ٹر اُسے پسند تھی اور یہی ٹر ٹر اُس کی تنہائی کو نگل گئی تھی اور شاید تمام عمر وہ اسی ٹر ٹر کا متلاشی رہا تھا۔

''صاحب جی! گھر میں کیا کرتی؟ بس آپ کے پیچھے پیچھے آ گئی۔'' سروری نے جھوٹ بولا جسے باقر نے سمجھا تو سچ لیکن کوئی اہمیت نہ دی۔ ''میں نے سوچا کہ گھر میں اکیلے ہی بیٹھ کے انتظار کرنا ہے تو صاحب کی کچھ جاسوسی ہی ہو جائے۔'' وہ چہک رہی تھی اور باقر چلتے ہوئے اُس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف آواز ہی سن رہا تھا۔ ''صاحب جی! میں تو اُس عمارت کو دیکھ کے،'' اُس نے پیچھے کو مڑ کے اشارہ کیا، ''ڈر ہی گئی تھی۔ لوگ اتنی بڑی عمارتوں میں بھی رہتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جان اوپر والے کو دینی ہے، مجھے تو کئی بار اپنی جھونپڑی بہت کھلی لگتی تھی۔'' وہ چلتے رہے اور وہ بولتی رہی۔ اُس کی باتیں کبھی باربط ہو جاتیں اور کبھی بے ربط۔ وہ بولتی جاتی تھی اور باقر سنتے ہوئے بھی نہیں سن رہا تھا۔ سروری بولتے بولتے ایک دم خاموش ہو گئی۔ اُسے اپنی باتیں منافقت لگیں۔ وہ اپنے خاوند کے پاس کچھ گھنٹے گزارنے کے لیے گھر سے نکلی تھی تا کہ صاحب جی سے حاملہ ہو کے بچہ خاوند کے نام لگا دے۔ صاحب جی جیسے کھرے آدمی سے بے وفائی کرنا اور جھوٹ بولنا اُسے شرمندہ کر گیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بے وفا بھی ہے اور جھوٹی بھی لیکن صاحب جی کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے اُس نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی۔ اُس کی رفتار سست ہو گئی اور اُسے صاھب جی کے ساتھ قدم ملا کے چلنا اُن کی بے عزتی کرنا لگا۔ باقر اُس کی آواز سنتے ہوئے اپنی ہی کسی سوچ میں گم نہیں تھا اور سروری کی اچانک خاموشی سے اُسے ناگواری ہوئی۔ اُس نے مڑ کے غصے کے ساتھ سروری کی طرف دیکھا۔ باقر نے سروری پر کبھی غصے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ سہم گئی۔ اُس نے سوچا: صاحب جی ایک سچے آدمی ہیں اور وہ سچ کا کبھی برا نہیں منائیں گے۔

''صاحب جی! میں نے ابھی آپ کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔'' وہ اب باقر کے برابر آ گئی تھی۔ باقر کی ناگواری اور غصہ جاتے رہے تھے۔ اُس نے مسکرا کے سروری کی طرف دیکھا۔ سروری کو اُس مسکراہٹ میں اپنائیت محسوس ہوئی۔ اُس اپنائیت نے اُس کی مزید ہمت بندھائی۔ ''صاحب جی! میں آپ کے پیچھے دیکھنے آئی تھی کہ آپ کہاں جاتے ہیں۔ پھر میں نے اپنے خاوند کے ساتھ چند گھنٹے گزارنے تھے اور اُسی ملاقات میں ہونے والے کام کو بہانہ بنا کر آپ سے حاملہ ہونا تھا۔'' اُس نے چلتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ باقر کو سروری کا فقرہ دنیا کا اختتام لگا۔ ایک عورت نے اُس کے نظام سے زرخیزی ختم کروا دی تھی تا کہ دنیا کی آبادی نہ بڑھے اور ایک عورت اُس سے حاملہ

ہونا چاہتی ہے کہ دانیا کی آبادی بڑھے۔ باقر کو اپنی سانس رکتے ہوئے محسوس ہوئی۔ وہ ایک جالے میں اُلجھ گیا تھا جو دو مکڑیوں نے بُنا تھا۔ جب بھی کوئی کیڑا جالے میں اُلجھتا ہے، مکڑی اُسے کھا جاتی ہے، یہاں تو دو مکڑیاں تھیں۔ کیا وہ اُن کی خوراک بن گیا ہے؟ کیا وہ خود کو جالے سے نکال پائے گا؟

''حاملہ ہونا ضروری ہے؟'' باقر نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ اُس کے اندر کی کسی گہرائی سے آواز آئی: تم تو اُسے حاملہ کر ہی نہیں سکتے۔

''صاحب جی! میں تو ان پڑھ ہوں۔ آپ کی زیادہ باتیں میری سمجھ سے باہر ہوتی ہیں لیکن میں ایک عورت ہوں اور عورت ہمیشہ بچہ گود میں اُٹھا کے چھاتی کے ساتھ لگانا چاہتی ہے۔ جس طرح آپ مجھے اپنی چھاتی کے ساتھ لگائے رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک عورت اپنے چاہنے والے کی معشوق ہونے کے ساتھ ماں بھی ہوتی ہے..... معشوق کم اور ماں زیادہ۔ میں بھی آپ کو ماں کی طرح ہی سنبھالتی ہوں۔'' سروری کی آواز میں ممتا کا بھاری پن اور ریشمی ملائمت تھی۔ وہ رک گئی۔ باقر کو لگا کہ وہ اُس کے ساتھ چمٹ جائے گی۔ وہ سروری کی آنکھوں میں محبت کی نرماہٹ دیکھ سکتا تھا۔ اُسے اپنے پر ترس آیا۔ کیا اُسے ماں کی ضرورت تھی؟ اب جب کہ وہ باپ بننے کے قابل نہیں رہا تھا تو کیا وہ اُس کی ماں بن سکتی تھی جب کہ دونوں رنگین راتیں گزار چکے تھے؛ وہ ایک مکمل عورت اور وہ خود ایک ادھ ادھورا مرد۔ نہیں وہ آدمی اور عورت ہی ہیں۔

''تم میرے ساتھ رہ رہی ہو۔ اِس سے آگے نہ کچھ سوچو اور نہ ہی کچھ ہے۔'' باقر نے سختی کے ساتھ کہا۔

سروری نے ایک لمبی سانس لی اور چل پڑی۔ باقر کو اپنے سخت لہجے پر افسوس ہوا اور وہ تلافی کے لیے کچھ نرم اور کچھ خوشامدانہ الفاظ کہنا چاہتا تھا لیکن مصلحت کے تحت خاموش ہی رہا۔ ''اِس کے باوجود ہمارے کئی رشتے ہیں اور رہیں گے۔'' اب وہ بھاری قدموں کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ باقر ،اُسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اگر ماں بننا چاہتی تھی تو اُسے ایسا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونا چاہیے لیکن وہ باپ نہیں بن سکتا۔ وہ اگر اپنی مرضی سے اپنے آپ کو بنجر نہ کر چکا ہوتا تو بھی شاید باپ نہ بنتا کیوں کہ وہ کسی کے ساتھ ایک عہد کر چکا تھا۔ وہ جو خوب صورت ہوا کرتی تھی اور اُس نے اپنی خوب صورتی ختم کروا دی کہ کسی کو اُس میں کشش نہ رہے لیکن وہ اپنی آنکھیں تبدیل نہیں کر سکی تھی جن سے وہ پر کشش

مردوں کو دیکھ سکتی تھی جس کے نتیجے میں اُس نے اپنا سب کچھ ہی بدلوا ڈالا، اب وہ کچھ بھی نہیں رہ گئی تھی۔

وہ اب گھر پہنچ گئے تھے۔ گھر کی پناہ میں باقر نے خود کو محفوظ محسوس کیا۔ وہ مضمحل اور بے دل سے گھر میں موجود ہوتے ہوئے موجود نہیں تھے، باقر کی سوچ کئی راستوں پر پرواز کرتی تھی اور سروری کے ذہن میں بچہ تھا۔ اُسے ایک بچہ چاہیے تھا اور وہ بھی صاحب جی سے؛ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اُسے اپنے بچے کی ماں نہیں بنانا چاہتا کیوں کہ غریب ماں کا بچہ امیر باپ کے گھر میں بھی غریب ہی رہتا ہے۔ اُسے پہلی مرتبہ صاحب جی کے امیر ہونے اور اپنی غربت پر غصہ آیا اور دکھ ہوا۔

''صاحب جی! آپ ہاں کیوں نہیں کرتے۔ مجھے کچھ نسخے آتے ہیں جن سے میں کاڑھے بناؤں گی اور ہم دونوں چند ہی دنوں میں ایک بچہ بنالیں گے۔ اگر آپ چاہیں تو میں پھر کہیں چلی جاؤں گی۔ محبت ایک سزا ہوتی ہے جو میں کاٹ لوں گی۔'' باقر ایک سکتے میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سروری فوراً چلی جائے اور اُسے پوری زندگی کے لیے ساتھ لگا کے رکھنا بھی چاہتا تھا۔ اُسے اپنے اعصاب میں کپکپی کا احساس ہوا۔ اُسی وقت باہر گھنٹی بجی۔ وہ دونوں چونک اُٹھے۔ باقر نے جب گھر بنوایا تو گھنٹی لگوائی ضرور تھی لیکن وہ ایسی مجرد زندگی گزار رہا تھا کہ کبھی کوئی ملاقاتی نہیں آیا تھا۔ سروری باہر جانے لگی تو باقر اُسے اشارے سے روک کر باہر گیا اور کچھ دیر مردانہ آوازیں آتی رہیں۔ پھر قدموں کی آواز اور باقر کے ساتھ سروری کا خاوند تھا جس کی گود میں ایک بچہ تھا جو اپنا انگوٹھا چوس رہا تھا۔

''ملازمہ! یہ تمھیں دینے آیا ہے۔ اِس کی ماں اِسے چھوڑ کے بھاگ گئی ہے۔''

وہاں خاموشی تھی اور سکون کی متلاشی بے چینی!

دروازہ کھلنے تلک

وہ گاؤں کی سب لڑکیوں سے مختلف تھی یا گاؤں کی کوئی بھی لڑکی اُس جیسی نہیں تھی!
کوئی بھی اُسے خوب صورت ماننے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن جب بھی اُسے دیکھتا اُس کی خوب صورتی کی تاب نہ لاسکتا۔ اُسے ایک الگ ڈھب سے بنایا گیا تھا اِسی لیے وہ سب سے مختلف تھی، اتنی مختلف کہ ہر کوئی اُس سے خائف تھا۔ اُس کا جب جی چاہتا وہ اپنے گھر سے نکل پڑتی۔ اُسے کسی کا خوف، ڈر یا کسی قسم کی جھجک نہیں تھی اور موسموں کا معتدل یا شدید ہونا اُس کے لیے غیر اہم تھا۔ وہ کسی کو نظر بھر کر نہیں دیکھتی تھی، اِس لیے نہیں کہ اُسے نظر بھر کے دیکھنے سے کسی قسم کا کوئی خوف تھا لیکن جسے دیکھ لیتی اُس کے لیے چوفیر لٹو کی طرح ایک دائرے میں گھومتا لٹو نظر آتا جس کی ڈوری اُس کے ہاتھ میں ہونی تو چاہیے تھی لیکن وہ اُسے گنوا چکا تھا۔ اُس کے پیچھے کوئی نہ کوئی چل رہا ہوتا۔ پیچھے چلنے والے اُس کے گھر کا حدود اربعہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ سب ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ گاؤں اتنا چھوٹا تھا کہ کسی سے کسی کے متعلق کچھ بھی چھپا ہوا نہیں تھا، وہ سب ایک ہی خاندان کا تسلسل لگتے لیکن وہ اُن سے مکمل طور پر مختلف تھی۔
اُس کے پیچھے چلنے والا اُس کی چال میں گم چلتا ہی جاتا۔ اُس کی چال میں کیا تھا؟ یہ کوئی بھی سمجھ نہیں پایا تھا لیکن ہر کسی کو جاننے میں جنون کی حد تک دل چسپی تھی۔ وہ جب چلتی تو نہ ہی وقت ٹھہرتا اور نہ ہوائیں اُس کی تقلید میں چلتیں، وہ ایسے چلتی کہ کسی نے کسی اور کو ایسے چلتے ہوئے نہیں دیکھا

تھا۔ نہ وہ رواں چلتی، نہ ایویا اور نہ ہی شتری، وہ تو بس سیدھا سا اپنے ہی طریقے سے چلتی، ایسی چال جس میں زندگی کا ہر پہلو نہاں ہوتا اور ہر کوئی اُسے عیاں کرنے کی فکر میں رہتا۔ وہ زمین پر ہی چلتی تھی لیکن محسوس ہوتا کہ وہ زمین کے کچھ اوپر، اپنی ہی موجودگی سے پیدا کیے گئے خلا میں تیرتی ہوئی چلی جارہی ہے۔ اُس کے پاؤں ہوتے تو زمین پر لیکن وہ اپنے ہی خلا میں چل رہی ہوتی۔ اور جب وہ رکتی؟

وہ جب رکتی تو نہ وقت ٹھہرتا اور نہ ہی زمین اپنی گردش بھولتی جس کے نتیجے میں آنے والا بھونچال وہاں ہوتا ہی نہیں تھا۔ وہ جب رکتی تو محسوس ہوتا کہ وہ کبھی چلی ہی نہیں تھی۔ وہ ایسے کھڑی ہوتی جیسے چلنا آتا ہی نہ ہو اور اُس کے پیچھے آنے والا سوچتا: اُس کی چال میں وہ سحر کہاں جو اُس کے قیام میں ہے۔ وہ کھڑی ہوتی تو اُس کا قد اور بھی دراز لگتا اور دراز قد میں چھپا وقار اُسے ایسی انفرادیت دیتا جو کہیں نہیں تھا۔ وہ جب کھڑی ہوتی تو اُسے اپنے اردگرد کی کوئی خبر نہ ہوتی؛ وہ چلتے ہوئے بھی بے خبری میں چلتی رہتی۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہاں سے وہ کئی بار گزر چکی تھی: لیکن بے خبری میں۔

وہ ایک بڑا پھاٹک تھا اور پیچھے ایک محل نما گھر۔ پھاٹک کو ایک بھاری تالہ لگا ہوتا تھا اور سوائے چند لوگوں کے کسی نے پھاٹک کے اندر کبھی جھانکا نہیں تھا۔ اُس گھر کے مکین کسی کو الوداع کہے بغیر کہیں چلے گئے تھے۔ کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کہاں گئے تھے لیکن سب کے علم میں تھا کہ وہ کیوں گئے ہیں؟ وہ اپنے گھر سے معمول کی طرح نکلی۔ اُس کا گھر سے نکلنے کا کوئی معمول نہیں تھا۔ وہ جب چاہتی گھر سے نکل پڑتی۔ کوئی اُس سے سوال نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کہاں جارہی ہے؟ سب جانتے تھے کہ وہ کہاں جارہی تھی؟ وہ گھر سے نکل کے کسی بھی طرف جاسکتی تھی، یہ چھوٹا گاؤں اُس کے لیے کوئی رکاوٹ یا پابندی نہیں تھی۔ وہ گاؤں سے باہر بھی نکل جاتی تھی لیکن جُو سے باہر کبھی نہیں گئی تھی۔ ایسے محسوس ہوتا کہ گاؤں کی جُو کے گرد پٹواری کی کھینچی ہوئی لکیر کا اُسے علم تھا اور وہ اُس لکیر کو کبھی پار نہ کرتی کیوں کہ اُس لکیر کے پار وہ محفوظ نہیں تھی۔

وہ اُس بڑے پھاٹک کے سامنے کھڑی تھی اور اُس پھاٹک پر ایک بھاری تالہ لگا ہوتا تھا۔

محل نما گھر کئی سالوں سے خالی تھا۔ کہا جاتا آیا ہے کہ خالی گھروں میں خالی پن ایک عرصے تک مکینوں کا انتظار کرتا ہے اور پھر اُس مخلوق کو آنے کی اجازت دے دیتا ہے جو کسی کو نظر نہیں آتی۔ اس گھر میں ایسی کوئی مخلوق نہیں آئی، وہاں پرندوں نے بسیرا کر کے قبضہ کرلیا تھا۔ اگر پرندے وہاں نہ

آتے تو شاید وہ مخلوق وہاں آجاتی جو ویرانیوں پر قابض ہوتی ہے۔ وہاں پرندے تھے، اُن کی پرواز تھی اور اُن کا شور تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہاں پرندوں کی کتنی نسلیں پرورش پا چکی تھیں۔

وہ اُس بڑے پھاٹک کے سامنے کھڑی تھی جہاں اب تالہ نہیں لگا ہوا تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہاں تالا لگا ہوا کرتا تھا۔

اُس نے بڑے سارے کنڈے کو دیکھا اور اُسے اچانک اندر جانے کی خواہش ہوئی اور اُس کے اندر ایک زندہ متجسس ہستی نے پھاٹک کھول کے اندر جھات لینے کے لیے اُکسایا۔ وہ پھاٹک کو کھول کے اندر داخل ہوئی تو صحن اتنا کھلا تھا کہ آدھا گاؤں اُس میں آباد ہو سکنے کی گنجائش تھی۔ سامنے ایک لمبا برآمدہ تھا جس کے فنِ تعمیر نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ اُس کے تھموں کے غور سے دیکھتی رہی۔ یہ اُس کے لیے ایک عجوبہ تھا۔ وہ روزانہ گاؤں کی گلیوں میں چکر لگاتی اور کھیتوں کی پگ ڈنڈیوں پر دیر تک گھومنے کی عادی تھی اور وہاں وہ سب وہی دیکھتی جسے روزانہ دیکھنا اُس کا معمول تھا۔ برآمدہ اُس کے لیے ایک حیرت کدہ تھا۔ وہ وہاں کھڑی اُسے دیکھتی جاتی تھی، اپنے آپ سے بھی بے خبر۔ تبھی برآمدے میں سے جنگلی کبوتروں کی ایک ڈار اُڑی اور وہ اُس سے بے نیاز ایک چکر کاٹ کے واپس اپنی جگہوں پر بیٹھ گئی۔ اُن کے واپس بیٹھ جانے کے بعد ایک شور بلند ہوا جس کی طرف اُس نے کوئی توجہ نہیں دی اور پھر طوطوں کی ایک ڈار برآمدے میں سے اُڑی۔ وہ اُڑتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔ اُن کے گلے میں چوڑی گانی تھی اور وہ گونگے نہیں تھے اِسی لیے اُن کے شور کا طریقہ مختلف تھا۔ ایک ڈار چڑیوں کی اُڑی اور اُن کا اپنا شور تھا جسے اُس نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ وہ پرندوں کی آمد و رفت میں اتنا مگن تھی کہ اُسے کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ برآمدے کے پیل پایوں سے جب اُس کی نظر ہٹی تو اُسے اپنے دیکھنے پر یقین نہیں آیا۔ اُس کے سامنے ایک دراز قد آدمی کھڑا تھا جس کا بدن چھریرا اور رنگت صاف تھی۔ اُس کا چہرہ گول اور آنکھیں عینک کے شیشوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں۔ اُس کے بال کنپٹیوں سے سفید ہوتے ہوئے اوپر جا رہے تھے اور سر پر سیاہ بالوں کی لہریں اُس کی شخصیت کو وقار دے رہی تھیں۔ اُس نے جب محسوس کیا کہ وہ آدمی اُسے دیکھ کے مسکرا رہا ہے تو آدمی کی مسکراہٹ اُس کے اپنے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ چھوڑ گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے جاتے تھے اور مسکراتے جاتے تھے۔

''تمھیں پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا؟'' اُس کی نظروں نے سوال کیا۔

آدمی اب مسکرا نہیں رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ سکڑ کر سیٹی بجانے کے آسن میں تھے جو لڑکی کو خاصا مضحک لگا۔

''میں یہاں تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہوں۔ مجھے تم نے سب سے پہلے دیکھا ہے۔'' آدمی کے ہونٹ اب سیٹی بجانے کے آسن میں نہیں تھے۔ جس طرح لڑکی کی نظروں کی زبان آدمی کی نظروں کے کانوں نے سن لی تھی ایسے ہی یہ آواز بھی لڑکی کے کانوں تک پہنچ گئی۔

اب دونوں ہی مسکرا نہیں رہے تھے۔

''تم یہاں کیوں آئے؟''

''یہ میرا گھر ہے۔''

تمھارا گھر ہے تو پھر گئے کیوں؟'' لڑکی کے اِس سوال کی جیسے اُسے توقع ہو۔ آدمی نے ایک نظر گھر کو دیکھ کے لڑکی کی طرف واپس دیکھا۔

''ہر کوئی اپنے گھر سے ایک بار جاتا ہے۔''

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں واپس آنے کے لیے گیا تھا۔ میرے دوسرے لوگ واپس نہ آنے کے لیے گئے تھے۔'' آدمی نے آہ بھری۔

''وہ کون لوگ تھے؟''

''میرے والدین!''

''وہ واپس کیوں نہیں آئے؟''

''اس لیے کہ وہ وہاں چلے گئے ہیں جہاں سے واپس نہیں آیا جاتا۔''

لڑکی نے ایک آہ بھری تو آدمی نے جلدی سے اُس کی طرف دیکھا۔ ''جو اللہ کو منظور۔ ہر کسی نے وقت پر جانا ہے۔'' پھر خاموشی۔

''یہ گھر تو بہت بڑا ہے۔ یہاں کیا ہوتا تھا؟'' لڑکی نے اردگرد دیکھا۔ وہ پرندوں کے شور سے بے نیاز تھی۔

''یہاں لوگ رہتے تھے۔'' آدمی کی آواز میں طنز تھا۔ ''کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ بے آباد ہو جائے گا لیکن پھر یہاں کے رہنے والے ہی اِسے بے آباد کر گئے۔ سب دنیا میں پھیل گئے۔'' لڑکی نے حیرت سے آدمی کی طرف دیکھا جیسے اُسے اُس کی ذہنی صحت پر شک ہو۔

''میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ اتنے بڑے گھر میں رہا جا سکتا ہے۔''

آدمی مسکرایا۔ اُس کی مسکراہٹ میں محبت اور برتری کی مٹھاس تھی۔ ''یہ بڑا گھر ہمیں چھوٹا لگا کرتا تھا۔ آج یہاں کھڑے ہوئے یہ بہت ہی بڑا لگ رہا ہے۔'' لڑکی نے فوراً آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے کھڑے آدمی کی خود اعتمادی اور تکبر سے خوف زدہ ہو گئی۔ ''اگر وقت پیچھے چلا جائے اور ہم سب اکٹھے ہو جائیں تو یہ پھر چھوٹا ہو جائے گا۔'' آدمی کی آواز میں سچائی کی عاجزی تھی۔

''تم یہاں رہو گے؟''

''ہاں!''

''کیسے؟''

''جیسے رہتے ہیں۔'' آدمی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور لڑکی جھینپ گئی۔ ''یہاں ہی سب رہتے تھے اور پھر سب یہاں سے چلے گئے اور میں اب واپس آیا ہوں۔'' لڑکی نے پھر آدمی کی طرف دیکھا۔

''یہاں رہو گے؟ یا پھر چلے جاؤ گے؟''

''رہوں گا۔''

''اکیلے؟''

''ہاں۔''

کھاؤ گے کیسے؟''

''وہ بعد میں دیکھوں گا۔ پہلے تو چاہوں گا کہ پرندے یہاں رہیں۔ میں نہیں چاہ میرے آنے سے یہ اِس جگہ کو چھوڑ جائیں۔'' لڑکی کو پہلی بار پرندوں کی موجودگی کا احساس ہو اُنھیں برآمدے میں سے باہر جاتے اور کچھ کو اندر آتے ہوئے دیکھنے لگی اور آدمی اُس کی محویت لطف اندوز ہونے لگا۔

''کچھ ہو ہی جائے گا۔'' وہ رکا۔ ''کھانا کیا ضروری ہے؟''

''زندہ نہیں رہنا؟''

''کیا زندہ رہنا ضروری ہے؟''

لڑکی کو یہ سوال عجیب اور ناقابل فہم لگا۔ وہ آدمی کو غور سے دیکھنے لگی۔ اُسے اپنے سامنے کھڑے آدمی میں وہی تکبر نظر آیا جو بھینسوں کے ریوڑ میں اکلوتے سانڈ میں ہوتا ہے۔ سانڈ ایک ایسی بے نیازی سے چلا کرتا ہے جیسے وہ اکیلا ہی چل رہا ہو۔

''زندہ ہیں تو ہم آمنے سامنے کھڑے ہیں۔'' آدمی اُس کے ماتھے پر ناگواری کی لکیریں شناخت کر گیا۔ اُسے لڑکی کا یہ جارحانہ انداز پسند بھی آیا۔

''تم کیا کرتی ہو؟'' آدمی نے اُسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ اُس کے دیکھنے میں اتنی شدت تھی کہ وہ جھینپ گئی۔

''گلیوں، وٹوں اور بنوں پر گھومتی ہوں۔'' اُس نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

''تم کیا کرتے ہو؟''

''میں شہروں میں گھومتا ہوں۔''

''ایک ہی بات ہے۔'' لڑکی مسکرا رہی تھی۔

''پرندے تو خوش ہیں۔ تم آئے ہو اِس لیے؟''

''شاید روز ایسے ہی ہوتے ہوں۔''

''بھوک تو نہیں لگ رہی؟ کچھ کھاؤ گے؟ مجھے یہ پہلے پوچھ لینا چاہیے تھا۔''

آدمی خاموشی سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ لڑکی پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔

''کچھ کھاؤں گا۔ بھوک لگنا شروع ہوگئی ہے۔ تم نہ کہتیں تو شاید نہ ہی لگتی۔''

''میرے ساتھ گھر چلو۔ میرا گھر گاؤں کے درمیان میں ہے۔''

''میں نے ابھی اپنا گھر کھولا بھی نہیں۔ اندر کچھ ہوگا بھی کہ نہیں۔ میں پہلے گھر پر ایک نظر نہ ڈال لوں؟'' آدمی کو لگا کہ وہ سچ نہیں بول رہا۔ اُسے کھانے سے زیادہ دل چسپی باتیں سننے میں تھی۔ اُسے ہمیشہ ہی باتیں سننا پسند رہا تھا۔ اُسے لڑکی کی باتوں میں ریشم کے اندر لپٹا ہوا کھر دراپن محسوس ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ لڑکی باتیں کرتی جائے۔

''نظر تو بعد میں بھی ڈالی جا سکتی ہے۔ پہلے پیٹ پوجا۔'' لڑکی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ کچھ دیر قہقہے میں چھپے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ کوئی ایسا پیغام نکالنے میں ناکام رہا جو اُس بے ساختہ قہقہے میں نہاں ہو۔

''ٹھیک ہے پہلے پیٹ پوجا۔'' اب کے آدمی نے قہقہہ لگایا اور لڑکی نے چونک کے اُس کی طرف دیکھا۔ اُسے لگا کہ آدمی پنہاں میں کچھ عیاں کرنے کی کوشش میں ہے لیکن اُسے شرمساری بھی ہوئی کہ آدمی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

''چلو پھر۔ پہلے پیٹ پوجا۔'' وہ گلی میں جا کھڑی ہوئی اور باہر نکلنے سے پہلے اُس نے ایک نظر گھر کے صحن اور برآمدے پر ڈالی۔ ارد گرد بیٹیں، پرندوں کے پر اور گھونسلوں سے گرے ہوئے انڈوں کے چھلکے اور تنکے بکھرے ہوئے تھے۔ بوٹوں کو چیونٹیاں چمٹی ہوئی تھیں اور لڑکی کو ابکائی محسوس ہوئی۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی اور آدمی پھاٹک بند کر کے اُس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ لڑکی ایک خواب کی کیفیت میں چلتی گئی۔

لڑکی جب اپنے گھر میں داخل ہوئی تو وہ بوٹوں، انڈوں کے چھلکوں اور چیونٹیوں کو بھول چکی تھی اور اُس کے ذہن میں آدمی کو پیٹ پوجا کروانا تھا۔ اپنا تنگ اور ناہموار صحن دیکھ کے اچانک اُسے آدمی کے گھر کا برآمدہ اور صحن یاد آ گئے۔ وہ صحن ایک طویل عرصے سے صاف نہیں کیا گیا تھا لیکن پھر بھی صاف تھا سوائے برآمدے کے نزدیک مرے ہوئے بوٹوں اور انڈوں کے چھلکوں کے۔ اُس نے اپنی ماں کو دیکھا جو ہمیشہ کی طرح چولھے کے پاس بیٹھی تھی۔ لڑکی نے ہاتھ کے اشارے سے ماں کو اپنی طرف متوجہ کیا جس کا اُس کی ماں نے برا منایا۔ ماں کا غصہ اُس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ماں کو ہمیشہ چولھا جلانے میں دقت ہوتی ہے اور جب آگ سلگانے کا وقت ہوتا وہ گھر سے نکل جاتی۔ اب چولھا تو جلا ہوا تھا لیکن اُسے ماں کے غصے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ اُسے بھی ماں پر غصہ آیا۔ ماں کو سمجھنا چاہیے کہ اُس کے ساتھ ایک مہمان ہے لیکن اُس نے اپنا طریقہ وہی رکھا۔ اُس نے پھر ماں کو اشارے سے متوجہ کیا۔

''گونگی! جب جی کرتا ہے گھر سے بھاگ جاتی ہو؟ کوئی ایسا ویسا کچھ ہو گیا تو ہم کسی کو منہ دکھانے جوگے بھی نہیں رہیں گے۔ اوپر والا شکل اچھی بنانے کے بجائے زبان دے دیتا تو میں ابھی تک

جوان ہوتی۔'' لڑکی اپنی ماں کے لہجے سے اُس کے اِلفاظ کی زبان سمجھتی تھی۔ ماں جب بھی کسی کے سامنے ایسے لہجے میں بات کرتی تو اُسے ہمیشہ ہی شرمندگی ہوتی۔ لڑکی نے تیزی کے ساتھ مڑ کے پیچھے دیکھا تو صحن خالی تھا، وہ بھاگ کے دروازے میں آئی اور اُس نے باہر دیکھا تو گلی تاحدِ نظر خالی تھی!

تسلسل

رات کی چُپ ڈرا رہی تھی۔ اِس خوف کو دور کرنے کے لیے پاؤں پٹخ کر چلنا یا گلا صاف کیے جانا ضروری تھا۔

شام کے بعد، اندھیرا ہونے سے پہلے، تیز ہوا چل رہی تھی اور عام خیال یہی تھا کہ ہوا آندھی میں بدل جائے گی اور رات کے آخری پہروں میں کہیں سے بادل لا کر صبح سے پہلے پہلے بارش کرادے گی مگر ہوا تو کنجوس کے دامن کی طرح ایک دم سمٹ گئی۔ درخت سر جھکا کر کھڑے ہو گئے جیسے پہلا جرم کرتے ہوئے پکڑے جانا والا معصوم شہری، اور گلیوں میں سے ہوا کی گزرتی سیٹیاں، اپنی آواز سے گھبرا کر خاموشی میں چھپ گئی ہوں۔

چوکیدار کی وِسل، ڈنڈے کو زمین پر پٹخنے اور ''جاگدے رؤ'' کی آواز گاؤں سے دور بھی سنی جاسکتی تھی۔ تیز ہوا کے چلنے کی وجہ سے بجلی بند ہو گئی تھی۔ گاؤں کی بجلی کا شروع دن سے یہی دستور تھا؛ تیز ہوا ہو یا بادل بننا شروع ہو جائیں، بجلی فوراً بند اور تب تک بحال نہ ہوتی جب تک بادل یا ہوا کا نام ونشاں رہتا۔

وہ بیس برسوں کے بعد گاؤں جا رہا تھا۔ اُس کے پیروں کے نیچے پکی سڑک تھی، جب وہ گیا تھا یہ ایک کچا راستہ تھا۔ اُس نے سفر میں کئی بار سوچا کہ شاید اُسے پچھتاوا ہو لیکن اُس کا ضمیر کبھی ملامت نہ کرتا۔ وہ اُن بیس برسوں میں اپنے ضمیر کو جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اُسے خواب میں ڈوبی یا

نیند سے اُٹھنے کے بعد جاگنے کی کیفیت میں آنے سے پہلے والی آواز تک سنائی نہ دی۔ یہ خاموشی اُسے سہارا دیتی اور وہ سوچتا کہ اُس نے جو کیا شاید درست ہی تھا۔

جب اُس نے واردات کرنے کا سوچا تو اُسے حیرت ہوئی کہ وہ یہ کس سکون اور لاتعلقی سے سوچ رہا تھا۔ خان محمد اُس کا چھوٹا بھائی کم اور دوست اور ساتھی زیادہ تھا۔ ہمیشہ دونوں مل کر چوری کی وارداتیں کیا کرتے تھے۔ آج تک اُس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ خان محمد کے اندر کیا کمال تھا جو کتے اُسے دیکھتے ہی بھونکنا بند کر دیتے اور وہ مداری کی طرح حویلی کی دیوار پر چڑھ جاتا اور کچھ عرصہ وہیں بیٹھا رہتا کہ اندر سے کوئی ردِعمل ہو۔ جب کوئی نہ للکارتا تو وہ آہستہ سے نیچے کود جاتا۔ یہ اُس کے اپنے لیے حویلی کے دروازے کے سامنے پہنچنے کا اشارہ ہوتا۔ خان محمد بھینس یا گائے اور اگر گھوڑی ہوتی تو یقیناً اُسے کھونٹے سے کھول کر لے آتا کیوں کہ گھوڑی تو خود اپنی چور ہوتی ہے اور ایک رات میں کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ بھینس یا گائے تو سست رفتاری کی وجہ سے خطرہ ہوتے اور اُن کی کوشش ہوتی کہ دن چڑھنے پہلے پہلے وہ واردات کی جگہ اور اپنے درمیان میں اتنا فاصلہ ڈال لیں کہ کھوجی ایک دن میں اُن تک پہنچ نہ سکیں۔

خان محمد اور وہ کسی مجبوری کے تحت چوری نہیں کرتے تھے، دراصل چوری کرنا اُن کے ہاں ایک دستور تھا۔ اُن کا ہر قریبی اور دور کا رشتے دار چور تھا اور چوری نہ کرنا اُن کے لیے ایک طعنہ تھا۔ چوری خون کی طرح اُن کی شریانوں میں چل رہی تھی۔ وہ اگر رات کہیں مہمان ٹھہرتے تو اُس گاؤں سے بھی ایک آدھ ڈھور کھول کر چلتے بنتے۔

وہ کامیاب چور تھے۔ اُن کا دور دور تک ایک سلسلہ تھا۔ وہ چوری کے مویشی کسی طے شدہ گاؤں تک پہنچاتے جہاں اُنھیں فارغ کر دیا جاتا اور وہ یا تو واپس لوٹ جاتے اور یا کہیں اور چوری کرنے نکل جاتے۔۔ایسی وارداتوں کے دوران میں ایک دفعہ گھر والے جاگ گئے اور وہ تو بھاگنے میں کامیاب ہو گیا جب کہ خان محمد کو پکڑ لیا گیا اور لوگوں نے اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔

چوری اکیلے آدمی کا کام نہیں تھا۔ خان محمد اور اُس کے اپنے بچے ابھی چھوٹے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کسی اور آدمی کے ساتھ مِل کر اب اُس نوعیت کی وارداتیں نہیں کر سکے گا۔ اُس نے اپنی زمین سنبھال لی۔ خان محمد کے سسرال والوں نے اُس کی بیوی کی کہیں شادی کر دی اور اُس کے دونوں بچے

اُس کی تحویل میں آ گئے۔ زندگی اب اُس کے لیے گرمیوں کی دو پہر میں طویل اور پُر پیچ سفر کی طرح تھی۔ اُسے ہر قدم پر نئے موڑ کا سامنا تھا اور جب وہ موڑوں کا شمار کرتا تو اُسے لگتا کہ وہ نقطہء آغاز سے آگے جا ہی نہیں سکا۔ وہ کسی سایے میں فوراً دم لینے کے لیے بیٹھ جاتا۔ آرام کرنے کے اِن وقفوں میں اُسے یہ خیال آنے لگا کہ وہ جب بھی اپنی سوچ کے اخلاقی پہلوؤں پر غور کرتا تو اُسے کوئی قباحت محسوس نہ ہوتی۔ یہ وہ دن تھے جب اُس نے خان محمد کے بچوں کو قتل کر کے زمین پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اُس نے سوچا کہ دس ایکڑ میں سے پانچ تو اُن کو مل جائیں گے اور کیا پانچ ایکڑ اُس کے تین بیٹوں کے لیے کافی ہوں گے؟ اُس نے دس سال چوری کی تھی اور ہل چلانے کے لیے بیلوں کی جوڑی بھی نہیں بنا سکا تھا جب کہ اُس کے کئی رشتے داروں نے ٹریکٹر خرید لیے تھے اور اُن کی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ اُس کے اندر اُن سب کا مقابلہ کرنے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ سوچتا کہ زمین زیادہ کر کے ہی وہ اُن کا مقابلہ کر سکتا ہے اور ایسا کرنے کے لیے اُسے خان محمد کے بچوں کو قتل کرنا ہی ایک ذریعہ نظر آتا۔ وہ جب یہ سچ رہا ہوتا تو قانون اور سزا کبھی اُس کے ذہن میں نہیں آئے۔ یہ اُس کے لیے ایسا واقعہ تھا جس نے کوئی ایک شکل دھار کر رونما ہو جانا تھا۔ وہ بچے اُسے اپنے دشمن لگنے لگے اور وہ اُن کے لیے اذیت ناک موت کے طریقوں پر سوچنے لگا۔ قتل جنون کی طرح اُس کے ذہن پر سوار ہو گیا۔ اُس کی حالت آندھی آنے سے پہلے والے موسم کی ہو گئی جب ہر طرف ایک خلا بن جاتا ہے اور خاموشی اعصاب پر بھاری گزرنے لگتی ہے، تب دور اُفق سے گرد و غبار اُٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔

اُس نے بیوی اور بچوں کو اپنے سسرال بھیج دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنی تمام تر نفرت کے باوجود اُس کے لیے آخری وار کرنا اِتنا آسان نہیں ہوگا چناں چہ وار کرنے کی طاقت کے لیے اُسے شراب کی ضرورت تھی۔ اُس نے پہلے پُور کی ایک بوتل حاصل کی۔ گولی چلانے سے ارد گرد فوراً اطلاع ہو جانے کا امکان تھا اِس لیے اُس نے بچوں کو ذبح کرنے کا فیصلہ کیا۔ ذبح کرنے کے لیے چھری بہت تیز دھار کی ہونا چاہیے تھی تاکہ ایک ہی جھٹکے سے شاہ رگ کٹ جائے۔ اُس نے ریتی اور ٹکورے سے چھری کو اتنا تیز کیا کہ دھار پرکھتے ہوئے اُس کی اپنی انگلی کٹ گئی۔ اُس نے پہلے لڑکی کو ذبح کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے سن رکھا تھا کہ مادہ میں اپنا دفاع کرنے اور زندہ رہنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے، اور ویسے بھی وہ عمر میں چھوٹی تھی۔ لڑکے کے مزاج میں باپ والی اطاعت تھی اور اُس کی شاہ رگ کاٹنا مسئلہ نہیں ہونا

تھا۔اُس نے شراب پی اور نشے نے اُس کی نفرت کو دوبالا کر دیا۔کم سنوں کے گلے کٹ گئے اور شاہ رگ کٹی لاشیں کر یہہ لگ رہی تھیں۔لاشوں کو دیکھ کر اُس کے اندر دبی نفرت کہیں دم توڑ گئی۔شراب کا نشہ اُترنے لگا اور اُسے اچانک تھکاوٹ کا احساس ہوا۔جس رات خان محمد پکڑا گیا تھا،اُس رات وہ لگا تار ایک ہی رفتار سے بھاگتا رہا تھا۔دوپہر کو جب اُس کی آنکھ کھُلی تو وہ مکئی کے کھیت میں درخت کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا،اُس کا گلا خشک ہو رہا تھا اور تمام جسم تھکاوٹ سے درد کر رہا تھا۔اب جو کمرے میں اُس کی آنکھ کھُلی تو وہ لاشوں کے پاس دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا،گلا خشک کانٹا تھا اور جسم تھکاوٹ سے چور۔اُسی وقت اُسے قانون کے افعی کی شوکر سنائی دینے لگی۔اُسے پھانسی کا تختہ اور رسی کمرے میں ہر سو نظر آرہے تھے۔لگ رہا تھا کہ اُس کی گردن لمبی ہوگئی ہے اور زبان منہ سے باہر لٹک رہی ہے۔خوف کے مارے اُس کا جسم کانپنے لگا۔اُس کی پیاس اور تھکاوٹ جاتی رہی۔لاشوں کو کہیں ٹھکانے لگانا ممکن نہیں تھا؛اگر یہ پہلے سوچا ہوتا تو اُنھیں صحن میں دفن کر دیتا۔اب دن نکل آیا تھا اور اُسے فوری طور پر کچھ کرنا تھا۔چوری کے دنوں میں اکثر مقدموں کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔وہ جانیا تھا کہ مدعی اگر بیان میں تبدیلی لے آئے تو تو مقدمہ کمزور ہو جاتا ہے اور ملزم کے بری ہو جانے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔قتل اُسی کے گھر میں ہوا تھا اور مدعی بھی گھر سے ہونا چاہئے تھا۔اُس نے اپنی بیوی کو مدعی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

تفتیش مکمل ہونے کے بعد وہ دو سال جیل میں رہا اور اُس کے بعد مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔اُس نے قتل کرنے سے پہلے قانونی معاملات کو اہمیت نہیں دی تھی اور اُس کی حالت اُس زمین دار کی تھی جس کے کھیت کو پانی تو لگا ہوا ہو لیکن پانی لگانے سے پہلے اُس نے سیریں بند نہیں کی ہوں۔اب جدھر سے سیر پھوٹتی،وہ اُسے بند کرتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔

اُسے کی پھانسی کی سزا نہیں ہوئی۔چودہ سال جیل میں کاٹنے کے بدلے میں پانچ ایکڑ کی ملکیت بُرا سودا نہیں تھا۔اُس نے جیل کا زمانہ قانون کی حدود کے اندر رہتے ہوئے گزارا۔اُسے کئی جیلوں میں منتقل کیا جاتا رہا۔اُس کی کبھی ملاقات نہیں آئی تھی اور نہ ہی اُس نے کسی کو خط لکھا تھا۔اُس کا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ اُس کی بیوی اور بیٹے اُسے بھول چکے ہیں لیکن اُسے اِس بات کا دُکھ نہیں تھا۔اُس نے اپنی اولاد کے شریک ختم کر دیے تھے اور آج وہ کسی حد تک محفوظ اپنے گھر جا رہا تھا۔

وہ گاؤں کے باہر بیٹھ گیا۔ گاؤں اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی اور وہ اِس میں گاؤں کو سانس لیتے محسوس کر سکتا تھا۔ وہ وہاں بیٹھا خوشی محسوس کر رہا تھا اور اُسے کسی حد تک خوف سا بھی تھا کہ آیا اُسے گاؤں میں قبول کیا جائے گا یا نہیں! جب اُسے گرفتار کیا گیا تھا، ہر کوئی اُسے غصے، جارحیت، ناپسندیدگی اور لاتعلقی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی ایک چہرے پر اپنے لیے تھوڑی ہمدردی، اپنے مقصد کی تائید یا سالہا سال کی رفاقت کا عکس ڈھونڈنے کی کوشش میں تھا۔ اُسے اپنے اندر گاؤں کے لیے نفرت اور بے گانگی کا احساس پیدا ہوتے محسوس ہوا تھا۔ اُس کی چھاتی تن گئی تھی اور وہ اپنے آپ کو اپنے قد سے اونچا محسوس کر رہا تھا۔ اُسے لگا تھا کہ وہ بونوں کے درمیان میں کھڑا ہے۔

بجلی آ گئی اور ایک دم گاؤں روشنی میں نہا گیا۔ وہ جہاں بیٹھا ہوا تھا روشنی، وہاں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اُس نے سوچا، اگر چوکیدار اُس طرف آیا تو اُسے وہاں بیٹھے دیکھ کر للکارے گا۔ وہ کسی کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ وارداتوں میں اُس نے سیکھا تھا کہ روشنی اور اندھیرے کا سنگم سب سے محفوظ جگہ ہوتی ہے، چناں چہ وہ روشنی اور اندھیرے سے پیدا ہوئے سائے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

اُسے محسوس ہوا کہ وہ گاؤں سے ڈر رہا ہے۔ وہ خوف کی وجہ ڈھونڈنے لگا؛ کیا اِس کی وجہ اخلاقی تھی یا جیل حکام کی اطاعت نے اُسے بزدل بنایا ہوا تھا؟ اُس وقت وہ اِس حالت میں نہیں تھا کہ کسی قسم کے تنازعے میں اُلجھ جاتا۔ وہ یہ سب اپنے بیٹوں پر چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اُسے خیال آیا، وہ جوان ہو گئے ہوں گے اور اُسے اپنی ذمے داری سمجھتے ہوئے اُس کا دفاع کریں گے۔

وہ علی الصبح چلنے والی ہوا کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ وہ پرانا پاپی تھا اور جانتا تھا کہ اُس وقت کتے بھی تھک چکے ہوتے ہیں۔ اُسے وہاں بیٹھے بیٹھے نیند آ گئی اور جب اُس کی آنکھ کھلی تو سست رو ہوا اُس کے اردگرد سرسراتے پھر رہی تھی۔ اُسے حیرت ہوئی کہ اُس نے کئی سالوں سے اپنی بیوی کو یاد نہیں کیا؛ صرف پانچ ایکڑ ہی اُس کی سوچوں کا حصہ بنے رہے تھے۔ اب اچانک اُسے خیال آیا کہ وہ شاید بوڑھی ہو گئی ہو گی! کیا وہ بھی بوڑھا ہو گیا ہے؟ اُس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو کئی دنوں کی کھردری سی ڈاڑھی کے کانٹے ہتھیلی کو چبھے۔ وہ اُداسی سے مسکرایا اور بیوی کا چہرہ اُس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ جس وقت اُسے سزا سنائی گئی تھی، اُس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر سکون تھا۔ وہ کیفیت آج اُس کی سمجھ میں آئی تھی؛ وہ قدرے خوش تھی کہ اُس کی جان بچ گئی۔ اُس نے اِس مرتبہ

پریشانی سے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔اُسے بیوی سے ملاقات کے امکان نے کسی حد تک بے چین کر دیا۔اُسی وقت چوکیدار کے ڈنڈے کی زمیں پنخ اور ''جاگدے رؤ'' کی آواز نے اُس کے خیالات کی ڈوری کو توڑ دیا۔اُسے لگا کہ چوکیدار نے اپنا پھیرا پورا نہیں کیا اور وہ گاؤں کے کنارے تک آنے سے پہلے ہی واپس مڑ گیا تھا۔وہ جانتا تھا چوکیداروں کی اِسی غفلت کی وجہ سے وہ کامیاب وارداتیں کیا کرتے تھے۔جیسے ہی چوکیدار کی آواز دور ہونا شروع ہوئی، وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔زیادہ دیر تک ایک آسن میں بیٹھے رہنے کی وجہ سے اُسے چکر سا آ گیا اور متلی محسوس ہوئی۔اگلے ہی لمحے وہ اپنے آپ پر قابو پا چکا تھا۔وہ آہستہ آہستہ چلتے گلی میں داخل ہوا۔گلی کے آخیر میں اُس کا گھر تھا۔اُس نے تکلیف دہ پریشانی کے ساتھ سوچا کہ وہ گھر سے اتنا نزدیک ہونے کے باوجود اِتنی دور بیٹھا رہا تھا!وہ جانتا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد اُس کی بیوی جاگ جائے گی.یہ اُس کی عادت بن چکی تھی۔یہی وہ وقت ہوا کرتا تھا جب وہ اور خان محمد گھر لوٹا کرتے تھے اور وہ دیوار کے اوپر سے گلی میں جھانکا کرتی تھی۔وہ ایک دیوار کے سایے میں رُک گیا۔کیا وہ اُس وقت گھر جائے جس وقت وہ گلی میں جھانکا کرتی تھی؟اور پرانی یادوں میں ڈوبی، تھکی ہوئی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

اُس نے کچھ دیر چوکیدار کی آواز کا انتظار کیا۔ہر طرف خاموشی گونج رہی تھی، وہ سمجھ گیا کہ چوکیدار سو گیا ہے۔یہ جلد جاگنے والوں کا وقت تھا اور اچانک اُسے کسی کا خوف نہ رہا۔وہ اپنے گھر جا رہا تھا۔کئی برس پہلے اُس نے جرم کیا تھا جس کی اُس نے سزا کاٹی اور آج وہ ایک بے گناہ آدمی تھا۔

وہ گھر کی طرف چل پڑا۔اُس کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا جیسے ابھی کوئی باہر گیا ہو یا کسی کے اندر داخل ہونے کے لیے کھول دیا گیا ہو۔صحن میں خالی چارپائیوں پر بستر بچھے ہوئے تھے۔اُس نے دروازے میں کھڑے ہو کر اندر دیکھا، اُس کی بیوی دیوار کے ساتھ کھڑی گلی میں جھانک رہی تھی۔وہ تیزی سے آ کر اُس کے سامنے رُک گئی۔کچھ دیر وہ خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔پھر وہ بولی:

''لڑکے ابھی تک آئے نہیں۔موبائل بجا تھا، مطلب کہ آنے ہی والے ہیں۔''

اُسے اپنے دن یاد آ گئے اور خان محمد کی یادوں کے بوجھ کی وجہ سے اُس کے لیے کھڑے رہنا محال ہو گیا!

مرزا کا گھر

مرزا کا گھر کھلا، دل بڑا اور دستر خوان وسیع تھا۔ بیٹھک میں ہر شام وہاں آنے والے اکھٹے ہونا شروع ہو جاتے۔ یہ اکٹھ گرمیوں میں شام سات بجے اور سردیوں میں چھ بجے سے شروع ہوتا۔ مرزا نے شام کی اِن محفلوں کے لیے ایک الگ کمرہ رکھا ہوا تھا۔ کبھی کبھار مرزا کو ذاتی یا خاندانی مجبوریوں کی وجہ سے شہر سے باہر بھی جانا پڑتا لیکن اُس کی غیر حاضری میں بھی سب اکٹھے ہو کے اپنی محفل برپا رکھتے۔ وہاں ایک میز پر گرم پانی سے بھرے دو بڑے تھرموس، پیالے، چمچ، ٹی بیگ اور خشک دودھ پڑے ہوتے، ایک کونے میں فرج تھا جس میں پانی کی بوتلیں ہوتیں اور ساتھ پڑی میز پر درجن بھر گلاس رکھے ہوتے۔ دوسرے کونے میں ایک سنک تھی جس میں پیالے یا گلاس دھوئے جاتے۔ مرزا چوں کہ شوگر کا مریض تھا اِس لیے سب کو پھیکی چائے پینا پڑتی۔ چائے میٹھا کرنے کا طریقہ زیادہ خشک دودھ ڈالنا تھا۔ پورے دس بجے کھانے کا اعلان کیا جاتا اور یہ خبر دینے کے لیے وہ دروازے میں سے جھانک کے شرمائی ہوئی آواز میں کہتی: کھانا تیار ہے۔ جن لوگوں نے اپنے گھروں میں کھانا کھانا ہوتا وہ رخصت لے کے چلے جاتے اور باقی ساتھ والے کھانے کے کمرے میں داخل ہو جاتے۔ یہ کوئی پُر تکلف دعوت نہیں ہوتی تھی؛ اُبلے ہوئے چاول، دال، کسی قسم کا سالن، چپاتیاں اور کسی دِن میٹھا ہوتا۔ وہ گفتگو جو کھانا لگ جانے کے اعلان کے ساتھ منقطع ہو گئی تھی کھانے کے دوران میں پھر شروع ہو جاتی۔ مرزے کی بیٹھک میں آنے والے کسی خاص نظریے سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی مرزا کا اپنا

کوئی نظریہ تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ لوگ اُس کے پاس آئیں، اُس کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوں اور اگلے دِن وہاں ہونے والی بحث کا شہر میں چرچا ہو۔ مرزا کی کوئی سیاسی وابستگی بھی نہیں تھی۔ اُس کے پاس بائیں اور دائیں بازو کے انتہاپسند، روشن خیالی میں یقین رکھنے والے، دونوں انتہاؤں کے بیچ درمیانی راستے پر چلنے والے، غیر نظریاتی لوگ، صنعت کار، سرمایہ دار، دکان دار اور دانشور جن میں شاعر، فکشن نگار مصور اور گلوکار شامل تھے، آتے۔ وہاں مباحث ہوتے لیکن کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا تھا۔ مرزا کی کرسی مخصوص تھی اور کبھی کوئی اُس کرسی پر نہیں بیٹھا تھا۔ جب اِن محفلوں کا آغاز ہوا تو چند ایک نوجوانوں نے اُس کرسی پر بیٹھنا چاہا اور وہ چند ایک مواقعوں میں سے تھا جب مرزا نے اپنی شدید ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اُنھیں اُٹھ جانے کو کہا۔

مرزے کا باپ ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا اور اُس کی اپنے محلے میں کریانے کی چھوٹی سی دکان تھی۔ اُس کا اُٹھنا بیٹھنا اُن لوگوں کے ساتھ تھا جن کی شہرت اچھی نہیں تھی اور نہ صرف محلے والے، مرزے کے گھر کے افراد بھی اُس کے اُن کے ساتھ تعلق کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چوں کہ بڑا مرزا ایک سخت مزاج آدمی تھا کسی نے براہِ راست کہا نہیں لیکن یہ تعلق سب کو کھٹکتا تھا۔ پھر یہ تعلق ایک دم ختم ہوگیا۔ تعلق کے اِس اختتام پر کئی ایک افواہیں یا قصے مشہور تھے لیکن کوئی بھی اِن کے سچے ہونے کی تصدیق نہیں کرسکا۔ عام خیال یہی تھا کہ مرزا جوئے میں اُن کی آخری پائی تک جیت گیا تھا اور وہ چوں کہ جرائم کی دنیا کے پیشہ ور کھلاڑی تھے، اُنھوں نے اپنی ہار اپنی دنیا کا معمول سمجھا، وہ جیت بھی سکتے تھے، اِس لیے وہ دوبارہ کبھی دیکھے نہیں گئے۔ مرزا کے باپ نے کرائے پر لی ہوئی دکان خرید لی اور میونسپل کارپوریشن میں اپنے نو حاصل شدہ سرمائے میں سے کچھ خرچ کر کے محلّہ میں کسی اور دکان کا کھولے جانا غیر قانونی طے کروالیا اور اِس طرح اپنی اجارہ داری کا آغاز کیا۔ یہ ایک طویل سفر تھا جو اُس نے تیز رفتاری سے طے کیا اور جلد شہر میں ڈیپارٹمینٹل سٹور کھولنا شروع کردیے۔ مرزا اُس کی واحد اولاد تھی جسے اُس نے کاروبار میں ڈالنے سے پہلے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اُس کے باپ کو اپنی زندگی میں یہی ایک کمی محسوس ہوتی تھی جو اپنے بیٹے میں پوری کردی۔ مرزے نے جب کاروبار سنبھالا تو اُس نے اپنی جدت پسندی سے ڈیپارٹمینٹل سٹوروں کو ایک نیا رُخ دیا۔ اکاؤنٹ سے لے کے سیلز تک کا تمام عملہ لڑکیوں پر مشتمل کردیا۔ ہر سٹور میں چند میزوں کی کوفی شاپ کھول دی جہاں کبھی جگہ خالی نہیں رہتی

تھی۔ اپنے سلاٹر ہاؤس کھولے جہاں گھر کے تیار کیے گئے بکروں کا گوشت بنایا جاتا اور بکروں کے ریوڑوں کے لیے دیہات میں جدید طرز کے بکر خانے بنائے۔ یہ بھی ایک طویل سفر تھا اور مرزا نے اپنے باپ کی طرح اِسے بھی تیز رفتاری کے ساتھ طے کیا۔

مرزا نے جب شام کی محفلوں کے آغاز کا فیصلہ کیا تو اُس نے سب سے پہلے میرے ساتھ مشورہ کیا۔ آگے چلنے سے پیشتر یہ بتا نا دینا ضروری ہے کہ مرزے نے میرے ساتھ مشورہ کیوں کیا؟ جن دنوں میں مرزے کے باپ کی کریانے کی دکان تھی تو ہم دونوں اکٹھے گھوما کرتے تھے۔ میرے گھر کے مالی حالات اُس سے قدرتے بہتر تھے اور دِن کا ایک کھانا وہ ہمارے ہاں ضرور کھاتا۔ مرزا مجھے بھی اپنے ہاں کھانا کھلانا چاہتا لیکن میری ماں کی طرف سے ایسا کرنے پر سخت پابندی تھی۔ ماں کو میرے مرزے کے ساتھ گھومنے پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اُس گھر میں کھاؤں جہاں کی کمائی میں مکمل حلال شامل نہ ہو۔ مرزا کبھی کبھار ضد بھی کرتا کہ اُس نے میرے لیے خصوصی طور پر کھانا بنوایا ہے اور مجھے اُس کا دِل توڑتے ہوئے تکلیف بھی ہوتی لیکن میں ماں کی بات کو کسی حد تک غلط بھی نہیں سمجھتا تھا۔ سکول سے چھٹی کے بعد ہم سارا دِن گلیوں میں گھومتے۔ مرزا شلوار کی طرز پر پائجامہ پہنے ہوتا اور اُس کے پاؤں میں مچھلی کی شکل کے سیاہ رنگ کے سلیپر ہوتے جو ایڑھی پر سے گھس جانے کی وجہ سے آدھا نمبر چھوٹے محسوس ہوتے۔ میں بستہ گھر میں رکھ کے فوراً اپنی نیکر قمیص اور پی ٹی شوز پہنتا۔ گرمیوں کی جلتی ہوئی دوپہروں میں مرزا کی ماں ہمیں گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتی تھی۔ میں یہ وقت اُس کے ساتھ گزارنے کو ترجیح دیتا کہ میری ماں دوپہر کو سوتی نہیں تھی۔ وہ ایک گھسا ہوا کرتا پہن کے پنکھے کے نیچے بیٹھے دوپہر گزار دیتی تھی اور ہمارے لیے گھر سے نکلنا مشکل ہوتا تھا۔ مرزا کی ماں ہمیں باہر نہ جانے کا حکم دے کے خود سو جاتی اور ہم وہی کرتے جو ہمیں کرنا چاہیے تھا۔ اُن دوپہروں میں بھی ہمیں بیٹھک میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ وہاں متواتر دبی دبی بھاری قسم کی مردآوازیں آتی رہتیں اور ایک دِن میں نے مرزا سے اُن آوازوں کے متعلق پوچھا تو پہلے اُس کا رنگ زرد ہو گیا اور پھر اُس نے کہا کہ اُس کے باپ کے کوئی مہمان چند دِن ٹھہرنے کو آئے ہوئے تھے۔ مجھے لگتا کہ وہ مہمان تو چند دنوں کے بجائے وہاں مستقلاً آباد تھے۔ محلے میں کریانے کی دکان ملازم چلاتا تھا اور شام کو مرزا کا باپ ایسی تفصیل سے حساب لیتا کہ ملازم کے چھکے چھوٹ جاتے۔ مرزے کے

باپ کو دکان میں پڑی ہر چیز کی تعداد اور قیمت زبانی یاد تھی اور کوئی ملازم بھی اُسے دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔

مرزا کی ماں جب سو جاتی تو ہم اپنے مشن پر نکلتے۔ وہ عجیب قسم کی بے راہ روی کے دِن تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ کون سی عمر رسیدہ عورتیں ٹانگیں دبوانا پسند کرتی ہیں اور ہم ٹانگیں دباتے کسی خفیہ جگہ تک پہنچ جاتے جس کے لیے ہمیں گالیاں تو بہت دی جاتیں لیکن نہ ہی گھر سے نکالا جاتا اور نہ ہی شکایت لگا دینے کی دھمکی پر کبھی عمل درامد ہوتا۔ ہمیں معلوم تھا کہ کون سے گھروں کے لوگ دوپہروں کو گھوڑے بیچ کے سوتے ہیں، ہم اُن گھروں کی باہر لگی گھنٹیاں دباتے یا کُنڈیاں کھڑکاتے اور جیسے ہی دروازہ کھولے جانے کی آواز آتی تو ہم وہاں سے ہٹ جاتے۔ ہمارے اوسان اُس وقت تک خطا رہتے جب تک ہمیں یقین نہ ہو جاتا کہ کوئی ہمارے پیچھے نہیں آرہا۔ اُس پکڑے جانے کے خوف کے انتظار میں اتنی لذت تھی کہ میں آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔

ایک دِن مرزے کی بیٹھک سے آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ مجھے حیرت تو ہوئی لیکن میں نے پوچھا نہیں۔ اگلے دِن بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور مرزا کی ماں نے ہمیں وہاں جا کے کھیلنے کو کہا۔ مجھے اِس حکم نامے سے ایسی خوشی ہوئی کی بیان سے باہر تھا۔ کمرہ اُسی طرح تھا۔ عورت کے لمس کا کہیں سے بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ کمرے کو پرانے انداز میں دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی۔

مرزے کا باپ اب دکان پر بیٹھنے لگا اور کچھ عرصے کے بعد وہاں سامان میں بڑھوتری ہونے لگی۔ اب محلے والوں کو قدرے مہنگے سودوں کے لیے دوسری جگہوں پر نہیں جانا پڑتا تھا، سب کچھ اُن کی اپنی دکان میں واجبی سی کم قیمت پر میسر تھا۔

مرزے کو اب حکم ملا کہ وہ مجھ سے دور ہو جائے۔ مرزا یا میں ایک دوسرے سے دور نہیں ہو سکتے تھے۔ اُس چھوٹی سی عمر تک ہم اتنے کچھ کی ساجھے داری کر چکے تھے کہ ہمارے لیے ایک دوسرے کو چھوڑنا ممکن نہیں تھا۔ اب ہم سکول سے غایب ہو جاتے اور اپنے محلے میں گھومنے کے بجائے ساتھ والے محلے میں وقت گزارنے لگے۔ شاید یہ گلیوں میں گھومنا اور لوگوں کے بارے میں جاننا ہی مرزا کے گھر میں بپا ہونے والی مجلسوں کا پیش خیمہ تھا۔

اچانک حالات نے ایک نئی کروٹ لی۔ مرزا کے باپ نے محلے والی دکان بند تو نہ کی لیکن

شہر کے ایک جدید علاقے کے پلازے میں سٹور کھول لیا جس میں ہر قسم کے گاہک کی ضروریات موجود تھیں۔ اُس نے ہر وقت سر پر کروشیئے کی بنی ہوئی ٹوپی پہننا شروع کر دی اور پابندِ نماز ہو گیا۔ اچانک اُس کا شمار شہر کی اشرافیہ میں ہونے لگا اور مرزا کو محلے کے سکول سے اُٹھا کر ایک مشہور انگریزی سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ مرزا کے سکول کی یونیفارم ہی ایسی تھی کہ مجھے اُسے ملتے ہوئے احساسِ کمتری ہونے لگا لیکن اُس کے ہونٹوں پر وہی میٹھی مسکراہٹ ہوتی جو آنے والی زندگی میں اُس کا نشان بن گیا۔ ہم اب بھی پرانے تعلق کی طاقت پر ایک دوسرے سے ملتے اور ہمارے بیچ کوئی جھجک یا دوری کبھی در نہیں آئی لیکن پھر بھی مجھے ایک ایسی دوری کا احساس ہوتا جو ہمیں تقسیم کیے جا رہی تھی گو ہم دور نہیں تھے۔ وہ جب اپنے سکول کی باتیں سناتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میں جواب میں کیا سناؤں؟ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک کے جاہ طلب لوگوں نے باہر جا کے قسمت آزمانا شروع کر دیا۔ میں نے بھی اِس سلسلے میں ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے۔ مرزا کو میری اِن کوششوں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا اور میں سوچا کرتا کہ اگر میں کسی طور اُس کی شمولیت قبول کر لیتا تو مجھے شاید اتنی بھاگ دوڑ نہ کرنا پڑتی۔ میرے اندر شاید اُس کا مقابلہ کرنے کا مخفی قسم کا جذبہ سر اُٹھانے لگا تھا۔ میں اُسے کسی بھی طرح شکست نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اِس کے ساتھ ہی اُس کی برتری بھی ختم کرنا چاہتا تھا۔

مرزے کے باپ کے پاس راتوں رات کہاں سے اتنا پیسہ آ گیا؟ گو لوگ قیافہ آرائی ختم کر چکے تھے لیکن سب اُسے بھولے نہیں تھے۔ میں جب یورپ گیا تو اپنے شہر کا جو بھی رہائشی ملتا تو پیچھے کے حالات پر تبادلہ ضرور ہوتا۔ میں نے کبھی کسی کو مرزے کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن میری کوشش ہوتی کہ اُن کا ذکر نہ آئے۔ اُس ذکر کو روکنا میرے لیے ممکن نہیں ہوتا تھا اِس لیے میں ہاں میں ہاں ملائے جاتا اور ذاتی علم کو افواہوں کا حصہ بنا کر اپنی رائے دیتا۔ وہاں عارضی قیام کے لیے آئے ہوئے لوگ مغرب کے احتسابی عمل کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائے ہوتے۔ میں جانتا تھا کہ یہ لوگ واپس وطن جاتے ہوئے قطار میں لگ کے ہوائی جہاز میں سوار ہوتے ہیں کیوں کہ ایسا کرنا مغرب کا دستور تھا اور یہی لوگ اپنے ملک میں یہاں کے دستور اور رواج کے مطابق اُترتے ہیں۔ میں مرزے کے باپ کی شب بھر میں اپنے کاروبار کو بامِ عروج پر لے جانے کی حمایت نہیں کر رہا لیکن میں اُسے رد بھی نہیں کر رہا کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہاں جانے کے بعد بھی مجھے اپنے شہر

سے گئے لوگوں کی زبانی اُن کے بارے میں خبریں ملتی رہتیں جنھیں بتانے والے اُن کے زوال کے خواست گار تھے اور میں ایسا چاہتے ہوئے بھی ایسے نہیں چاہتا تھا۔ میں جب بھی ایسی گفتگو سنتا تو میرے اندر ایک انتقامی آگ سلگنے لگتی جس میں مرزوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ میں اُن لوگوں کو شکست دینا چاہتا تھا جن کے اپنے معیار غیر قانونی بنیادوں پر استوار تھے۔ اُن کی اکثریت وہاں ناجائز طریقوں سے آئی تھی اور اُنھیں مرزے جیسے لوگوں کی کامیابی کھلتی تھی کیوں کہ مرزوں نے ملک میں غیر قانونی ذرائع سے اُنھیں شکست دے دی تھی۔

میں وہاں قانونی طریقے سے گیا تھا اور میری جمع کی ہوئی رقم بھی جائز تھی۔ میں جب وطن لوٹا تو میرے پاس کافی رقم تھی لیکن وہ اتنی بھی نہیں تھی کہ میں مرزے کا مقابلہ کر سکتا۔ جس گلی میں ہمارا گھر تھا وہ اتنی چوڑی تھی کہ اُس میں سے کار گزر سکتی تھی۔ میں جب یہاں سے گیا تھا تو تب اتنی چوڑی نہیں لگا کرتی تھی کیوں کہ کئی گھروں کے سامنے بھینسیں بندھی ہوتی تھیں جو اپنے جسم کی وجہ سے گلی کو تنگی دیتی تھیں۔ مرزا کا گھر اگلی میں تھا اور میں نے ایک رات کسی جاسوس کی طرح وہاں کا چکر لگایا۔ اُن کا گھر اندھیرے میں تھا اور گھر کے اردگرد سے بے آبادی کی بو اُٹھ رہی تھی۔ دکان پرانی جگہ پر ابھی تک قائم تھی اور اُس پر لگا ہوا "مرزا اینڈ فیملی" کا بورڈ مجھے وہی لگا جسے میں بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ میرے گھر کے ساتھ پانچ مرلے کا ایک گھر تھا جس کے رہائشی لاہور چلے گئے تھے اور اُنھیں ہمارے چھوٹے سے شہر میں واپس آنے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ مجھے اُس گھر میں دل چسپی تھی اور میں نے کسی کی معرفت اُسے خرید کر وہاں کار پورچ اور ایک چھوٹا سا لان بنا لیا جس میں امریکن گھاس لگا دی۔ جب لان مکمل طور پر سبز ہو گیا تو میں نے مرزے سے رابطہ کیا۔ وہ مجھے مل کر اتنا خوش ہوا کہ میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ زندگی میں اکیلا ہے اور اُس کا کاروبار ہی اُس کا ساتھی تھا۔ اور جیسے ایسی ملاقاتوں میں ہوا کرتا ہے، ہم گلیوں میں آوارہ پھرنے والے بچے بن گئے اور جو باتیں بھول چکے تھے اُنھیں یاد کر کے کبھی قہقہے لگاتے اور کبھی اشک بار ہو جاتے۔ اُس کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹا ملک میں نہیں تھا اور اُس نے آہ بھر کے بتایا کہ وہ آنا بھی نہیں چاہتا۔ اُس نے وہیں شادی کر لی تھی اور وہ ہر سال اپنے خاندان کے ساتھ کچھ دِن ٹھہرنے کے لیے آتا۔ مرزے نے بتایا کہ اُسے بھی بیٹے میں ایسی دل چسپی نہیں تھی کہ وہ اُس کے لیے اُداس ہوتا۔ بیٹیاں اچھے خاندانوں میں آباد تھیں اور اُنھیں اپنے

باپ کی جائداد میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ میں نے ایک دِن مرزے کو اپنے گھر بلایا اور وہ اُس پرانی گلی کو خاموش کھڑا کچھ دیر دیکھتا رہا۔ اُس کے ذہن میں جو طوفان وجود پا رہا تھا میں اُس سے واقف تھا۔ ہم دونوں خاموش کھڑے رہے جیسے کسی عزیز کی لاش کے پاس کھڑے ماضی میں گم ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک دم وہ ''ریوری'' سے باہر آیا اور اپنی موجودگی ظاہر کرنے کے لیے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔ ہم جب گھر میں گئے تو ہر طرف پھیلی خاموشی اُسے اجنبی لگی۔ میرے والدین بھی اُس کے والدین کی طرح اوپر جا چکے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ اردگرد میری بیوی یا بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں نے شادی نہیں کی اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اُس کے لیے ایک صدمہ تو تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اُس نے صرف اتنا ہی کہا کہ وہ ہمیشہ میری حقیقت پسندی کا قایل رہا ہے۔ جس سے میری اپنے ایک ہم خیال سے ایک اہم ملاقات ہوئی۔

میرے گھر میں ہونے والی چند ملاقاتوں میں مرزا کے گھر میں برپا کی جانے والی محفلوں کا فیصلہ کیا گیا!

مرزا اکثر شام کو مجھے ملنے آتا اور ہم اندھیرا ہونے کے بعد اُن تمام گلیوں میں گھومتے جہاں ہم ایک زندگی جی چکے تھے۔ ہم اُن گھروں کو بھی دیکھتے جہاں جوانی سے آگے نکل جانے والی عورتوں کی ٹانگیں دبایا کرتے تھے اور اُن گھروں کو بھی جن کی گھنٹیاں بجا کے یا کنڈیاں کھٹکھٹا کے بھاگ جایا کرتے تھے۔ یہ معصوم یادیں ہمیں ہمیشہ اُداس کر جاتیں اور ہم دور تک اپنے ہی اندر کی خاموشی سے دست وگریباں ہوتے خاموش چلتے رہتے۔ میری زندگی میں اپنی ہی بوئی ہوئی پژمردگی تھی اور اُس کی زندگی میں حالات نے ایک پھیکے پن کی پچکاری چلا دی تھی۔ ہم شاید مختلف حالات میں سے گزرتے ہوئے زندگی کے ایسے نقطے پر آن ملے تھے جس سے آگے چلنے کے لیے ہمیں ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت تھی۔ اِس لیے یہ مزید اہم ہو گیا تھا کہ مرزے کی اُس سوچ کو کامیابی سے ہمکنار کروایا جائے۔ شروع میں لوگوں کو وہاں کی جانے والی گفتگو سے زیادہ میز پر سجی دعوت میں دل چسپی تھی۔ شام کو طرح طرح کے لوگ وہاں آتے اور ہمیں اپنے منصوبے کی افادیت پر شک گزرنے لگتا۔ لیکن ہم نے مرزا کی محفلوں کو شہر کی منفرد بیٹھک بنانے کا تہیہ کیا ہوا تھا چناں چہ جو بھی غیر ضروری لوگ آتے ہم نے انھیں چلتا کرنے کا فیصلہ کر کے اُس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ اُن کے سرپرستوں کو یہ پسند نہیں آیا لیکن

ہم بھی اپنے فیصلے پر قایم رہے اور فلٹریشن کا سلسلہ جاری رکھا۔آہستہ آہستہ وہ لوگ جو تعقلی طور پر بیٹھک کے معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے آنا کم ہو گئے۔ مرزا وہاں سے ہر شعبے میں قاید پیدا کرنا چاہتا تھا اور ایک وقت کے بعد شہر کے منظرنامے پر ایسے لوگ سامنے آنے لگے جو وہاں کی بحثوں میں حصہ لیتے رہے تھے۔وہ کسی نہ کسی طرح اپنی کامیابی کا سہرہ مرزا کے گھر میں بپا ہونے والی محفلوں کے سر باندھتے۔

وہ شروع میں جب کھانے کا اعلان کرنے آتی تو چند لفظ بولتے ہوئے ایک بھاری جھجک کو بمشکل ہٹاتے ہوئے محسوس ہوتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اُس کے اعتماد میں اضافہ ہونے لگا اور پھر جب کبھی کوئی گرماگرم قسم کی بحث چل رہی ہوتی وہ چپکے سے آکے بیٹھ جاتی اور بہت غور سے ایک ایک لفظ سنتی۔ میرا نہیں خیال کہ کسی نے اُسے وہاں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ میرے ذمے چند ایک اہم کام دیے گئے تھے جن میں وہاں ہونے والی ہر بحث کو غیر مہذب نہیں ہونے دینا شامل تھا اِس لیے میں ہر کسی کو اپنی نظر میں رکھتا اور میری اُس کے ساتھ بھی نظر ملتی رہتی۔ ایک دِن اُس نے سب کو حیران کر دیا۔ اُس وقت عورتوں کے حقوق پر بات چل رہی تھی اور کچھ لوگ عورت کی تضحیک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے تھے کہ وہ اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی، اتنی اچانک کہ میں بھی نہ جان سکا۔ اُس نے کوئی لمبی تقریر نہیں کی بس سب کو اپنی طرف متوجہ کر کے اتنا ہی بتایا کہ وہ وہاں موجود تھی۔ اُس کی آواز میں کسی قسم کی جھجک کا بھاری پن نہیں تھا اور اُس کے بعد بھی کبھی محسوس نہیں ہوا۔ مرزا نے بھی پسندیدگی اور ناگواری کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اُسے دیکھا اور پھر لاتعلق ہو کے اپنے معمول کے آسن میں بیٹھ گیا۔ اب اُس نے باقاعدگی سے اپنی رائے دینا شروع کر دی اور وہ کچھ ہی عرصے میں بیٹھک کا مستقل حصہ بن گئی۔ مرزا کی غیر حاضری کو کبھی محسوس نہیں کیا جاتا تھا شاید اِس لیے کہ وہ گفتگو میں کبھی حصہ نہیں لیتا تھا لیکن اگر کسی دِن وہ نہ آئے تو ہر تبادلۂ خیال نامکمل لگتا کیوں کہ وہ اب گفتگو کو سمیٹتی تھی۔ کیا اُس نے کسی خفیہ ذریعے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہوئی تھی؟ میرا دعویٰ تھا کہ میں اُس دنیا کو نہایت احتیاط سے دیکھ چکا ہوں جہاں کامیابی بھی ناکامی کے خمیر میں سے اُٹھتی ہے اور جہاں عورت کو کامیاب ہونے کے لیے مختلف ناکامیاں قبول کرنا ہوتی ہیں۔ مجھے اچانک محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک عام عورت نہیں تھی۔ مجھے اُس کے بیٹھنے کے انداز اور اپنے دلائل دیتے ہوئے آواز میں سے ہر طرح کی کم اعتمادی

کو دور رکھنا اُس کی تربیت کا حصہ لگا۔

اب وہ وہاں اُسی طرح بیٹھتی جیسے اُس نے وہیں بیٹھنا ہو!

مرزا کی صحت اتنی اچھی نہیں رہنے لگی تھی۔ اُسے کسی قسم کا فوری خطرہ تو نہیں تھا لیکن اُسے پریشانی ضرور رہتی کہ وہ صحت مند نہیں تھا۔ اب اُسے اپنے بیٹے کا اتنا دور ہونا ایک کانٹے کی طرح چبھتا۔ وہ کہا کرتا کہ ہم دونوں اِسی ملک میں رہتے ہوئے کامیابی کی اپنی اپنی حدود کو چھو چکے تھے جس میں اُس کی کامیابی میں اُس کے باپ اور میری میں میری اپنی منصوبہ بندی شامل تھی۔ اُس کے بیٹے کے لیے یہاں ایک کامیاب کاروباری سلطنت تھی جس کا اُس نے سربراہ بننا تھا لیکن وہ وہیں کا ہو کے رہنا چاہتا تھا جہاں وہ تھا۔ اُس نے اپنی جڑیں وہیں مضبوط کر لی تھیں۔ مرزا اب سوچتا کہ وہ اپنی اِس سلطنت کا کیا کرے؟ یہ سب تو تھا لیکن مرزا اپنی سلطنت کو کسی طرح بھی زوال تک آنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے پورے نظام کی مکمل توجہ کے ساتھ نگرانی کر رہا تھا۔ وہ اتنا بے رحم یا اعلیٰ معیار پسند تھا کہ اپنے کسی سٹور پر اگر بلب کو بجھا ہوا پاتا تو پوری شفٹ کی ملازمت کی وہ آخری شام ہوتی۔ وہ کسی قسم کی نا اہلی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے بعض اوقات یہ بھی لگتا کہ وہ بیمار نہیں ہے اور اُس نے بیماری کا ایک ڈرامہ رچایا ہوا ہے اور یا وہ حقیقت میں بیمار ہے لیکن بیماری اُس کی زندگی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ شام کی محفل کے آغاز تک وہ اپنے کاروباری معاملات میں اُلجھا رہتا اور تھک کے سو جانے کے بجائے شام کو وہاں لوگوں کو بحث کر کے سنتے ہوئے اپنے کھچے ہوئے اعصاب کا تناؤ کم کرتا۔ میں محسوس کرتا کہ یہ محفلیں اب اُس کے لیے ایک نشہ بن چکی تھیں۔

وہ عورت کون تھی؟ میں مرزا سے پوچھنا چاہتا تھا۔ مرزا نے اپنی بیوی کا بھی کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ مجھے تجسس ضرور تھا لیکن میں نے کبھی جاننا مناسب نہیں سمجھا۔ اُسے کسی نے کبھی دیکھا نہیں تھا اور نہ ہی کبھی ذکر ہوا۔ اتنا ضرور تھا کہ وہ زندہ تھی کیوں کہ کسی نے اُس کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہیں کی تھی۔ مرزا کا ہر وقت مصروف رہنا اِس بات کی گواہی تھا کہ وہ گھر میں کم سے کم وقت گزارتا ہے۔ اُس عمر میں اتنی محنت تب ہی کی جا سکتی تھی جب زندگی میں کوئی دل چسپی یا وابستگی نہ ہو اور صرف کاروبار ہی اوڑھنا بچھونا ہو۔ مجھے مرزا پر ترس آتا اور رشک بھی کہ وہ کتنی ان تھک زندگی گزار رہا تھا۔ میں بھی اُس کی طرح مصروف رہنا چاہتا تھا لیکن پھر سوچتا کہ اگر میں بھی ویسا ہی مصروف ہو گیا تو ہم دونوں میں فرق

کیا رہے گا؟ میں اُس کا قریب ترین دوست ہونے کے باوجود اُسے بیمار، غیر وابستہ اور فارغ دیکھنا چاہتا تھا، میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اُس کا کاروبار کسی کمزور عمارت کی طرح ڈھے جائے۔ میرے اندر زمانوں سے چھپی ہوئی ایک بغاوت تھی۔ میں نے جو بھی حاصل کیا اپنی محنت سے کیا جب کہ مرزا کو اُس کے باپ نے اُس چھوٹی سی بیٹھک میں سے حاصل کردہ دولت کے ایک انبار پر براجمان کر دیا تھا۔ وہ دولت کتنی تھی اور اُس نے کن لوگوں سے حاصل کی تھی؟

مرزا نے شام کی محفل کچھ دنوں کے لیے برخواست کی اور مجھے اپنے ساتھ کہیں چلنے کے لیے تیار کیا۔ مجھے ایک تجسس نے ساتھ چلنے کے لیے اُکسایا۔ ہم ایک طویل سفر کے بعد پہاڑ کی ایک بلند چوٹی پر پہنچے جہاں جنگل کا ایک سمندر تھا۔ ہر طرف درخت ہی درخت تھے؛ آسمان کو چھوتے ہوئے، چٹانی زمین سے سر نکالتے ہوئے اور جوانی کی حدوں کو چھوتے ہوئے۔ اُس سمندر میں ایک جزیرہ تھا جہاں ہم کھڑے تھے۔ ارد گرد درختوں پر بندروں کے جمگھٹے تھے جو ہمیں دیکھ رہے تھے؛ کچھ کی نظروں میں حیرت تھی، کچھ کے تجسس، کچھ کے لاتعلقی، کچھ کے جارحیت اور کچھ کے مدافعت تھی۔ میں یہ سب دیکھ کے کچھ گھبرا گیا، میرے جسم میں خوف کی ایک جھرجھری دوڑ گئی؛ ایسے محسوس ہوا کہ مختلف گروہوں کے سرداروں نے اپنے اپنے قبیلوں کو قائل کر کے ہم پر حملہ کر دینا ہے۔ مجھے یہ بھی خوف تھا کہ ارد گرد بندروں کے علاوہ خطرناک قسم کے درندے بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھے مرزا کے ذہن میں ایسی پریشانی نظر نہیں آئی۔ وہ ایک پرسکون تسلی کے ساتھ، اپنے ارد گرد سے بے نیاز، وہاں ایسے کھڑا تھا جیسے وہ اُس ماحول سے قریبی مانوسیت رکھتا ہو۔ دِن بھی کافی ڈھل چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ پہاڑوں پر شام جلد اُتر آتی ہے۔ مرزا ایک بے اعتنائی سے ارد گرد دیکھے جا رہا تھا اور مجھے لگا کہ وہ نظارہ اپنی ناتراشیدہ خوب صورتی کے ساتھ اُسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے اور وہ میرے اندر سلگتے ہوئے خوف سے لاتعلق یا بے خبر تھا۔ اب ٹھنڈ ہونا بھی شروع ہو گئی تھی۔ تبھی وہ میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔ مجھے اُس مسکراہٹ میں شرارت کے ساتھ ایک اَسرار بھی نظر آیا۔ ہم نے چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ''تمھیں یاد ہوگا کہ ایک بار میں اپنے باپ کے ساتھ چند دنوں کے لیے غائب ہو گیا تھا۔'' مجھے اچانک اُس کا غائب ہونا یاد آ گیا۔ ایک دِن وہ سکول سے غیر حاضر تھا اور میں وجہ جاننے کے لیے اُس کے گھر گیا تو اُس کی ماں نے بتایا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ کہیں گیا ہے اور شام تک آ جائے گا۔ میں

مطمئن لیکن تھوڑا سا پریشان گھر واپس گیا کہ وہ کہیں چکر لگانے گیا ہوا ہے جب کہ میں اپنے شہر سے باہر کہیں نہیں گیا۔ میں نے سوچا کہ اگلا دِن دل چسپ رہے گا کہ اُس سے سفر کے بارے میں سوالات کروں گا لیکن مجھے مایوسی ہوئی کہ وہ کئی دِن نظر نہیں آیا اور جب آیا تو میرے کسی سوال کا اُس نے جواب نہیں دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے کئی سال پہلے والے تجسس کا اب جواب ملنے لگا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہم یہاں آئے تھے۔'' وہ رکا۔ اب اُس کی آنکھوں میں ایک دوری تھی۔ چاروں طرف درختوں پر ٹکے ہوئے بندروں کو ایک نظر دیکھا۔ ''یہ جگہ بھی اُس جوئے میں جیتی گئی تھی۔ اُن جواریوں میں ایک اِس پہاڑ کا مالک تھا۔'' میرا تجسس اِتنا حاوی ہو گیا تھا کہ مجھے بندروں یا دوسرے کسی خطرناک درندے کا خوف نہیں رہا تھا۔ ''ہم نے آ کے یہ جگہ دیکھی اور اِس پر اپنے مالکانہ حقوق کا پروانہ دکھایا۔ کسی نے اعتراض نہیں کیا اور اِس خالی جگہ پر کوئی درخت نہیں لگایا گیا۔'' مرزا خاموش ہوا۔ اُس نے پھر اردگرد دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ جو دیکھنا چاہتا تھا اُسے نظر نہیں آیا۔ ''میں اب اِس جگہ کو آباد کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کچھ جگہیں آباد کیے جانے کے باوجود بے آباد ہی رہتی ہیں اور یہ اُن میں سے ایک لگتی تو ہو گی لیکن میں اِسے ایسے آباد کرنا چاہتا ہوں کہ یہ آباد لگے۔'' میں مرزے کی قوتِ ارادی کو جانتا تھا۔ وہ جو فیصلہ کر لیتا تھا اُس کی تکمیل اُس کی خواہش کے مطابق ہی ہوتی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ ''میں یہاں اُس عورت کو آباد کرنا چاہتا ہوں جو ہماری محفلوں میں بیٹھتی ہے۔ وہ یہاں رہا کرے گی۔'' مجھے زندگی میں پہلی بار مرزا اپنے دماغی توازن سے ہلا ہوا لگا۔ وہ عورت یہاں قدرت کے رحم و کرم پر کیا اکیلی رہے گی؟ مرزا اُسے کوئی سزا دے رہا تھا یا کوئی انعام؟ مجھے اچانک خیال آیا کہ وہ عورت ہے کون ؟ اور اچانک مرزا نے اُس کا جنگلوں کے اِس سمندر کے درمیان میں واقع ایک جزیرے میں اُس کا ذکر کیوں کیا؟ مجھے یہ جاننا ضروری لگا۔

''مرزا! تم دماغی طور پر تو ٹھیک ہو؟'' کچھ عرصے سے، یہ عمر کی وجہ سے تھا یا محض اتفاق کہ ہمارے درمیان میں سے اچانک بے تکلفی جاتی رہی تھی اور ہم پہلے جتنا قریب ہونے کے باوجود قریب نہیں رہے تھے۔ مرزے نے میری طرف ایسے دیکھا کہ مجھے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ مجھے ایک لمحے کے لیے اُس کی آنکھوں میں اجنبیت نظر آئی اور پھر اُس کے ہونٹوں پر بچپن والی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دل چسپی سے دیکھتے رہے۔

''کچھ کچھ چل گیا ہے اور کچھ کچھ نہیں چلا۔'' وہ اب ہنس رہا تھا۔ ''میں اُس عورت کو یہاں اِس لیے رکھنا چاہتا ہوں کہ میرے لیے اُسے وہاں رکھنا ممکن نہیں۔ اِس لیے نہیں کہ اُس کے وہاں پر رہنے سے لوگوں کے دلوں میں سوال اُٹھیں گے، مجھے اِس کی پروا نہیں ہے؛ یہ اُس کے لیے اچھا نہیں۔'' وہ ابھی تک مجھے دیکھے جا رہا تھا اور مجھے اُس کی باتیں ایک اُلجھن میں ڈالے جا رہی تھیں۔ اُس کے وہاں رہنے سے کیا سوال اُٹھ سکتے تھے؟ کیا مرزا نے اُسے رکھا ہوا تھا؟ اگر ایسا تھا تو اُس کے پاس اتنے ذرائع تھے کہ وہ اُسے کہیں بھی رکھ سکتا تھا مگر یہ جگہ یقیناً مناسب نہیں تھی۔ مرزا یہاں مستقل رہ نہیں سکتا تھا اور اُس کے لیے مستقل رہائش رکھنا ناممکنات میں شامل تھا۔ وہ شاید بندروں سے خوف زدہ ہو کے ہی مر جائے۔

''تم کیا بات کر رہے ہو؟'' میری آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔ ''وہ ہے کون؟'' میری آواز قدرے بلند تھی؛ اتنی بلند کہ بندروں نے بھی ایک لمحے کے لیے اپنی حرکات روک کے ہماری طرف دیکھا اور پھر اپنے معمولات میں لگ گئے۔ مجھے شرمندگی بھی ہوئی۔ مرزا دھیرے سے مسکرایا۔ اِس مسکراہٹ میں ایک برتری بھی تھی اور یہی دزدیدہ قسم کی وہ برتری تھی جو مجھے اُس کا خیر خواہ ہونے کے باوجود اُس کے خلاف اُکساتی رہتی۔

''یہ بھی صرف تمھیں ہی جاننا چاہیے۔'' مرزا ایک لمبی سانس لے کے بولا۔ اُس نے چھاتی میں سانس بھر کے روک لی تھی اور پھر اُسے آہستہ آہستہ نکالا تھا۔ سانس لینے کے اِس عمل کے دوران میں مجھے وہ کسی گہری سوچ میں بھی غرق لگا تھا۔ کیا وہ اپنی بات کہنے سے خائف تھا؟ اُس نے گلا صاف کیا؛ شاید خود اعتمادی کے لیے۔ ہم دونوں لنگوٹیے تھے؛ ایک دوسرے کو پسند کرنے کے باوجود شاید ناپسند بھی کرتے تھے۔ میرے ساتھ اِس انتہا کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے باوجود مجھے اُس میں ایک جھجک محسوس ہوئی اور کسی حد تک خوف زدہ بھی لگا۔ وہ کیوں خوف زدہ تھا؟ ''ہمارے پرانے گھر کی بیٹھک میں جوا ہوتا تھا۔ یاد ہے؟'' اُس کے لہجے میں بے بسی واضح تھی۔ اِس سوال کا میں کیا جواب دیتا! میں بُت بنا اُسے دیکھتا تھا۔ اُس کی خاموشی جب طول کھینچ گئی تو میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہاں ایک دِن چند لوگ سب کچھ ہار گئے۔ اگر میرا باپ نہ جیتتا تو وہ سب کچھ ہار بھی سکتا تھا۔'' وہ رکا اور مجھے جواریوں کی اخلاقیات پر حیرت ہوئی کہ وہ جو ہارے اُس میں بے ایمانی نہیں کی۔ ''اگر وہ ہار جاتا تو میں

ابھی تک کہیں بھیک مانگ رہا ہوتا یا مر گیا ہوتا یا مار دیا جاتا۔'' اب اُس کی آواز میں تمسخر تھا۔'' وہ آدمی جوا ہارنے کے بعد زیادہ دِن نہیں جیا۔ اُس کی ایک بیٹی تھی جس نے ابھی سکول جانا شروع نہیں کیا تھا اور وہ ہمارے پاس آ گئی جو ہم نے تمھیں کیا کسی کو بھی پتا چلنے نہیں دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے حالات میں تبدیلی آ رہی تھی اور تم ہمارے ہاں آنا تقریباً ختم کر چکے تھے۔ اُسے میں نے تعلیم دلوانا شروع کر دیا۔ وہ پڑھائی میں اچھی تھی اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد میرے پاس آ گئی کہ اُس کا اور کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اُس نے آتے ہی گھر کا انتظام سنبھال لیا اور پھر شام کی محفلوں میں بھی آنے لگی۔ بچپن میں وہ ایک مرتبہ یہاں آئی تھی اور اِس جگہ کی خوب صورتی اُس کے ذہن میں نقش ہو کے رہ گئی ہے۔ اُس کے باپ کا ہم پر احسان ہے کہ وہ ہار کے دوسرے لوگوں کی جیبیں بھی خالی کروا گیا۔'' وہ خاموش ہو گیا اور میرے ذہن میں بگولے چلنے لگے اور وہیں کہیں چکر کاٹتی ہوا میں مجھے مرزا کی بیوی کا چہرہ نظر آیا۔ زردی مایل رنگ میں ہلکے سے سرخ رنگ کا چھڑکاؤ جو اُسے اُداسی میں ڈوبا ہوا چمکتا حسن دیتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں جن پر ہر قسم کا رنگ سج جاتا ہے، وہ رنگ اُس چہرے کو نہیں سجاتے۔

''میں نے بھا..... تمھاری بیوی کو ایک عرصے نہیں دیکھا۔'' میں نے اپنے تجسس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور ساتھ ہی اپنی ناپسندیدگی کا دزدیدہ قسم کا اظہار کر دیا۔ اُس نے میری طرف خالی نظر سے دیر تک دیکھا جو مجھے لگا کہ وہ مجھے تول رہا ہے۔ جنگل کے اُس جزیرے میں ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی اور پتوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا سسکیاں لے رہی تھی؛ مجھے بندر بھی کچھ بے چین لگے۔

''میری بیوی نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے۔'' اُس نے ایک آہ بھری۔ ''اُسے کسی طور علم ہو گیا کہ ہماری دولت کا منبع غیر قانونی ہے۔ اُس نے خود کو پلید سمجھنا شروع کر دیا ہے اور اب وہ ایک کمرے میں قید ہو کے رہ گئی اور ہر وقت خود کو پھونکیں مار مار کے پاک کرتی رہتی ہے اور میرے باپ کو اور مجھے بددعائیں دیتی رہتی ہے۔ وہ کھانا بھی مسجد سے منگوا کے کھاتی ہے۔ میں اُسے کہنا چاہتا تو ہوں کہ مسجد میں کھانا بھیجنے والوں کی کمائی کا منبع شاید ہم سے بھی زیادہ ناپاک ہو لیکن وہ مجھے دیکھتے ہی پردہ کر لیتی ہے، پھر مجھے خیال آتا ہے کہ ناپاکی تو ناپاکی ہوتی ہے، کم یا زیادہ نہیں۔ وہ شاید درست ہو لیکن زندگی میں ایسے ہی ہوتا ہے، جیسے وہ سمجھتی ہے ویسے نہیں۔ کامیابی کی جڑ ناپاکی ہی ہے۔'' وہ ہنسا۔ اُس کی ہنسی میں طنز اور تلخی تھی۔ اب ہوا اور تیز ہو گئی تھی اور بندر کچھ اور قریب آ گئے تھے۔ مجھے اب خوف

محسوس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بندر غالباً سبزی خور تھے لیکن تازہ گوشت بھی اُن کے لیے شاید الگ ذائقہ رکھتا ہے۔ مجھے اپنے جسم کا ہر بال جڑوں سمیت اکڑا ہوا محسوس ہوا۔ وہاں میرے علاوہ شاید ہر چیز پُر اعتماد تھی؛ ہوا میں ایک وقار تھا، بندر متجسس سے ہمیں دیکھ رہے تھے، درخت وقار کے ساتھ آسمان کو تک رہے تھے اور مرزا اِن سب سے لاتعلق اپنی ہی کسی سوچ میں گم تھا۔ مجھے وہاں، مرزا سمیت، ہر کوئی کسی گہری سازش کا حصہ محسوس ہوا۔ میں اکیلا کیا سب کا مقابلہ کر سکوں گا؟ ''وہ اب کسی خانقاہ میں بٹھانے جوگی بھی نہیں رہی۔'' وہ ہنسا۔ مجھے اُس کی ہنسی میں ایک دیوانگی محسوس ہوئی۔ وہ شاید ایک عرصے سے خود کو اذیت دیتا آیا ہے! ''اگر اُسے میرے محسن کی بیٹی کی گھر میں موجودگی کا علم ہو جائے تو وہ گھر چھوڑ کر ہی بھاگ جائے۔ اِس لیے میں اُس عورت کو یہاں شفٹ کرنا چاہتا ہوں۔'' مجھے اُس کی سوچ منطقی اور غیر منطقی لگی۔ اُسے اپنی بیوی پسند تھی لیکن اُس کی سوچ کے ساتھ اتفاق نہیں تھا۔ اُسے اپنے محسن کی بیٹی شاید پسند نہیں تھی لیکن اُس کے ساتھ رواداری کے طور پر ہمدردی کا رشتہ تھا۔ مرزا ایک جالے میں پھنسا ہوا تھا اور وہ اُسے بھی ساتھ ہی اُلجھانا چاہتا تھا تا کہ وہ اکیلا نہ رہے۔ میں اُس کا سہارا تھا۔ میں اُس کا کیسے سہارا ہو سکتا تھا؟ وہ نتیجے کی پروا کیے بغیر مقابلہ کرنے میں یقین رکھتا تھا اور میں یقین رکھنے کے باوجود تبھی مقابلہ کرتا تھا جب کامیابی یقینی ہو۔ ''یہاں ایک چھوٹا سا گھر بنے گا جس میں زندگی کی ہر ضرورت میسر ہو گی۔ اُسے پڑھنے کا شوق ہے اور وہ جتنی چاہے کتابیں رکھ لے۔'' وہ خاموش تھا۔ مجھے اُس کی خاموشی میں اسرار کا بھاری پن لگا۔ ایک خوف کی جھرجھری پھر میرے بدن میں دوڑ گئی۔ مجھے اُس عورت پر ترس آیا جو یہاں رہے گی جب کہ اُس کے گرد بندر دیواروں کو اُدھیڑنے کی فکر میں ہوں گے۔

''وہ یہاں اکیلی رہے گی؟'' میری آواز میں بے یقینی تھی۔

''نہیں۔'' اُس نے سرگوشی سے کچھ اونچی آواز میں کہا۔ مجھے اُس کی آواز میں اعتماد محسوس ہوا۔ میں اُس کے اِسی اعتماد سے اُسے ناپسند بھی کرتا تھا۔ ''تم یہاں اُس کے ساتھ رہو گے۔'' اُسی وقت بندر اپنا دائرہ اور بھی تنگ کر چکے تھے؛ وہ اتنا نزدیک تھے کہ مجھے اُن کے جسموں سے اُٹھتی ہوئی کڑوی سی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جنگل کی سرسراتی ہوئی ہوا، خاموشی اور بندروں کی آنکھوں سے لپکتے ہوئے شعلے میرا سانس دبانے لگے۔ مجھے اچانک بندر اتنا قریب محسوس ہوئے کہ اُن میں کوئی بھی

چلانگ لگا کے مجھے نیچے گرا سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بندر اب آخری جست لگانے کے لیے تیار تھے۔ اُسی وقت مرزا کے جسم میں حرکت ہوئی اور اُس نے اپنے جیکٹ کی جیب سے پستول نکال کے گولی چلائی۔ اُس خاموشی میں گونجتی ہوئی گولی کی آواز میں بندروں کی چیخیں بھی شامل ہو گئیں۔ ہم تیزی سے کار کی طرف چلے تو وہ کار کو گھیرے ہوئے ہمارے انتظار میں لگے۔ اُسی وقت مرزا کا پستول والا ہاتھ اپنے سر کی طرف اُٹھا ہی تھا کہ میں نے پکڑ لیا!
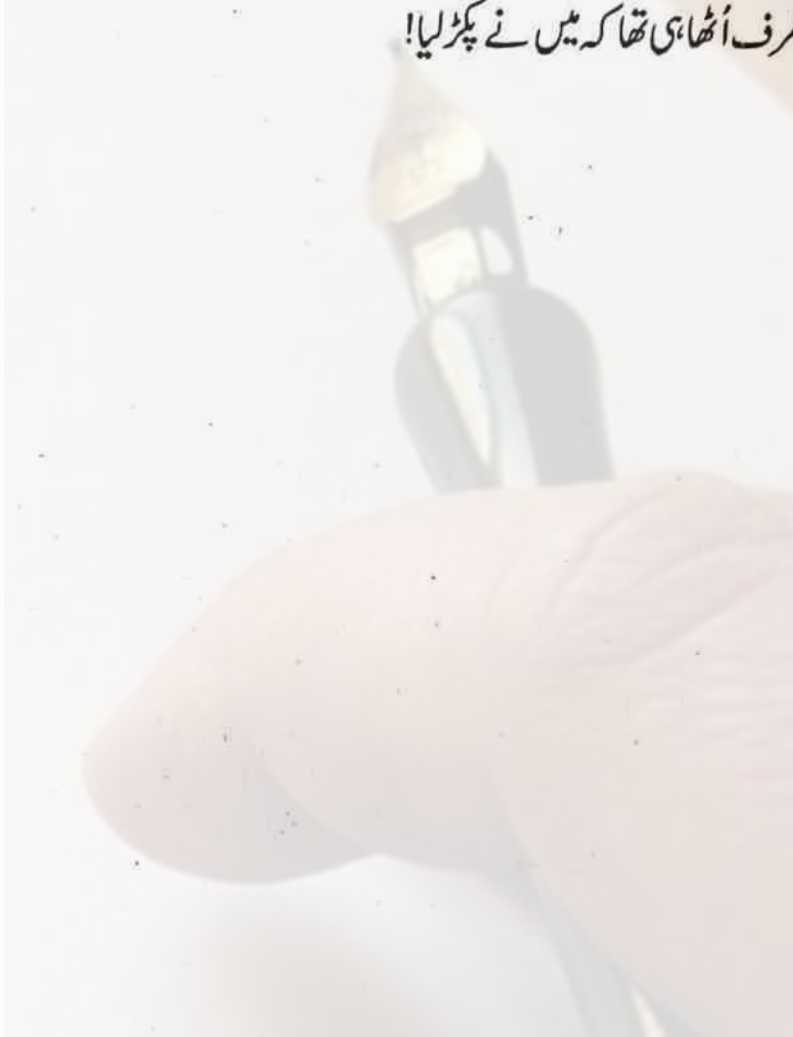
اندھیروں کا سراغ

فرقان کی ایک پبلشر کے ساتھ ملاقات طے تھی۔ نہ تو وہ اتنا بڑا پبلشر تھا اور نہ ہی فرقان اتنی اہم شخصیت کہ ملاقات کا وقت طے کر کے ملتے لیکن فرقان چند دوستوں کے علاوہ ہر کسی کے ساتھ وقت طے کر کے ملتا۔ یہ سب کو عجیب لگتا لیکن اِسے فرقان کی ذہنی رو سمجھ کر اہمیت نہ دی جاتی۔ وہ جب پبلشر کے دفتر میں گیا تو وہ دو عورتوں اور ایک آدمی کے ساتھ کسی مسئلے پر گفتگو میں مصروف تھا۔ فرقان میز سے کچھ فاصلے پر ایک طرف پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے دوسری طرف بیٹھی بڑی عمر کی عورت کی طرف دیکھا؛ وہ ایک خوب صورت عورت تھی، اتنی خوب صورت کہ فرقان کو اُس میں کہیں کوئی کمی نظر نہیں آئی جس کی وجہ سے وہ اُسے اِتنی پرکشش نہ لگی؛ وہ کچھ مایوس ہوا کہ اتنی خوب صورت عورت کسی کشش کے بغیر تھی۔ پھر اُس نے اُس عورت کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کو دیکھا جو اُسے غیر اہم لگا۔ دونوں سے ذرا ہٹ کر دوسری عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ فرقان نے جب اُسے دیکھا تو وہ کسی بات پر مسکرا رہی تھی اور اُسی مسکراہٹ میں اُس نے فرقان کی طرف دیکھا۔ فرقان کو اُس مسکراہٹ میں ایک طرح بے دلی نظر آئی۔ اُس عورت کے نقوش میں کوئی خرابی نہیں تھی، لیکن کچھ ایسا بھی نہیں تھا کہ یاد رہ جاتا۔ ایک عام سی شکل، تھوڑے موٹے ہونٹ، اونچی نہیں کچھ لمبی ناک اور بائیں گال پر، جہاں ہونٹ کے کنارے ختم ہوتے ہیں، وہاں سے کچھ دور ایک چھوٹا مگر واضح مو ہکہ تھا۔ فرقان نے دل چسپی سے سوچا کہ مو ہکہ گر نزدیک ہوتا تو ہونٹ چومنے میں ایک طرح کی بدمزگی ہوتی۔ پھر وہ عورت سنجیدگی سے

اُن تینوں کے درمیان کی جانے والی باتیں سننے لگی اور فرقان کو اُن میں کوئی دل چسپی نہ رہی۔ وہ اپنی ہی کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

''میں سب سے معذرت خواہ ہوں۔'' پبلشر کی آواز نے فرقان کو اُس کی بے مہار سوچ سے نکالا اور اُس نے چونک کر پبلشر کی طرف دیکھا۔ ''محترمہ زہرہ۔ زہرہ صاحبہ ایک جانی پہچانی دانش ور ہیں۔ آپ کی چند کتابیں چھپ چکی ہیں۔'' زہرہ نے مسکراتے ہوئے فرقان کی طرف دیکھا جس نے سر کی جنبش سے سلام کیا۔ ''ریاض صاحب ایک کالج میں پڑھاتے ہیں۔'' ریاض نے مسکراتے ہوئے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر فرقان کو سلام کیا۔ ''ماریہ صاحبہ ایک افسانہ نگار ہیں۔'' فرقان نے ایک بار کہیں یہ نام سنا ہوا تھا اور اُس نے سوچتے ہوئے کہ کہاں سنا تھا، اُسے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آداب کہا۔ ''اور یہ فرقان صاحب ہیں۔ کبھی کبھار افسانہ لکھتے ہیں جو خاصا جان دار ہوتا ہے اور اعلیٰ پائے کے تفتیشی صحافی ہیں۔ اِن کی چند رپورٹوں نے ایک عرصے تک ملک میں تہلکہ مچائے رکھا۔'' فرقان اپنی تعریف سے کچھ کھسیانہ سا ہوا اور سر جھکا کر کچھ دیر مسکراتا رہا۔

''میں نے آپ کے چند افسانے پڑھے ہوئے ہیں۔'' ماریہ نے بات شروع کی۔ ''آپ کے افسانوں میں مجھے ایک بزرگانہ پہلو نظر آیا۔ میں ہمیشہ آپ کو ایک سینئر لکھنے والا سمجھتی رہی۔'' اُس نے ہنستے ہوئے بات مکمل کی۔

''میں جب بوڑھا ہو گیا تو جوان افسانے لکھوں گا۔'' فرقان نے سنجیدگی سے کہا تو وہاں ایک قہقہہ لگ گیا۔

''درمیانی عمر میں کیا لکھیں گے؟'' زہرہ نے ہنستے ہو چھا۔

''تب میں دانش وری کروں گا۔'' زہرہ اِس جواب سے جھینپ گئی۔

پبلشر نے بیچ میں آ کے موضوع کو نیا رُخ دیا۔ ''فرقان صاحب دو مجموعے چھپانا چاہتے ہیں۔ ایک افسانوں کا اور ایک اپنی رپورٹوں کا۔ جلد ہی دونوں کتابیں دستیاب ہو جائیں گی۔'' فرقان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ابھی تک اُس کے پبلشر کے ساتھ معاملات طے نہیں ہوئے تھے؛ دو اشاعت گھر اور بھی تھے جو اُسے چھاپنے میں دل چسپی رکھتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ پبلشر زہرہ کو کنڈی میں پھنسا رہا ہے اور اُسے کیڑے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ اُس نے کوئی تاثر نہیں دیا۔

''میں نے بھی کچھ عرصہ ایک اخبار میں کام کیا ہوا ہے۔ تب میں یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ میں ادیبوں کے انٹرویو کیا کرتی تھی۔'' فرقان کے ذہن میں ایسا کچھ آیا کہ اُس نے چند سال پہلے کسی لڑکی کے دو انٹرویو کسی اخبار میں پڑھے تھے۔ اُس کی پیشہ ورانہ مجبوری نے اُن انٹرویوں کے بارے میں سوال پوچھنے کا ٹھوکہ دیا لیکن پھر کسی مصلحت کی وجہ سے وہ خاموش رہا۔

''حیرت ہے۔ مجھے تم نے یہ نہیں بتایا کہ افسانے لکھتی ہو۔'' زہرہ نے شکوے کے انداز میں تعریف کی۔

''بس ایسے ہی!'' ماریہ نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔ فرقان کو ماریہ کا شرمانا اچھا لگا۔ اُس کے چند لڑکیوں کے ساتھ تعلقات رہے تھے۔ اُن سب کے ختم ہونے کی وجہ اُن کی بے جا شرم اور جھجک تھی۔ اُسے ایسی لڑکیاں پسند تھیں جو اپنے آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔ اُسے شرمانے والی لڑکیوں میں ایک طرح کی منافقت کا احساس ہوتا۔

''آپ یہ اِنویسٹیگیٹو جرنلزم کیسے کر لیتے ہیں؟ میں نے آپ کو تو نہیں پڑھا لیکن چند رپورٹیں پڑھی ہیں۔ مجھے وہ متاثر نہیں کر سکیں۔ ایسے محسوس ہوا کہ کسی نے اُن سے خود لکھوایا ہے۔ زہرہ نے رائے دی۔'' فرقان کا زیادہ تر رپورٹوں کے بارے میں یہی خیال تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ چند لوگ خود کو خطرے میں ڈال کر بھی یہ کام کر رہے ہیں؛ کچھ ایسے غائب ہوئے کہ اُن کا آج تک نشان نہیں مل سکا۔

''فرقان صاحب اِس وقت بہت مہنگے رپورٹر ہیں۔ اِن کی کسی بھی تفتیش پر آج تک انگلی نہیں اُٹھ سکی۔'' پبلشر نے ایک اور گنڈی پھینک دی۔

''آپ کون سے کالج میں پڑھا رہی ہیں؟'' فرقان نے موضوع بدلنا مناسب سمجھا۔

''کالج نہیں۔ میں وومین یونیورسٹی میں پڑھاتی ہوں۔'' زہرہ نے ایک طرح سے پبلشر کے تعارف کی درستی کی۔

''جی ہاں۔ پہلے یہ کالج ہی تھا۔'' پبلشر نے صفائی دی اور سامنے گھڑی دیکھتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''آپ مجھے مسودہ ای میل کر دیں۔ میں پھر کتابی شکل دے کر آپ کو پرنٹ بھیج دوں گا۔'' وہ تینوں بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرقان کی طرف توجہ کیے بغیر باہر نکل گئے۔

''پروفیسر صاحب اِس خاتون کے سپانسر ہیں۔ آج کل ہر لکھنے والی خاتون کا کوئی نہ کوئی پروفیسر اپنے طور پر ہی سپانسر بن جاتا ہے۔'' پبلشر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ساتھ والی عورت کا کون سپانسر ہے؟'' فرقان نے اُس کرسی کی طرف اشارہ کیا جہاں ماریہ بیٹھی ہوئی تھی۔

''وہ اپنی سپانسر خود ہی ہے۔'' پبلشر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''آپ جو شرط رکھیں ہمیں منظور ہوگی۔'' پبلشر نے کاروباری لہجے میں بات شروع کی، ''بشرطیکہ یہ کاروباری نقطۂ نظر سے ہمیں نقصان نہ دے۔''

فرقان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑے وقفے کے بعد پبلشر نے بات جاری رکھی، ''ہم پہلے آپ کی صحافت والی کتاب چھاپنا چاہیں گے اور بعد میں افسانے۔'' فرقان نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ پبلشر کی منطق سمجھ گیا تھا۔

''دونوں کے درمیان میں وقفہ کتنا ہوگا؟''

''تین مہینے کا۔'' پبلشر کھڑا ہوگیا۔ ''ہم چند دنوں میں آپ کو ایگریمنٹ بھیج دیں گے۔ آپ دستخط کر کے ہمیں واپس بھیج دیجیے۔ اگر کوئی اعتراض ہوا تو باہمی بات چیت کی ہمیشہ گنجائش ہوتی ہے۔'' فرقان کو ایک کم پڑھے ہوئے آدمی کو ادیبوں کے ساتھ مالی معاملات میں اُن کی مجبوری سے فائدہ اُٹھانا ہمیشہ سے ناپسند تھا۔ اُس نے اِس موضوع پر کبھی تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا۔

''کچھ علم ہے کہ ماریہ کون سے اخبار کی بات کر رہی تھی؟'' فرقان نے ماریہ والی خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ ماریہ کے متعلق کچھ جاننا ضروری ہے۔ جاتے ہوئے ماریہ اُسے برتر نظر سے دیکھ کر گئی تھی جو فرقان کو پسند نہیں آیا تھا اور جس نے اُس کے متجسس مزاج کو مہمیز کیا۔

''میں نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ویسے میری اُس کے ساتھ آج دوسری ملاقات تھی۔'' پبلشر ملاقات ختم کرنے کے لیے دروازے پر آ گیا اور دونوں نے ہاتھ ملائے۔ فرقان دفتر سے نکلتے ہوئے کسی حد تک بے چین تھا۔ اُس کی تحقیقاتی سوچ نے اُسے ماریہ کے متعلق جاننے پر اُکسایا اور اُس نے ایک اضافی مصروفیت کے طور پر اِسے اپنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات میں موثر

سائیکل استعمال کرتا اور جب بھی غیر متوقع کچھ سوچنا پڑتا اُسے اپنی کار یاد آتی۔ اُس نے طے کیا کہ سب سے پہلے وہ اُس اخبار کا پتا چلائے گا جس میں ماریہ نے کام کیا تھا۔ جب یہ پتا چل گیا تو وہ ماریہ کے متعلق سب کچھ جان جائے گا۔ اُس نے سوچا کہ وہ تو ہمیشہ بڑے، لوگوں اور فرموں کے ہر قسم کے سکینڈل سامنے لایا کرتا ہے تو پھر ماریہ میں کسی کی کیا دل چسپی ہو سکتی ہے؟ اُس نے سوچا کچھ چیزیں غیر اہم ہوتی ہیں لیکن وہ اہم بن جاتی ہیں اور شاید یہ بھی اُن میں سے ایک ثابت ہو۔ یہ فیصلہ کر کے وہ اپنے جاری منصوبے کی تکمیل کے لیے چل پڑا۔ اُس کی کسی کے ساتھ ملاقات طے تھی اور اُس نے سوچا کہ فارغ ہو کے اپنے اُس رابطے سے ملے گا جو صحافیانہ انسائیکلو پیڈیا سمجھا جاتا ہے۔

اُس کی پیشہ ورانہ ملاقات اگر کامیاب نہیں تھی تو مایوس کن بھی نہیں تھی۔ وہ کبھی پریشان نہیں ہوتا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ اُس کے پیشے میں جلد بازی، پریشانی یا شکست نام کی کوئی چیز نہیں اور اُسے ہمیشہ مستقل مزاج رہنے کی ضرورت ہے۔ فرقان اپنے خیالوں میں گم اُس ڈھابے کے سامنے جا رکا جہاں صحافیانہ انسائیکلو پیڈیا بیٹھتا تھا۔ فرقان جانتا تھا کہ وہ یہ خبر گوگل سے بھی حاصل کر سکتا تھا لیکن جو مزا جمیل راز سے راز جاننے میں آتا تھا وہ گوگل میں نہیں تھا۔ صرف اُس وقت تک کا اُس کا ڈھابے کا بل اور پیٹر وو چ ووڈکا کے اَدھے کے پیسے اُسے دینے ہوتے۔

''صدقے میرے موٹر سائیکل چلانے والے کار سوار۔'' فرقان کو دیکھتے ہی اُس نے نعرہ بلند کیا۔ راز کے ساتھ ایک اور آدمی بھی بیٹھا ہوا تھا جس کے ساتھ فرقان کی شناسائی نہیں تھی۔

''اُستاد جی ٹھیک ہو؟'' فرقان نے خوش مزاجی سے پوچھا۔

''تیرے سامنے ہوں۔ تو اپنا سُنا؟''

فرقان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''میں بھی تیرے سامنے ہوں۔''

''کچھ دیر بیٹھے گا؟''

''اُستاد جب بھی آؤں تو بیٹھتا ہوں، تھوکڑے کرنے نہیں آتا۔''

راز نے نظر گھمائی اور ایک پرانے ویٹر کو دیکھ کر آواز لگائی، ''پہاڑیے! سنگی آلو گوشت، لہسن اور آم کا اچار اور گرم گرم ٹاپ۔'' یہ سنتے ہی دوسرا آدمی اُٹھ گیا۔ فرقان خاموش رہا۔ ''تو چل پھر بات کریں گے۔'' راز نے جانے والے کو مخاطب کیا اور پھر فرقان کی طرف مڑا: ''اور میرا اَدھا یاد ہے؟''

''کبھی بھولا ہے؟''

راز نے بلند قہقہہ لگایا۔ فرقان جانتا تھا کہ اُس کے قہقہے پوری صحافی برادری میں مشہور تھے۔ ''نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔'' اُس نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔ ''ابھی تک کھانا نہیں آیا؟'' اُس کے لہجے میں شکایت تھی۔

''آجائے گا.....اب میں اپنی بات کروں؟''

''کھانا آنے دو۔ مجھے بیچ میں دخل اندازی پسند نہیں ہے۔'' اُسی وقت کھانا آ گیا۔ راز نے ایک نظر سامنے میز پر ڈالی۔ ''اب بولو؟''

''میں یہ اطلاع دو چار اخباروں کے دفتروں کے چکر لگا کر پتا کر سکتا تھا لیکن آپ میرے انسائکلو پیڈیا ہیں۔ ماریہ نامی ایک لڑکی نے کچھ سال پہلے دو انٹرویو کیے تھے۔ وہ کون لوگ تھے اور اخبار کون سا تھا؟''

راز نے اپنے بڑے سارے گول سر کو کھجایا۔ ''وہ اخبار نہیں ایک پاپولر قسم کا ڈائجسٹ تھا۔ اُس نے ایک نقاد اور شاعر کو انٹرویو کیا تھا۔ شاعر تو فوت ہو چکا ہے اور نقاد خاصا بوڑھا ہے لیکن اُس کے ہوش سلامت ہیں۔ ڈائجسٹ کا نام ''دِل کش'' ہے اور نقاد کا نام جعفر علی ہے۔'' فرقان کے لیے نقاد کا نام کسی بھی طرح اجنبی نہیں تھا۔ فرقان نے کچھ دیر سوچا، بٹوہ نکال کر ہزار کا نوٹ راز کو دے کر اُٹھ کھڑا ہو۔

''اُستاد جی جیتے رہو۔'' اُس نے دو سو روپے مزید دیے۔

''اب رقم پوری ہو گئی ہے۔''

فرقان نے پہلے سوچا کہ وہ رسالے کے مدیر سے ملاقات کرے۔ پھر اُس نے سوچا کہ پہلے مدیر سے وقت لے لینا مناسب رہے گا اور یہ اُس کی ذاتی نوعیت کی تحقیق تھی اِس لیے اُسے کوئی جلدی بھی نہیں تھی ۔ وہ اپنے فالتو وقت میں ، جتنا بھی ممکن ہو سکے، پتا چلاتا رہے گا۔ اُسے نقاد کے گھر کا پتا معلوم تھا اور اُسے یہ بھی خبر تھی کہ وہ دِن کو کسی کے ساتھ نہیں ملتا لیکن وہ اُسے اکیلے میں ہی ملنا چاہتا تھا۔ اُس نے کسی دِن صبح کو وقت لینے کا فیصلہ کیا، وہ جانتا تھا کہ کوئی بھی دانش ور اُسے ملنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ ایک دِن وقت لے کر وہ اپنی کار میں وہاں پہنچ گیا اور اُس نے ملازم کے ہاتھ اپنا کارڈ

بھیجا۔ اُسے چند منٹوں کے اندر ہی بلا لیا گیا۔ ''معذرت سر! میں بے وقت ملاقات کے لیے چلا آیا۔ ہمیں بعض اوقات اپنے کام کے سلسلے میں کچھ فوری معلومات چاہیے ہوتی ہیں۔ میرا آج اچانک ملاقات کا تقاضا بھی اُسی کا حصہ ہے۔''

جعفر علی کو اپنا اہم ہونا پسند آیا اور اُس نے ایک شرمیلی سی مسکراہٹ میں اثبات میں سر ہلایا۔ اُسی وقت چائے آ گئی۔ فرقان نے سوچا کہ اُسے چائے کی ضرورت بھی تھی۔ ''سر! چند سال پہلے آپ کا ''دِل کش'' نامی رسالے کی طرف سے ماریہ نامی ایک لڑکی نے انٹرویو کیا تھا۔''

جعفر علی نے کچھ لمحے سوچا۔ ''آپ انٹرویو کی تفصیل مدیر کے پاس پڑی فائیلوں میں سے نکال سکتے ہیں۔''

''مجھے تفصیل نہیں چاہیے سر، اُس انٹرویو کے بارے میں کچھ سوال کرنے ہیں۔'' فرقان کو محسوس ہوا کہ جعفر علی کی آنکھوں کا تاثر تبدیل ہو گیا ہے۔ ''اگر آپ برا نہ منائیں تو آپ کو انٹرویو کے بارے میں کچھ یاد ہے؟''

جعفر حسین کے چہرے پر ایک میٹھی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''مجھے ایک دم یاد آ گیا ہے۔'' وہ ہلکا سا ہنسا۔ ''دو لڑکیاں آئی تھیں۔ اُن کے پاس کیمرہ تھا اور ایک کیسٹ ریکارڈر۔ چھوٹی عمر کی لڑکیاں تھیں۔ میٹرک میں تھیں شاید!'' جعفر علی نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ کیمرے میں بھی اِتنی ایکسپرٹ نہیں تھیں۔ وہ مکمل طور پر naive لیکن پُراعتماد تھیں۔ میں اپنی بیوی کو بھی بلا لایا۔ اُن کے سوالات میں میری تنقیدی تھیوریوں یا نظریات کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اُنھوں نے مجھے پڑھا ہوتا تو کچھ جانتیں؟ بس بات چیت ہوتی رہی، ہنسی مذاق، کبھی بیچ میں ذاتی زندگی کا کوئی سوال۔ ایک پُرلطف ملاقات تھی۔ ہم بعد میں اُن لڑکیوں کو دیر تک یاد کرتے رہے۔''

''آپ کو لڑکیاں کیسی لگی تھیں؟'' فرقان اب اکیلی ماریہ کے بارے میں نہیں پوچھنا چاہتا تھا۔

''بتا چکا ہوں۔ دل چسپ مگر naive۔''

''کوئی خاص یادگار؟''

''غیر موضوعاتی گفتگو اور بے شمار قہقہے۔ میری اطلاع کے مطابق اُس انٹرویو کو رسالے کے

قارئین نے کافی پسند کیا تھا۔ اُن کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔''

''لڑکیوں کے متعلق آپ نے بعد میں کچھ سنا؟'' فرقان کے پاس شاید سوال ختم ہو گئے تھے۔ اُسے یہ سوال اپنی نظر میں غیر اہم لگا لیکن اُس نے اپنی اہمیت بھی بنائے رکھنی تھی۔ جعفر نے ماتھے پر اُبھری ہوئی لکیروں کو سہلایا۔

''سُننے میں آیا ہے کہ اُن میں سے ایک افسانے لکھتی ہے۔ دوسری کے بارے میں مجھے کوئی اطلاع نہیں۔'' جعفر نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ فرقان مطمئن ہو گیا کہ پبلشر کی ایک بات کی تصدیق ہو گئی ہے۔ اگر جعفر علی کو ماریہ کی افسانہ نگاری کے بارے میں علم تھا تو وہ افسانہ یقیناً مناسب سے بہتر لکھتی ہو گی۔ فرقان کو مزید اطلاع کی ضرورت نہیں تھی اور وہ شکریہ ادا کر کے اُٹھ گیا۔

فرقان اخبار کی طرف سے سونپی گئی ذمے داری میں مصروف ہو گیا۔ اُسے کسی سیاسی شخصیت کے ایک سکینڈل کے بارے میں ایک کہانی بنانے کو کہا گیا تھا۔ سابقہ وزیر کا ایک مشہور ماڈل کے ساتھ تعلق رہا تھا اور حکومت اخبار کی معرفت شاید اُس پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنا چاہتی تھی۔ فرقان جس اخبار میں کام کر رہا تھا اُس کی ہمدردیاں حکومت کے ساتھ تھیں اور یہ ایک کھلا راز تھا۔ وہ ایک شام اپنے مدیر سے اِسی سلسلے میں مل کر دفتر سے باہر نکلا کہ اُسے ماریہ پر اپنی ادھوری تحقیق کا یاد آیا اور اُس نے اپنے موٹر سائیکل کا رُخ رسالے ''دِل کش'' کی طرف موڑ دیا اور وقت لیے بغیر وہاں پہنچ گیا۔ چند سال پہلے والا مدیر نہیں تھا لیکن اُسے مطلوبہ پرانے رسالے ڈھونڈ نکالنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ فرقان نے دونوں انٹرویو پڑھے، جعفر علی کی بات سے لطف اندوز ہوا کیونکہ اُن میں غیر تراشیدہ قسم کے سوالات تھے جن کا زیادہ واسطہ دونوں کی ذاتی زندگیوں اور پسند اور ناپسند سے تھا۔ فرقان دونوں شمارے خرید کر دفتر سے نکلا۔ اَب اُس نے دو باتیں اور جاننا تھیں..... ماریہ کا تعلیمی ریکارڈ اور اُس کی موجودہ مصروفیات؟ اُسے چند سال پہلے حوزے ساراموگا کا پڑھا ہوا ناول ''آل دی نیمز'' یاد آ گیا جس میں شہر کے پیدائش و اموات کے ایک کلرک کی ایک عورت کی موت کے بارے میں دل چسپی پیدا ہو گئی اور اُس نے عورت کے متعلق اطلاعات اکٹھا کرنی شروع کر دیں۔ کلرک تعلیمی ریکارڈ دیکھنے کے لیے رات کی تاریکی میں اُس سکول میں داخل ہوا جہاں وہ عورت زیرِ تعلیم رہی تھی اور اپارٹمنٹ بلڈنگ میں اُس پلنگ پر سویا جہاں وہ کبھی سوتی تھی اور اُس کے جسم کو محسوس کیا۔ اُسے اُس مری ہوئی عورت کے

ساتھ محبت ہونا شروع ہوگئی تھی۔ کیا فرقان کے ساتھ ایسا تو نہیں ہو رہا؟ کیا وہ بھی ماریہ کا تعلیمی ریکارڈ دیکھنے کی کوشش کرے؟ فرقان کو اپنی یہ سوچ مضحک لگی اور اُس نے ناپسندیدہ مسکراہٹ کے ساتھ یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔

فرقان کو جلد ہی پیشہ ورانہ مصروفیات نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سیاست دان کے سکینڈل پر تحقیق مکمل ہوئی تو فرقان کو ایک نیا پراجیکٹ مل گیا جس نے اُس کا بیشتر وقت لینا شروع کر دیا لیکن اِس تمام مصروفیت میں اُسے ماریہ کی نامکمل تحقیق یاد تھی اور اُسے وہ نظر ہمیشہ تکمیل کے لیے اُکساتی جس سے اُس نے پبلشر کے دفتر میں شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تھا اور اُس مسکراہٹ میں ایک بے دلی تھی۔ کیا وہ اُس بے دلی والی مسکراہٹ کے تعاقب میں تھا؟

اب فرقان نے اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کے دوران میں ماریہ کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا جس سے اُسے اُلجھن بھی ہوتی اور وہ لطف بھی کشید کرتا۔ اُسے اُس کلرک پر رحم آتا جو مری ہوئی عورت کے کھوج میں اپنا مستقبل داؤ پر لگائے ہوئے تھا۔ اُسے بعض اوقات محسوس ہوتا کہ کسی وقت شاید اُس کی بھی ویسی حالت نہ ہو جائے؟ یہ سوچتے ہی وہ ماریہ کو ذہن سے جھٹک تو دیتا لیکن نکال نہ پاتا۔ اِسی اُدھیڑ بُن میں اُس نے طے کرلیا کہ موجودہ تحقیق ختم کرنے کے بعد وہ پورا ایک ہفتہ ماریہ کے متعلق جاننے میں لگائے گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ یکسوئی سے اپنی تفتیش کی تکمیل کرنے میں لگ گیا۔

ایک دِن فرقان شہر کے پوش علاقے میں مشہور پلازے کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اُسے کچھ فاصلے سے سڑک پر جین، ٹی شرٹ پہنے اور کندھے پر بیگ لٹکائے ایک عورت کھڑی نظر آئی۔ اُسے شک گزرا کہ وہ عورت ماریہ تھی اور جب یوٹرن لے کر نزدیک ہوا تو اُس کا شک جاتا رہا۔ جو اُس نے دیکھا اُس پر اُسے یقین نہیں آیا۔ ماریہ کے ماتھے پر ایک روڑ بنا ہوا تھا اور اُس کے گرد کی جلد نیلی ہو چکی تھی۔ اُس کے دائیں بازو پر دو نیل تھے جیسے اُسے وہاں کسی کند دھات والی چیز سے ضربیں لگائی گئی ہوں۔ ماریہ اُسے دیکھ کر پریشان ہوئی اور پھر اگلے ہی لمحے خود کو سنبھال گئی۔ فرقان نے اُس کے یہ تاثرات ذہن نشین کر لیے۔ وہ خود ابھی تک ایک صدمے کی حالت میں تھا۔ وہاں کچھ دیر خاموشی رہی۔ فرقان نے خاموشی توڑی:

''میں رکشہ روک کر آپ کو گھر بھجواتا ہوں۔'' اُس کی آواز میں یقین کے ساتھ ساتھ جھجک بھی تھی۔

''میں اِس حالت میں گھر جاؤں گی؟'' ماریہ کی ہنسی میں تلخی تھی۔ ''میں اپنے دفتر کے گیسٹ روم میں بھی نہیں جا سکتی۔'' ماریہ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے اور بازو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ فرقان کو یقین ہو گیا کہ وہ کسی اہم دفتر میں کام کرتی ہے۔

''آپ میرے گھر چلی جائیں۔'' فرقان نے مروتاً کہا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُسے کچھ تو کہنا تھا۔

''وہاں آپ کی بیگم ہیں۔ میں کیا جواب دوں گی؟'' ماریہ نے نظر جھکاتے ہوئے کہا۔

''میں غیر شادی شدہ ہوں۔'' فرقان کے جواب سے ماریہ کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے روشنی چمکی اور پھر وہاں سے ہر تاثر جاتا رہا۔ فرقان اِس بے تاثری سے پریشان ہوا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ کو زحمت تو نہیں ہو گی؟''

فرقان جانتا تھا کہ یہ ایک رسمی قسم کا فقرہ تھا جسے اُس نے کوئی اہمیت نہ دی۔ اِن چند منٹوں میں کچھ رکشے گزر چکے تھے۔ فرقان ایک رکشہ روک کر اُسے گھر کا پتا سمجھا کر ماریہ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ ایک کمرے کا فلیٹ ہے۔ باورچی خانہ الگ ہے جس میں فرج ہے۔ اُس میں برف ہو گی جسے آپ اپنی چوٹوں پر لگائیں جس سے شاید یہ اتنی واضح نہ رہیں اور آپ گھر جا سکیں۔ اِس کے علاوہ فرج میں کھانے یا پکانے کے لیے بہت کچھ پڑا ہوا ہے۔''

''آپ سگھڑ قسم کے لگتے ہیں۔''

''نہیں! کھانا پکانے کا سامان فرج میں رکھنا میرا شوق ہے۔ مجھے پکانا نہیں آتا۔ ایک دوست ہے جو کبھی آ کر پکا جاتا ہے۔ اب آپ چلیں۔'' اُس نے پتلون کی جیب میں سے چابی ماریہ کو دیتے ہوئے کہا۔ رکشہ کے جانے کے بعد وہ کچھ پریشان بھی ہوا لیکن اُسے تسلی بھی ہوئی کہ پبلشر ماریہ اور اُس کی دوست کو جانتا ہے۔ وہ ماریہ کی چوٹوں کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنے کام پر چل پڑا۔ فرقان کو لگ رہا تھا کہ کسی نے ماریہ کا ماتھا دیوار کے ساتھ مارا تھا اور بازو پر دھات کے فٹ رولر یا چھڑی کے ساتھ ضربیں لگائی تھیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ گر پڑی ہو۔ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا اور

یہی سوچتے ہوئے اپنے دو خفیہ رابطوں سے ملا جنھیں وہ پریشان لگا۔ اُس کے اندر کے صحافی نے اُسے پبلشر کے پاس بھیجا۔ پبلشر اُس کی کتابیں ہر قیمت پر چھاپنا چاہتا تھا، اُس نے یہ بھی بتایا کہ ماریہ اُس سے اپنے افسانوں کا مجموعہ چھپوانا چاہتی ہے۔ یہ سُن کر فرقان نے بھی اپنی کتابیں اُس سے چھپوانے کی حامی بھرلی۔

فرقان جب اپنے گھر پہنچا تو وہ کسی حد تک مطمئن تھا۔ اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو کچھ دیر کے بعد ماریہ نے کھولا۔ کمرے میں سے تازہ کھانے اور سگریٹ کی خوشبو آ رہی تھی۔ اُسے ایک شک گزرا اور جب کمرے میں داخل ہوا تو یقین ہو گیا۔ ماریہ سگریٹ پیتی تھی۔ اُس نے ماریہ کے چہرے کو دیکھا، ماتھا سوجا ہوا تھا لیکن نیل کم ہو گیا تھا اور بازو پر بھی کچھ ایسے ہی تھا۔

''چوٹیں کافی بہتر ہو گئی ہیں۔''

''جی ہاں۔ لیکن اتنی نہیں کہ میں گھر جا سکوں۔ میں نے گھر بتا دیا ہے کہ مجھے دفتری کام کے سلسلے میں وہاں گیسٹ روم میں ہی رہنا ہے۔ ویسے میں کئی بار گیسٹ روم میں ٹھہر چکی ہوں۔'' ماریہ نے صفائی دینے کے انداز میں بات کی۔ فرقان کی دل چسپی اُس کی چوٹ میں تھی کہ لگی کیسے؟ واضح تھا کہ اُس پر تشدد کیا گیا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا اور نہیں بھی۔ اب جب ماریہ اُس کے گھر میں موجود تھی، اُس کا تجسس جاتا رہا تھا۔

''میں نے رات کے لیے کھانا بنا لیا ہے۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ آپ فریش ہوں لیں۔'' ماریہ کا رویہ اور اعتماد اُسے بیوی والا لگا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ ماریہ شادی شدہ ہے۔ ماریہ جب چائے لائی تو وہ ڈھیلی سی شلوار قمیص میں ملبوس اُس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

''میں اپنے سائز سے کھلا شب خوابی کا لباس پہنتا ہوں۔'' اُسے بھی اپنائیت کی طرف بات بڑھتی اچھی لگی۔

''آپ پر جچ رہا ہے۔'' ماریہ نے اپنائیت بھری تعریف کی۔

کمرے میں ایک کرسی تھی جس پر فرقان بیٹھ گیا اور ماریہ پلنگ پر چوکڑی لگا کر۔ ''ہم چند دوست کبھی کبھار اکٹھے ہوتے ہیں۔ میں تو یہاں ہی بیٹھتا ہوں وہ پلنگ پر ٹیک لگا کے اور ایک آدھ آپ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔''

''دوستوں کے ساتھ یہی مزا ہوتا ہے۔'' ماریہ نے تکیے کے نیچے سے اپنی ڈبیہ نکال کر سگریٹ سلگالیا۔ فرقان نے محسوس کیا کہ اُسے سگریٹ سلگاتے ہوئے کسی قسم کی جھجک نہیں تھی۔ اُسے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں واسطہ پڑنے والی وہ امیرزادیاں یاد آ گئیں جو متواتر سگریٹ پیتی تھیں۔ چائے خاموشی میں پی گئی۔ فرقان اُلجھن میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ماریہ رات وہیں رہے اور یہ بھی خیال آتا کہ اُسے جس نے بھی تشدد کا نشانہ بنایا ہے کہیں اُس کے کھوج میں نہ ہو اور یہ تجسس بھی کہ تشدد کیوں کیا گیا؟ فرقان نے اپنی کھلی قمیص کی جیب میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا تو ماریہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

فرقان بھی اُس قہقہے میں شامل ہوگیا اور اُس نے پہلی بار خود کو آرام سے محسوس کیا۔

''مجھے کھچاؤ پسند نہیں۔ آپ کے قہقہے نے میرا کھچاؤ ختم کر دیا ہے۔''

''میرے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ مجھے ہر وقت کھچاؤ میں رہنا پڑتا ہے۔ میں جب کھچاؤ میں نہیں ہوتا تو مجھے عجیب سا لگتا ہے، جیسے اب۔'' یہ بات سن کر ماریہ ہلکا سا مسکرائی۔ فرقان نے سوچا کہ حوزے ساراموگا کے ناول میں کلرک ایک مری ہوئی عورت کے کھوج میں تھا جب کہ وہ جس عورت پر ایک طرح کی نامکمل تحقیق کر چکا تھا، اُس کے سامنے تھی۔ عورت اُس کے گھر میں ایسے بیٹھی تھی کہ اُس کا اپنا گھر ہو اور وہ کسی اجنبی کی طرح جھجک رہا تھا۔

''آپ شادی شدہ ہیں؟'' ماریہ نے تیزی کے ساتھ فرقان کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں حیرانی کے بعد ایک اُداسی پھیل گئی جس پر وہ فوراً قابو پا گئی۔ وہ اپنایت سے مسکرانے لگی۔

''ہاں!'' اُس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

''بچے؟'' فرقان نے بھی سگریٹ سلگالیا۔

''نہیں۔'' اب فرقان کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

''بانجھ ہوں۔'' ماریہ کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ میں بے دلی تھی۔ فرقان نے ایک لمبی سانس لے کر کش لیا۔ کچھ دیر پہلے والا خوش دل ماحول ایک دم عنقا ہوگیا۔ فرقان کو اگلا سوال نہیں سوجھ رہا تھا۔ ''تھی نہیں۔ ایک پیچیدگی ایسی بنی کہ پورا نظام نکال دیا گیا۔'' ماریہ کچھ دیر اپنے سگریٹ سے نکلتے دھوئیں کو دیکھتی رہی۔

فرقان اپنی افسردگی پر قابو پا چکا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے اندر کے صحافی نے انگڑائی

لیتے ہوئے آنکھیں کھول لی ہیں۔ ''آپ کے خاوند کا کیا ردِعمل تھا۔''

''وہ شوگر کا مریض ہے۔ ایک طرح سے....'' وہ رُکی، جھجکی اور پھر بات جاری رکھی، ''اپنی ہی کسی سنیاسیوں والی دنیا میں گم۔'' ماریہ نے ماتھے پر روڑ سہلایا۔

''تعلیم یافتہ ہیں؟'' فرقان اپنے ذہن میں سوال ترتیب دے رہا تھا۔ ماریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ کی رہائش کہاں ہیں؟'' فرقان زیادہ متجسس نظر نہیں آنا چاہتا تھا۔ اُسے سوالات ختم کرنے میں بھی دل چسپی نہیں تھی۔

''کچھ فاصلے پر ایک نئی کالونی بن رہی ہے۔ وہاں پر ہمارا گھر ہے۔'' فرقان اُس کالونی میں کئی مرتبہ گیا تھا۔ وہاں دوسرے شہروں سے آئے ہوئے امیر گھرانے آباد تھے۔

''آپ نے اُس دِن پبلشر کے ہاں بتایا تھا کہ آپ نے کسی اخبار کے لیے دو انٹرویو کیے تھے؟ اب بھی آپ صحافت سے وابستہ ہیں؟''

''وہ اخبار نہیں، ایک پاپولر رسالہ تھا۔ میں میٹرک میں پڑھتی تھی تب۔ اُس رسالے کے لیے کیے تھے۔'' وہ رُکی۔ ''میں نے پبلشر کو اپنی کتاب چھاپنے کا کہہ دیا ہے۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ آپ بھی وہاں سے چھپوانا چاہتے ہیں۔'' وہ رُکی۔ ''صد شکر کہ صحافی نہیں ہوں۔'' دونوں نے قہقہہ لگایا۔

''میں نے بھی اُسے ہاں کر دی ہے کہ اُس نے بتایا تھا کہ آپ اُس کے ہاں سے چھپوا رہی ہیں۔'' فرقان اپنایت سے مسکرایا۔ ''آپ کون سے سکول اور کالج میں پڑھتی رہیں؟''

''کونوینٹ سکول سے سینیئر کیمبرج کیا پھر گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں ایم اے۔ لیکن میں لکھتی اُردو میں ہوں۔'' وہ ہنسی۔ اُس کی ہنسی میں شرارت تھی۔ ''پہلے دِن سے ہاسٹل میں رہی اور یہ وہاں کی نشانی ہے۔'' اُس نے سگریٹ کی ڈبیہ کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ کوئی نوکری کر رہی ہیں؟'' فرقان کریدے جا رہا تھا۔ اُس نے ماریہ کے مزاج پر بھی نظر رکھی ہوئی تھی کہ برہمی آتے ہی موضوع بدل دے گا۔

''ہم تقریباً ہم عمر ہی ہیں۔ یہ کیا آپ آپ کر رہے ہیں۔ مجھے تم اور تو کہو۔'' ماریہ مسکرائی اور فرقان قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ''مجھے اپنا موبائل نمبر دو تا کہ تمھیں ایک کال کرلوں۔'' موبائل فون کے نمبر

محفوظ کرنے کے بعد ماریہ نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔''میں ایک ایڈورٹائزنگ فرم میں کام کرتی ہوں۔ کافی بڑی فرم ہے۔''

''تم یا تو پرانے شہر کے ہو اور یا پھر کہیں باہر سے آئے ہو۔ میں نے اِس لیے اندازہ لگایا کہ تم یہاں اکیلے رہ رہے ہو۔''

''میں تمھاری طرح باہر سے آیا ہوں۔''

''دونوں ہی پردیسی ہوئے۔'' اور دونوں نے قہقہہ لگایا۔

''میرے والدین گزارے والے زمین دار تھے۔ میں پڑھ گیا اور شہر کو اپنا بسیرا بنالیا۔ یہ گھر میرا اپنا ہے، میرے پاس کار بھی ہے۔ موٹر سائیکل پسند نہیں لیکن پیشہ ورانہ سہولت کے لیے رکھا ہوا ہے۔'' فرقان اپنے بارے میں وہ سب بتا گیا جو اُس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔

''میرے گھر والے بڑے زمین دار ہیں۔'' ماریہ نے بازو پھیلا کر بڑے کا اشارہ کیا۔

''ہمارے ہاں سخت پردہ ہے۔ میں نے ہی بغاوت کی ہے۔ خاوند کے ساتھ بس رہی ہوتی تو شاید چادر میں ڈھکی ہوتی۔'' اُس نے بازو سکیڑ کر خود کو چادر سے ڈھک لیا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ فرقان بھی قہقہے میں شامل ہو گیا۔ ''ایک بات بتاؤں؟ یہ میں نے کم لوگوں کو بتائی ہے۔ مجھے اپنے خاوند سے محبت ہے۔ ایک اور بات بھی...... مجھے جو پسند آجائے، میں اُس کے ساتھ نہیں رہتی۔'' فرقان کو اچانک ماریہ سے ہمدردی ہو گئی اور اُس نے تفتیشی سوالات نہ پوچھنے کا فیصلہ کر لیا۔ ماریہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ فرقان کو اُس کا ایسے دیکھنا اچھا لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ ماریہ بولنا بند کر کے اُسے خاموشی کے ساتھ ایسے ہی دیکھتی جائے۔ ''مجھے وہ اچھا لگتا ہے لیکن میں اُس کے ساتھ نہیں رہ رہی۔'' ماریہ نے ایک لمبی سانس لی۔ وہاں کچھ دیر کے لیے خاموشی ہو گئی اور کمرے کا دوستانہ ماحول ایک دم بھاری ہو گیا۔ فرقان نے سوچا کہ وہ کیا بات کرے؟ ماریہ نے سگریٹ سلگایا اور ہلکا سا مسکرائی۔ فرقان کو ایک دم بھوک کا احساس ہوا۔ وہ باورچی خانے میں جا کر فرج سے پانی کی بوتل اور دو گلاس لے آیا۔ وہ جانتا تھا کہ پانی بھوک کا تدارک نہیں؛ شاید یہ کسی قسم کا ردِعمل تھا۔ اُس نے اپنا گلاس پانی سے بھرا اور ایک ہی ڈیک میں خالی کر گیا۔ ماریہ دل چسپی سے اُسے دیکھتی رہی۔

''سنو؟'' فرقان اپنے خیالات سے نکلا۔

''ہاں!''

''کھانے سے پہلے ایک چھوٹی سی ڈرائیو نہ کرلیں؟''

فرقان کو اپنی بھوک کا احساس اچانک زائل ہوتے محسوس ہوا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ماریہ نے اپنا سگریٹ بجھایا۔ وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی اور پھر اُس نے اپنا بیگ اُٹھالیا۔

وہ جب کار میں بیٹھے تو ماریہ نے ایک لمبی سانس لی۔ ''مجھے دوستوں کے ساتھ چھوٹی کار میں بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ دوری کا احساس نہیں ہوتا۔'' یہ کہتے ہوئے ماریہ نے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ فرقان عورتوں کے لمس سے نا آشنا نہیں تھا لیکن ماریہ کے ہاتھ کی حدت نے اُسے ایک نیا احساس دیا۔ وہ کچھ دیر سڑکوں پر ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ ماریہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر خاموش بیٹھی رہی۔ خاموشی اور لمس فرقان کے اندر کبھی خلا پیدا کر رہے تھے اور کبھی ختم۔

''ایک کام کرو؟''

''جو بھی کہو۔''

''مجھے وہاں اُتار دو جہاں سے اُٹھایا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے ماریہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اب فرقان کو لمس کے بغیر خاموشی بھاری لگنے لگی اور سانس بھی رُکتے ہوئے محسوس ہوئی۔ وہ تھکا ہوا محسوس کرنے لگا۔ اُس نے ماریہ کو وہیں اُتارا جہاں سے رکشہ میں بٹھایا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر اُتر گئی۔ فرقان سامنے دیکھتے ہوئے کچھ دیر رکا اور پھر چل پڑا۔ وہ اپنے دماغ میں شام کی چلی ہوئی فلم دیکھتے ہوئے دھیمی رفتار سے جا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اُس کے موبائیل فون پر میسج کی تھرتھراہٹ ہوئی۔ اُس نے کار ایک طرف کر کے میسج کھولا: ''میں اُس پبلشر سے کتاب نہیں چھپوا رہی۔'' فرقان نے ردِعمل کے طور اُس کا نمبر ملایا۔ اُسے بلاک کر دیا گیا تھا۔ اُس کے تفتیشی تجربے نے بتایا کہ سم بھی تبدیل کر دی گئی ہوگی!

دیواروں کے راز

گھروں کی دیوریں اتنی اونچی تھیں کہ ایک گھر سے دوسرے میں آسانی کے ساتھ جھانکا جا سکتا تھا۔ اِن گھروں کے راز بظاہر اپنے اپنے صحن تک محدود تھے لیکن ساتھ والا گھر اُن رازوں سے اتنا ہی باخبر تھا جتنا پہلے گھر کے افراد۔ ہر گھر میں دو کمرے تھے، اُن کے سامنے ایک چھوٹا سا صحن جس کے ایک طرف ڈھارے کی طرز کا باورچی خانہ تو دوسری طرف بظاہر ایک عارضی لیکن مستقل غسل خانہ جس کی چھت گھاس پھوس کی اور دیواریں پکی اینٹوں کی تھیں جن کی چنائی گارے سے کی گئی تھی۔ محمد دین کا گھر بھی ایسے گھروں میں سے ایک تھا۔ اُس نے یہ گھر اردگرد کے لوگوں کی بنائی ہوئی کالونی میں اُسی طرح بنالیا تھا جس طرح سب نے بنائے تھے۔ یہ سرکاری زمین کا ایک قطعہ تھا جس پر سب سے پہلے امرود بیچنے والے کی ایک ریڑھی لگی۔ اِس قطعے کے گرد تھوڑے تھوڑے فاصلے پر امرودوں کے چند باغ تھے جہاں سے وہ ریڑھی والا رات کے زمین پر گرے ہوئے امرود منت سماجت کر کے اور پیسے دے کے تھوڑے سے تازہ ریڑھی پر سجا کے اُس قطعے پر لگا دیتا۔ سامنے سے جی ٹی روڈ گزرتی تھی اور کبھی کوئی امرود کھانے کی شوقین عورت وہاں کار رکوا کر امرود خریدتی تو اُس کی تقلید میں اور کاریں بھی رُک جاتیں۔ کچھ عرصے کے بعد اُس نے وہاں ایک جھونپڑی بنالی جس کے اندر امرود بیچنے کے بعد وہ ریڑھی کھڑی کرتا اور خود سڑک پر مزدوری کرنے والے کسی گینگ میں شامل ہو جاتا۔ ایک دِن وہ ایک بڑی کڑا[illegible]، بیسن، مصالحے، استعمال کیا ہوا گھی، سٹین لیس سٹیل کی چند پلیٹیں، ایک ٹب اور اپنی بیوی لے

کر وہاں پہنچ گیا؛ اب امرودوں کے ساتھ پکوڑے بھی بکنے لگے۔ پھر اُس نے جھونپڑی سے ذرا ہٹ کر ایک دو کمروں والا مکان بنالیا۔ ریڑھی والے کی بیوی نے گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے بھائی کو پیغام بھیجا کہ وہ واپس جاتی سڑک پر سامنے امرودوں کی ریڑھی لگانا شروع کر دے۔ چناں چہ ریڑھی والے کے گھر کے ساتھ، اُسی نقشے کا ایک اور گھر بن گیا اور گھروں کے راز، چھوٹی دیواروں کے اوپر سے باہر نکل کر، مشترک ہونا شروع ہو گئے۔

ایک دِن محمد دین کا وہاں سے گزر ہوا۔ اُس نے اِس کالونی کا چکر لگایا تو اُسے کچھ مشکوک سا لگا۔ وہ جہاں سے آیا تھا وہاں ہر چیز ہی مشکوک تھی اور اُس کی شک کو سونگھنے کی حس بہت تیز تھی۔ وہ اُس گاؤں سے اُٹھ کر آیا تھا جہاں ایک ہی گھر امیر تھا اور باقی کسی کو کمائی کرنے کی اجازت نہیں تھی کیوں کہ کوئی اگر ایسے کرے تو چند سکے اُس کی جیب میں آسکتے ہیں جو اُس کے مزاج اور رویے کی تبدیلی کا سبب بن سکتے ہیں۔ وہاں ہر کوئی اِسی کھوج میں رہتا کہ پتا چلا سکے کہ کس کی جیب میں چند سکے ہیں! وہ سکے دراصل اُس واحد امیر کے پاس ہی ہونے چاہئیں تھے۔ محمد دین وہاں ایک خوف کے بوجھ تلے دبا زندگی گزار رہا تھا۔ اُس کے پاس کبھی پیسے نہیں ہوئے تھے، وہ اپنی جیب میں ہلکے ہلکے نوٹوں کا وزن محسوس کرنا چاہتا تھا لیکن پیسے جیب میں رکھنے کا اُسے اختیار نہیں تھا۔ ایک دن اُس امیر آدمی کا باپ فوت ہو گیا اور پورے گاؤں میں صف ماتم بچھ گئی۔ لوگوں کے اندر خوشی سے بھر گئے لیکن وہ دھاڑیں مار مار کر یہی ظاہر کر رہے تھے کہ مرحوم کی سخاوت سے محرومی کے بعد یتیم ہو کر رہ گئے تھے۔ جب ہر کوئی مرحوم کے دُکھ میں اپنے آپ کو مارے جا رہا تھا، محمد دین اپنی بیوی کو لے وہاں سے نکل آیا اور پہلے امرود والے کی ریڑھی کے پاس اُس نے گداگری کا اپنا ایک اڈا بنالیا۔ غربت چہرے پر نقش ہونے کی وجہ سے اُسے اداکاری کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور اُس کی بیوی کی خوب صورتی اُن کی غربت کو اور بھی نمایاں کر رہی تھی۔

کاروں والوں کی توجہ اب پکوڑوں اور باسی امرودوں پر اُتنی نہ رہی اور چند اوباش قسم کے نوجوان وہاں شام کو بھی آنے لگے اور محمد دین کی بیوی اُن کی محفلوں میں شریک ہونے لگی۔ وہ اُن لوگوں کے ساتھ بیٹھتی، اُن کے فحش مذاق پر دِل کھول کر ہنستی اور اگر کوئی اُسے چھو دیتا یا کہیں سے دبا دیتا تو برا نہ مانتی۔ محمد دین کی بیوی نے جس کا نام فضلاں تھا، اپنے انداز اُنہی عورتوں جیسے کرنا شروع کر دیے جو

امرود خریدنے کے لیے رکتی تھیں۔ وہ کسی نہ کسی آدمی کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوتی اور اگر اصرار کیا جاتا تو ایک آدھ گھونٹ بھی پی جاتی۔

محمد دین یہ سب دل چسپی، نفرت، اُمید اور کبھی کبھی بے زاری کے ساتھ دیکھتا۔ اُسے فضلاں بہت پسند تھی اور وہ جانتا تھا کہ وہ ایک ذریعہ ہونے کے ساتھ اُس کا سہارا بھی تھی۔ محمد دین اُس کی دل چسپی، کھیل، ضرورت اور مجبوری کو جانتا تھا کیوں کہ دونوں کی مجبوری سانجھی تھی اور وہ کوئی عہد کیے بغیر ہر قیمت پر غربت سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ وہ رات کو ایک معاہدے کے تحت پہلے ریڑھی والے کی جھونپڑی میں سوتے تھے جس کے بدلے میں کڑاہی اور دوسرے برتن دھوتے۔ رات جب سب چلے جاتے، جی ٹی روڈ پر ٹرکوں اور بڑے بڑے ٹرالوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا تو وہ ایک بے سہارا عورت کی طرح محمد دین کا سہارا بن کر اُس کے ساتھ چمٹ کر سو جاتی۔

ابھی اُس بستی میں چند گھر ہی بسے تھے کہ ایک دن محمد دین وہاں چکر لگانے چلا گیا۔ اُسے وہاں ایک طرح کا خوف محسوس ہوا، ویسا خوف نہیں جو اُس کے گاؤں میں ہوتا تھا، یہ خوف اپنے اندر ایک اسرار اور گمبھیرتا لیے ہوئے تھا۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ دیواروں کی طرح سے جُڑے تو ہوئے تھے لیکن کسی کو کسی کے ساتھ ہمدردی نہیں تھی اور ہمدردی کی یہی کمی اُس کو بہت اہم لگی۔ اُس نے سوچا کہ وہ ایسے لوگوں میں رہتے ہوئے ہی اپنی جیب کو ہلکے ہلکے نوٹوں سے بھاری کر سکے گا۔

چناں چہ اُس نے بھی باقی لوگوں کی طرح وہاں اپنا گھر بنانے کا فیصلہ کر لیا!

گھر بنانے کے لیے پیسے چاہیے ہوتے ہیں اور اُن کے پاس تو بھیک کے چند روپے تھے جو بمشکل دو دن کا کھانا ہی پورا کر سکتے تھے۔ وہ سارا سارا دن گھروں کے چکر لگاتا رہتا۔ اُسے پتا چلا کہ یہ گھر کسی رقم کے بغیر ہی بنے ہیں، گارا بنانے کے لیے باغ کے اُس طرف ٹریکٹر مٹی نکال کر شہر کی طرف لے جا رہے تھے۔ اُس کے لیے شاید ایک ٹرالی ہی کافی تھی۔ وہ مٹی بکتی تھی اور اُس کے پاس دینے کو پیسے نہیں تھے، صرف فضلاں تھی۔

شام کو مشٹنڈے قسم کے لوگ مسلسل اُن کے بھیک مانگنے کے اڈے پر آتے اور وہاں کچھ دیر محفل جمتی۔ وہ بے فکری کے چند گھنٹے تھے جن میں فضلاں دل کھول کر ہنستی، اُن کو اپنے ساتھ چمٹاتے ہوئے کبھی بہکنے لگتی تو دور اندھیرے میں کھڑا محمد دین اُسے نظر آ جاتا اور ایک دم سرد پڑ جاتی۔ وہ یہاں

اپنی زندگی سے اگر مطمئن نہیں تھی تو ناخوش بھی نہیں تھی۔ ایک رات جب سب چلے گئے اور وہ محمد دین کی ٹانگوں پر ٹانگ رکھے لیٹی ہوئی تھی تو ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی:

''ہم مانگنے کا کھارہے ہیں لیکن کوئی خوف نہیں ہے اِس جگہ۔'' اُس نے کسی قدر جوش کے ساتھ کہا۔ ''وہاں مالک کے ڈنڈے کا ڈر دل سے نکلتا ہی نہیں تھا اور یہاں یہ کتنے اچھے لوگ ہیں۔ وہ بھی ہماری طرح ہی ہیں۔ یہ ہر شام سائیکلوں پر اور کچھ پیدل آتے ہیں۔''

محمد دین اُسی طرح سیدھا لیٹا رہا۔ ''فائدہ کیا ہوا؟ میں یہاں گھر بنانا چاہتا ہوں جس کے لیے پیسے چاہئیں جو ہمیں یہ جگتی نہیں دے سکتے۔'' پھر اُس نے ایک لمبی سانس لی، ''میں نے سب خبر لے لی ہے۔'' یہ بستی کاغذوں میں نہیں، جہاں جس کا جی چاہے گھر بنا لے۔ اِتنی چھت تو گاؤں میں بھی نہیں تھی؟''

''وہاں تو صرف ظلم تھا۔ ہم تو مرضی سے کچھ کھا بھی نہیں سکتے تھے۔'' وہ افسردہ سی پھر لیٹ گئی، اُسے لگا کہ صبح کی ہوا سے اُڑتی ہوئی دُھدل پر گندا پانی پڑ گیا ہے۔ ''شاید کوئی سبب بن جائے۔''

''اِن لوگوں میں ٹریکٹر ڈرائیور کوئی نہیں ہے؟'' محمد دین نے ذرا احتیاط سی آواز میں پوچھا۔

''کیوں؟'' فضلاں کو محمد دین کسی طرف لے جاتے ہوئے محسوس ہوا۔ وہ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُسے محمد دین کے اندر کا شک جاگتے ہوئے محسوس ہوا۔

''باغ کے پار ٹریکٹر ٹرالیاں مٹی پر لگی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی ڈرائیور ہے تو وہ کوئی چکر کر کے ایک ٹرالی یہاں خالی کر سکتا ہے۔ اِسی طرح بعد میں اینٹوں کا بھی کچھ ہو ہی جائے گا۔''

''میں پتا کروں گی ویسے یہ سب بے روزگار لوگ ہیں۔''

''اسی لیے جگتی بھی ہیں۔'' محمد دین نے ایسے لہجے میں کہا کہ فضلاں کو طعنہ دے رہا ہو۔

ایک شام محفل اپنے رنگ پر تھی کہ وہ سب روشنی میں نہا گئے۔ ایک کار اُن سے تھوڑے فاصلے پر آ کر رکی۔ کار میں دو آدمی اور ایک عورت تھی، وہ فضلاں کو لینے آئے تھے۔ بھاری اور سیاہ رنگت والا آدمی کار سے باہر نکلا۔ فضلاں اُسے پہچانتی تھی۔ وہ کبھی کبھار اڈے پر آ کر رکتا تھا اور فضلاں کو ہمیشہ دس روپے کا نوٹ دے کر جاتا۔ فضلاں اُسے دیکھ کر کچھ خوش اور کچھ بے یقینی کے ساتھ اُس کی طرف بڑھی۔ آدمی نے اُسے کچھ نوٹ دیے جنھیں وہ گن نہیں سکی اور اُس نے اپنی مٹھی میں بند کر لیے۔

''دو گھنٹوں کے لیے ہمارے ساتھ چلو۔دریا تک جانا ہے۔۔'' آدمی نے کسی قدر اطمینان، جیسے وہ اِس طرح باتیں کرنے کا عادی ہو اور کسی قدر رعب دار آواز میں جیسے وہ وہاں سب کو دباؤ میں رکھنا چاہتا ہو، کہا۔فضلاں نے فوراً مڑکر اندھیرے میں محمد دین کو نظروں سے کھوجا، وہ اُسے نظر نہ آتے ہوئے بھی نظر آ گیا اور اُس نے گہرے اندھیرے میں محمد دین کے اثبات میں ہلتے ہوئے سر کو دیکھ لیا۔

کار پورے دو گھنٹوں کے بعد اُسے وہاں اُتار کر چلی گئی!

منڈلی ابھی تک وہیں تھی۔وہ خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔اُنھیں لگ رہا تھا کہ اُن کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے،، وہ پریشان، پشیمان، بجھے بجھے سے، کچھ ناراض سے اور کچھ بے یقین سے اُسے آتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔وہ اُس کی چال میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھنا چاہتے تھے پھر بھی اُن کی نظر کسی تبدیلی کو تلاش رہی تھی۔اُنھیں ایسے لگا کہ اُس میں کوئی تبدیلی نہیں لیکن وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔فضلاں اُن کی طرف ایسے آئی جو اُس کا معمول تھا، جیسے وہاں کے شور میں سے کسی کو بتائے بغیر ،چپکے سے اُٹھ کر، جھاڑیوں کے پیچھے چلی گئی ہو۔وہ اپنی قمیص کو سیدھی کرتے ہوئے اُن کی طرف آئی اور پھر ایک لمحے کے سوویں حصے میں ہی وہاں کے ماحول کے بوجھ نے اُس کی گردن جھکا دی اور وہ اپنی جھونپڑی کی طرف چل دی۔

محمد دین چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔

''تمھیں وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔'' اُس کے لہجے میں شکائیت کے اندر چھپا غصہ بھی تھا۔فضلاں گھبرا گئی۔

''کہاں؟'' اُس نے بغیر سوچے فوراً پوچھا۔

''وہاں سے آنے کے بعد جگتیوں کے پاس۔'' فضلاں کو لگا کہ وہ ایک بھاری پتھر کے نیچے سے نکل آئی ہے۔اُس نے اپنے پھیپھڑوں میں سے ایک سکون بھری لمبی سانس کو نکلنے سے پہلے ہی فوراً روک لیا۔اُس نے انگیا میں ہاتھ ڈال کر مُٹھی بھر نوٹ نکال کر محمد دین کو دیے اور روز کی طرح اُس کی ٹانگوں پر ٹانگ رکھ کر لیٹ گئی۔

''مجھے تو اتنے نوٹ گننے بھی نہیں آتے۔'' محمد دین نے بوکھلاہٹ سے کہا۔وہ اپنے آپ

کے اندر ہی کچھ اُلجھا ہوا تھا۔ محمد دین پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اُن لوگوں کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہوئی کہ نہیں ؟ اُن میں اور اُس میں کوئی فرق تھا ؟ وہ دونوں رشتے نبھا سکے گی ؟ وہ اُس سے دور تو نہیں ہو جائے گی ؟

''تم رکھو، گننا بھی آجائے گا۔'' فضلاں نے مجبوری کو سمجھتے ہوئے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔

''دینے والا تو اوپر ہے لیکن یہ'' وہ تھورا جھجکا، شرمایا اور پھر اپنی طرف سے کار والے کی طرف اشارہ کر کے بات پوری کر گیا، ''ہمیں نوٹ دینے کے بجائے گھر بنا دے۔'' پھر وہ خاموش ہو گیا، وہ نوٹ جیب میں ڈال لینے کے باوجود بے یقین سا تھا۔ فضلاں جواب دینے کے بجائے اُس کی بغل میں منہ دے کر سو گئی۔

محمد دین کی پسند کی ہوئی جگہ پر گھر بننا شروع ہو گیا، یہ گھر اپنے اردگرد کے گھروں میں سے ایک تھا۔ وہاں اُن کی پہلی رات بارش ہوتی رہی اور وہ دہلیز پر بیٹھے بیٹھے سے شور سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

''پھجو ! کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ ہمارا اپنا گھر ہوگا۔'' محمد دین نے ایک طرح سے اُس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اُس کو ساتھ لگا لیا۔ محمد دین اب بستی کے گھروں کی قیمتوں کا پتا چلاتا رہتا، جب کہ فضلاں پہلے والی باقاعدگی سے اپنے اڈے پر جا کر بھیک مانگتی اور سورج غروب ہونے کے بعد امرود فروش کے پکوڑوں والے برتن بھی دھوتی۔ وہاں ہر شام اب بھی منڈلی لگتی لیکن فضلاں نے جانا بند کر دیا تھا۔ وہ فضلاں کو جب کبھی دیکھتے تو کھچاؤ کا شکار ہو جاتے۔ وہ اُس کی شمولیت کے متمنی ہونے کے ساتھ ساتھ اُسے ایک ناپسندیدہ شخصیت بھی سمجھتے تھے۔ وہ اُنھیں پسند نہیں تھی لیکن انھوں نے اُس کی برائی کبھی نہیں کی تھی، وہ شاید اُس کی مجبوری سمجھتے تھے، شاید سب کی ایک ہی مجبوری تھی۔ وہ سفر تو کرنا چاہتے تھے لیکن پہلے قدم کے آخری بن جانے سے خائف تھے۔

''بجلی نہیں ہے، اُس کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔'' محمد دین نے ٹانگوں پر تہہ بند درست کرتے ہوئے کہا۔

''پوری بستی میں بجلی نہیں ہے اور نہ ہی آسکتی ہے، تو ہمارے گھر میں کیسے آئے گی ؟'' فضلاں نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

''تم تو کام پر چلی جاتی ہو اور میں جاسوسی کرتا رہتا ہوں۔ تھوڑے فاصلے پر، سڑک کے پار ہماری طرح کی ایک بستی ہے جہاں بجلی ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے،'' محمد دین رکا، اُس نے اپنا گلا صاف کیا، ''وہ جو صاحب ہے نا، وہ بجلی کا افسر ہے، وہاں بھی اُس نے ہی بجلی لگوائی تھی۔'' یہ پہلا موقع تھا کہ محمد دین نے اُس آدمی کے متعلق ایسے بات کی تھی۔ وہ بھی اُسے بتانا چاہتی تھی کہ اُس آدمی کو ایسی ان پڑھ عورتیں پسند تھیں جو غریب ہوں اور وہ اُن کی مدد کر کے اُنھیں اپنے پیروں پر کھڑا کر سکے۔ اُسے یہ بتانے میں جھجک تھی لیکن اُس نے اگلی بات بتا دی:

''صاحب کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس میں اُس کے نام پر حرف آئے،'' محمد دین کی طرح وہ بھی جھجکی، سر کھجلا اور اپنی ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے اُس نے اپنے آپ کو اعتماد سے محسوس کیا۔ ''اِسی لیے وہ رات کو آتا ہے۔''

وہ محمد دین کے سامنے اپنے تعلق کا اعتراف کرنا چاہتی تھی، اگر محمد دین نے اُسے صاحب سے ملنے کی اجازت دے رکھی تھی تو وہ سوچتی رہتی کہ اُس کا بھی فرض تھا کہ وہ اُس کو سچ بتائے لیکن اُس میں سچ بتانے کا حوصلہ نہیں تھا، زہرخند کے ساتھ سوچتی کہ وہ محمد دین کے پاس سے اُٹھ کر چلی تو جاتی ہے لیکن اُسے بتانے سے ڈرتی ہے۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ محمد دین نے کسی بھی حالت میں غصہ یا ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرنا تھا۔

''تم کوشش کر لو۔ کوئی حرج نہیں ہے۔'' اب اُن کے درمیان میں سے پردے کی چادر ہٹ گئی تھی، اور محمد دین کو اُس کی برہنگی سے کوئی اُلجھن نہیں تھی۔ محمد دین نے اُسے پیغام دیا تھا کہ وہ خوب موج کرے! کیا وہ جانا ترک کر دے؟ نہیں، اُس کے لیے وہاں جانا ایک فرار تھا۔ ''میں تو دو سے تین گھنٹوں کی چھٹی پر جاتی ہوں۔ بچے بھی سکول سے چھٹی ہونے پر گھر جاتے ہوئے کھیلتے ہیں۔ میں نے خود بچوں کو میدان میں بستے رکھ کر کھیلتے ہوئے دیکھا ہے اور پھر بچوں کے کسی بزرگ کو اُن کی پٹائی کرتے ہوئے بھی۔ لیکن محمد دین نے مجھے اور طرح سے کھیلنے کی اجازت دے رکھی تھی۔'' پھر اُسے خیال آتا کہ محمد دین نے یہ کیوں کیا؟ محمد دین میں کوئی کمی، نقص یا خرابی تو تھی نہیں۔ کہیں وہ ایسے تو نہیں سوچ رہا کہ وہ زیادہ کی حق دار تھی؟ جب اُسے گاؤں میں کبھی بڑے آدمی کے گھر جانا ہوتا تھا تو واپسی ہونے پر ایسے سوال پوچھتا جیسے اُس کے وہاں جانے کو شک کی نظر سے دیکھ رہا ہو لیکن یہاں صاحب سے اُس کی

معرفت فرمائشیں کر رہا تھا؟ کیا گاؤں میں اُسے بڑے آدمی سے بھلائی کی کوئی توقع نہیں تھی کیوں کہ وہ صدیوں سے اپنے کام کرنے والوں کے کسی طرح سے بھی کام نہیں آ رہے تھے یا اُسے صاحب پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اُس کا بستہ خود سنبھال کر اُسے کھیلنے کی اجازت دے دیتا ا

''ٹھیک ہے۔'' فضلاں نے سوچوں کے گرداب سے سر باہر نکال کر جواب دیا۔ اُسے اچانک محمد دین سے پہلی مرتبہ خوف آنے لگا اور اپنا خوف دور کرنے کے لیے وہ اُس سے چمٹ گئی۔ محمد دین شاید اُس کا منتظر تھا!

بجلی کے چند کھمبے آ گئے اور تاروں کے بڑے بڑے رول بھی۔ بستی میں ایک افتتاحی تقریب ہوئی، مقامی سیاست دان آئے اور ملک سے غربت کو مار بھگانے اور غریب کو زندگی کے وسائل مہیا کرنے پر جذباتی تقاریر ہوئیں، سیاسی نعرے لگے اور بستی کو ایک ماڈل آبادی بنا دینے کے وعدوں پر تقریب کا اختتام ہوا۔ بستی کے لوگوں میں نیا ولولہ اور چال میں لچک آ گئی تھی۔ وہ اپنے مرجھائے ہوئے چہروں پر اُس وقت کی خوشیاں سجائے اونچی آواز میں سیاست دانوں اور بستی کی بہتری چاہنے والے داناؤں کی طویل فہرست پر جوش و خروش کے ساتھ بحث کر رہے تھے۔ وہ اُن سب کے مرہونِ منت تھے جنھوں نے اِس ناجائز آبادی کو جائز بنا دیا۔ ایک منچلے نے کہا کہ ناجائز بچے کو پدرانہ سایہ میسر آ گیا تھا۔

فضلاں کا کسی نے کوئی ذکر نہیں کیا!

کئی دنوں سے فضلاں کی طبیعت کچی کچی سی ہو رہی تھی، کبھی اُسے متلی کا احساس ہوتا اور کبھی لگتا کہ ٹانگیں اُس کا وزن نہیں اُٹھا پائیں گی۔ پھر ایک صبح بھیک مانگنے کے اڈے پر جانے سے پہلے وہ محمد دین کے لیے ناشتہ تیار کر رہی تھی تو دال گرم کرتے ہوئے اُسے اپنا اندر باہر آتے ہوئے محسوس ہوا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بھاگتے ہوئے غسل خانے کی طرف گئی تو اُسے ایک طرف والی پڑوسن کا قہقہہ سنائی دیا۔

''ایک دِن ہونا ہی ہوتا ہے، پریشان مت ہونا۔ اگر اچار ہے تو تھوڑا چوس لو ورنہ میں دیتی ہوں۔''

فضلاں نے شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا تو پڑوسن تھوڑی دیر کے بعد تھالی میں اچار لے کر دیوار پر کھڑی ہو گئی۔ فضلاں پوری طاقت لگا کر قے کرتی رہی تا کہ دوسری

پڑوسن بھی سُن سکے گو جانتی تھی کہ اُسے پہلے ہی علم ہوگا۔ فضلاں جانتی تھی کہ قے کی آواز کمرے میں لیٹے ہوئے محمد دین تک بھی گئی ہوگی لیکن اُسے مایوسی ہوئی کہ اُس نے باہر آ کر وجہ نہیں پوچھی۔ اُس نے اپنے طور ہی فرض کرلیا کہ وہ سو رہا ہوگا، اُن دنوں وہ زیادہ وقت گھر پر ہی گزار رہا تھا۔

اُس نے اڈے پر نہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کی غیر حاضری میں کسی نے اڈے پر قبضہ کرلینا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو اتنا کمزور محسوس کررہی تھی کہ اُس نے یہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کرلیا۔ رات وہ دو گھنٹوں کے لیے بھی نہیں گئی گو پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اگر اُن دنوں میں بھی ہوتی جب اُسے جانا نہیں چاہیے تھا وہ پھر بھی چلی جاتی، وہاں جانا اُس کی مجبوری کے ساتھ ساتھ ایک تبدیلی بھی تھی۔

وہ شرماتے ہوئے ایک ادا سے چلتے محمد دین کے پاس گئی۔ محمد دین نے پہلے اُس کے خالی ہاتھوں کو دیکھ کر بُرا سا منہ بنایا۔

''ناشتہ نہیں لائیں؟'' اُس نے آواز میں اپنی برہمی نہیں چھپائی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ آج اڈے پر بھی نہیں جاسکوں گی۔'' فضلاں نے سنجیدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

محمد دین نے ایک دم اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''تمھارا رنگ ہلدی کی طرح ہو رہا ہے۔ میں کوئی آواز سن رہا تھا، شاید اُلٹی تھی۔ اُلٹی کی وجہ کا اندازہ ہے؟ کام پر نہ جانے سے کافی نقصان ہوجانے کا خطرہ ہے۔'' محمد دین بات کرتے ہوئے سوچ بھی جا رہا تھا۔ فضلاں کو محمد دین پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی۔ اُس کا خیال تھا کہ محمد دین اُس کی صحت کے مسئلے کو سمجھ گیا ہوگا۔

''میں آج نہیں جاسکتی۔'' فضلاں نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

''کیوں ؟'' محمد دین کی آواز میں سادگی تھی۔

''اِس لیے کہ،'' وہ تھوڑا سا مسکرائی اور پھر جھوٹی سی شرماہٹ کے ساتھ دوہری ہوگئی، ''میں نہیں میں نہیں..... تم باپ بننے والے ہو۔''

محمد دین اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُسے لگا کہ چارپائی پر ایک اُڑنا سانپ اُس کے ساتھ بیٹھ گیا ہے۔

''باپ کون ہے؟'' محمد دین نے جارحیت سے پوچھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو گھور کر دیکھا۔ فضلاں کو ایسے سوال کی توقع نہیں تھی، اِس لے وہ خاموش رہی۔

''مجھے پتا ہے کہ بچے کا باپ کون ہے؟ بچے کا باپ تمھارا آشنا صاحب ہے اور میں ایک ناجائز بچے کو اپنا نام نہیں دے سکتا۔ میں کسی کے بھی ناجائز بچے کو اپنا نام نہیں دے سکتا،'' محمد دین نے دہرایا،''اور نہ ہی ایسی ماں کو اپنے گھر میں رکھ سکتا ہوں،'' وہ رکا اور آگ بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ اُس نے فضلاں کو دیکھا،''بہتر ہے کہ تم چلی جاؤ۔''

فضلاں نے حسرت سے ایک نظر پکی دیوار پر ڈالی اور پھر چلتے ہوئے پنکھے کو دیکھنے کے لیے اوپر چھت کی طرف دیکھا!
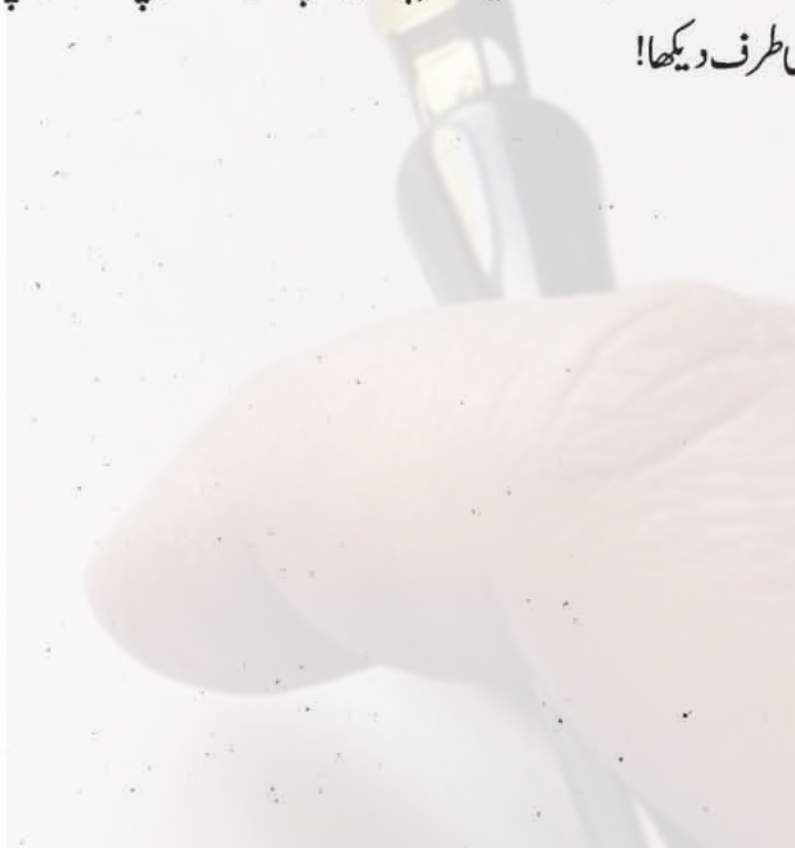
سلائی کی مشین

وہ اپنی زندگی کے معمول سے تنگ آ چکی تھی!

وہ جب واپس گھر پہنچتی تو ایسے محسوس کرتی جیسے اُسے اُکھلی میں ڈال کر کوٹا گیا ہو؛ کندھوں میں کھچاؤ، کمر میں درد، ٹانگوں میں تناؤ، آنکھوں میں جلن.....ایک بخار کی کیفیت.....اُسے لگتا کہ یہ وہ جسم ہی نہیں جسے لے کر وہ صبح گھر سے نکلی تھی۔سب سے تکلیف دہ بات اُس کے مالکوں کا رویہ تھا: بزرگ سمجھتے کہ وہ ابھی تک بچی ہے، کام لینے والے اُسے بیوقوف کہتے اور عمر میں چھوٹوں کو وہ کم تر لگتی۔وہ سوچتی: کیا دولت حاصل ہوتے ہی انسان دوسروں سے اعلیٰ ہو جاتا ہے یا تمام عقل انہیں کے حصے میں اِس لیے آتی ہے کہ وہ دولت مند ہیں یا دولت ان کی شخصیت کے چھوٹے پہلوؤں کو بھی دبا جاتی ہے؟ وہ تین گھروں میں کام کرتی تھی، صبح سات بجے پہلے گھر پہنچ کر صفائی کرتی۔اُس گھر والے رات کو جلدی سو جاتے تھے، اُن کا کہنا تھا کہ اُنھوں نے کم سو کر ہی دولت کمائی ہے۔اُن کے گھر کی صفائی کر کے وہ دوسرے گھر میں چلی جاتی۔وہ لوگ ابھی مکمل طور پر جاگے نہیں ہوتے تھے۔وہ اُن کے کپڑوں کے ڈھیر دھوتی۔وہ لوگ یا واشنگ مشین رکھتے یا کپڑے دھونے والی۔اُنھوں نے کپڑے دھونے والی کو ترجیح دی کیوں کہ وہ گھر کے کسی اور کام میں بھی ہاتھ بٹا سکتی تھی۔وہ کپڑوں کے ڈھیر دھونے کے بعد اپنے بازو دباتی ہوئی اگلے گھر چلی جاتی جہاں اُس نے برتن صاف کرنے ہوتے۔گھر والے ابھی ناشتے سے فارغ ہی ہوئے ہوتے اور وہ رات کے کھانے اور ناشتے والے برتن دھوتے ہوئے برتن پر برتن

زور سے مارتے ہوئے گھر والوں کو بتاتی رہتی کہ برتنوں کی تعداد زیادہ ہے؛ یہ اُس کے احتجاج کرنے کا طریقہ تھا۔

اُس کی کمر، ٹانگوں، بازوؤں اور کندھوں کے اندر، کسی نہ کسی طرح، درد سرایت کر گیا ہوتا۔ گھر کے سامنے کیکر کا ایک بڑا درخت اور گھنی ٹاہلی تھی۔ وہ کام کا پہلا دور مکمل کر کے وہاں آ کر بیٹھ جاتی اور اگر سردی کا موسم ہوتا تو درختوں سے ہٹ کر دھوپ سینکنے لگتی۔ اُس سے تھوڑا پہلے، یا بعد میں ایک ہم پیشہ عورت بھی وہاں آ جاتی۔ وہ اپنے اپنے تجربات اور مشکلات کی ساجھے داری کرتیں؛ اُسے حیرت کے ساتھ ساتھ دُکھ ہوتا جب وہ عورت دولت مندوں کے ساتھ کسی حد تک دل چسپی کا اظہار کرتی۔ وہ سوچتی: دولت مند اُنھیں کم تر سمجھتے ہیں، صرف اِس لیے کہ وہ دولت مند ہیں اور ہم اُن کے ساتھ اِس لیے ہم دردی کریں کہ وہ دولت مند ہیں؟ وہ، اُسے سمجھاتی کہ دولت مند اور غریب ہونے میں کافی فرق ہوتے ہوئے بھی بہت کم فرق ہے۔ دولت مند، دولت کے بغیر غریب ہوتا ہے اور غریب تو ہے ہی غریب! یہ باتیں اُس عورت کی سمجھ میں نہ آتیں۔

''تمھارے اِن مسئلوں کا ایک جگہ حل ہے۔'' ایک دِن اُس عورت نے تنگ آ کر کہا۔ وہ سنی، اَن سنی کر کے بیٹھی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اُسے کسی پیر، مولوی صاحب، بابا جی، قسمت کا حال بتانے والے، ویرانے میں بیٹھے کسی جوگی یا سادھو کا پتا بتا دیا جائے گا۔ وہ اِن سب کے پیچھے پہلے ہی جوتیاں توڑ چکی تھی۔

وہ خاموش بیٹھی رہی!

''تمھارے یہ مسئلے ایک دفتر میں حل ہو جائیں گے۔'' اُسے بتایا گیا۔

وہ چونکی! اُس نے سوچا: دفتر؟ دفتروں میں ایسے مسائل حل ہوتے ہیں؟ وہ لاتعلق سی ہو کر بیٹھی رہی۔

''وہاں مرد نہیں ہوتے،'' اُس عورت نے بات جاری رکھی۔ اب وہ کسی جھجک کے بغیر متوجہ ہو کر بیٹھ گئی۔ ''صرف باجیاں ہوتی ہیں۔ سُنا ہے کہ وہ.....''

''مسئلے حل کرتی ہیں؟'' وہ اپنی بے چینی پر قابو نہ پا سکی۔

''سُنا ہے کہ وہ مسئلے حل نہیں کرتیں، صرف حل بتاتی ہیں۔ تم چکر لگاؤ۔ میری کئی جاننے

والیاں جا چکی ہیں۔ایک مرتبہ میں گئی تھی لیکن اتفاق سے وہاں اِتنی بھیڑ تھی کہ کسی کے ساتھ بات نہ ہو سکی۔اتوار کو وہ دفتر بند ہوتا ہے۔''

ایک دن اُس نے تینوں گھروں سے چھٹی لی اور بتائے ہوئے پتے پر دفتر پہنچ گئی۔اُس نے گھبرائی ہوئی نظر سے اردگرد سرسری طور پر دیکھا؛ اُس نے پہلے دفتر نہیں دیکھے تھے جو وہ اُسے دیکھا بھالا یا اجنبی لگتا۔چھوٹا سا صحن اور درمیان میں سایہ دار درخت، درخت کے سائے میں کچھ بنچ پڑے ہوئے تھے۔ایک طرف تین کمرے تھے اور وہ اٹکل پچو سے درمیان والے کمرے میں چلی گئی۔کمرے میں ایک بڑی میز تھی اور آمنے سامنے بجی سجائی دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔اندر داخل ہو کر وہ تھوڑا سا جھجکی اور پھر دیوار کے ساتھ لگی تین کرسیوں میں سے درمیان والی پر بیٹھ گئی۔دونوں عورتیں کمرے میں اُس کی موجودگی سے بے خبر آپس میں باتیں کر رہی تھیں؛ وہ کبھی کبھار قہقہہ بھی لگا دیتیں۔

دونوں کی باتیں ختم ہو گئی تھیں یا اُنھیں اُس کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا، وہ اُس کی طرف متوجہ ہوئیں۔اُس نے فوراً وہ غلاف چڑھا لیا جو نوکری حاصل کرنے والی ملاقات میں چڑھایا کرتی تھی۔وہ معصوم، مظلوم، حاجت منداور بے بس سی بن گئی۔اُس نے ایک لمبی سانس لی اور ڈوپٹے کے پہلو سے آنکھیں صاف کیں۔

''تمھارا نام کیا ہے؟'' بڑی عمر والی عورت نے سامنے پڑے کاغذات کو سیدھا کرتے ہوئے پوچھا۔

''فیروزہ!'' اُس نے قدرے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا نام ہے۔عموماً تمھارے طبقے کے ایسے نام نہیں ہوتے۔'' فیروزہ کو ایک دم دولت مند یاد آ گئے۔

''یہاں کا پتا کس نے بتایا؟'' عورت نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''جن گھروں میں کام کرتی ہوں اُسی کالونی میں کام کرنے والی ایک عورت نے۔'' فیروزہ نے چھپانا مناسب نہ سمجھا۔

''اُس کا نام کیا ہے ؟''

فیروزہ کا رنگ سُرخ ہو گیا وہ ایک عرصے سے اُس عورت کے ساتھ تبادلہ خیال کرتی آئی تھی

لیکن عجیب بات تھی کہ نہ اُس نے اور نہ ہی عورت نے نام پوچھا یا بتایا۔

''ہم وقفے میں بیٹھ کر باتیں کر لیتی ہیں، نام نہ کبھی پوچھا اور نہ ہی بتایا۔'' فیروزہ نے جھینپتے ہوئے بتایا۔

''تم لوگوں کی پسماندگی کی یہی وجہ ہے۔ کہاں رہتی ہو؟''

''ریلوے لائن کے پار، نئی بستی میں۔'' عورت نے کاغذ پر کچھ لکھا۔

''تمھارا مطلب ہے کہ کچی آبادی میں ؟''

''جی! باجی جی۔''

''دیکھو فیروزہ! گھر چلانے والی عورتیں باجی وغیرہ کہلانا پسند کرتی ہوں گی۔ ہم یہاں میڈم یا مس ہیں۔ مجھے میڈم کہا کرو۔''

فیروزہ کو اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کی رڑک محسوس ہوئی۔ اُس نے سوچا کہ اُٹھ کر چلی جائے پھر اُسے خیال آیا کہ اگر کانٹے چبھ گئے ہیں تو بیر بھی توڑ لیے جائیں۔

''گھر اپنا ہے؟''

''نہیں باج...... نہیں میڈم جی.....'' اُس نے اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے جواب دیا۔

''گھر بنانے کے لیے محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔''

فیروزہ کو پھر دولت مندوں کی برتری یاد آ گئی۔ وہ بتانا چاہتی تھی کہ تینوں گھروں کے کام کا پہلا دور نمٹا کر، ہم پیشہ عورت کے ساتھ بات چیت کے بعد وہ تیسرے گھر میں دوپہر کے کھانے کے بعد والے برتن دھوتی، دوسرے گھر میں سکھانے کے لیے ڈالے گئے کپڑے اُتار کر استری کرتی، پہلے والے کی پھر سے صفائی کر کے جب گھر کی طرف واپس چلتی تو اُس کا بدن وہ نہیں ہوتا جو وہ صبح گھر سے لے کر نکلی تھی۔

''شادی شدہ ہو؟''

''تھی!''

عورت نے اُس کی طرف دیکھا اور کاغذ پر کچھ لکھنے لگی۔

''شناختی کارڈ ہے ؟''

''جی میڈم!'' فیروزہ نے پُر اعتماد بلند لہجے میں جواب دیا۔ اپنے متعلق سب کچھ بتا دینے کے بعد اب اُسے کوئی جھجک نہیں رہی تھی۔

عورت نے ہاتھ بڑھایا۔ فیروزہ پہلے کچھ سمجھ نہ سکی، پھر اُس نے شرماتے ہوئے چھاتیوں کے درمیان میں انگیا میں اٹکا ہوا بٹوہ نکالا اور اُس میں سے شناختی کارڈ نکال کر دیا۔

عورت نے شناختی کارڈ کی تفصیل لکھ کر واپس کر دیا۔

''دیکھو فیروزہ! زندگی گزارنے کے لیے ہم تمھاری مدد کریں گے، مشورہ دیں گے اور تمھاری مشکلوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ تم آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو؟''

فیروزہ کو اپنے اندر ایک نئی عورت سرایت کرتے ہوئے محسوس ہوئی۔ اُسے لگا کہ اُس کے چہرے پر ایک چمک آ گئی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں میں خوشی کی مسکراہٹ اور ہونٹوں پر اُمید کی کپکپی محسوس کر سکتی تھی۔ اُس کی زندگی اُس بیری کی طرح تھی جس کے بیر کھٹے اور گلے کی نمی کو خشک کرتے ہیں۔ یہ بیر کھاتے کھاتے وہ اپنے گلے کی رطوبت کھو بیٹھی تھی۔ وہ اُس درخت میں پیوند لگا کر نئی قسم کے ایسے بیر کھا سکتی تھی جن میں رس ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اُس کی گلے کو مرطوب رکھنے کی خواہش ہی دم توڑ گئی تھی۔ اُس کی پہلی شادی اُس آدمی کے ساتھ ہوئی جو سہاگ رات سے پہلے ہی پرانی آشنا کے ساتھ بھاگ گیا اور دوسری ایسے آدمی سے جو عمر میں اُس کے باپ سے بھی بڑا تھا اور جسے اُس کی جوانی میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ بوڑھے خاوند کو شادی کے جلد بعد فالج ہو گیا اور اب وہ دو کمروں کے گھر کے ایک کمرے میں موت کا منتظر تھا۔ فیروزہ عدم دل چسپی کا شکار رہی تھی اور اب اُسے بھی کسی میں دل چسپی نہیں تھی۔

فیروزہ اپنے کام سے اتوار کو چھٹی کرتی تھی!

وہ جہاں بھرتی ہوئی اُنھیں جمعہ کو اُس کی ضرورت ہوتی۔ اُس نے تینوں گھروں کی مالکنوں کو اپنے اتوار کے دِن کام کرنے پر رضامند کرا کے جمعے کو چھٹی کرنا شروع کر دی۔ جمعے کی حاضری اُس کے لیے نیا تجربہ تھا۔ اُس دن بیس عورتیں وہاں آتیں۔ اُن عورتوں کو چار ٹولوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جہاں وہ اپنے اپنے مسائل بیان کرتیں۔ اُن مسئلوں پر گفتگو ہوتی اور اُن کے حل تلاش کیے جاتے۔ یہ سلسلہ تین سے چار گھنٹے جاری رہتا۔ ایک میڈم آ کر اُن کے حل سُنتی اور پھر وہ حل زیرِ بحث آتے۔ مالکنوں کی

غیر شریفانہ زبان، تشدد، مردوں کا جنسی دباؤ، چوری کے الزام کی دھونس، اُدھار دے کر طویل عرصے تک مفت کام کروانا اور بچوں کو بغیر معاوضہ گھروں میں کام کروانا..... اُنھیں دبے لفظوں میں جنسی تعلیم دی جاتی اور ایک مرتبہ ربڑ بھی تقسیم کیے گئے۔ فیروزہ ربڑ لینے پر آمادہ نہیں تھی اور اُس نے ہلکا سا انکار بھی کیا لیکن پھر مختلف نظر نہ آنے کی وجہ بٹوے میں رکھ لیا۔

سب دوپہر کا کھانا اپنے اپنے گھروں سے لے کر آتیں اور کھانے کا وقفہ ایک تفریح ہوتی۔ ہنسی مذاق، ٹھٹھہ مخول، چٹکلے، شعر، گیت، فرمائشیں، انکار، قہقہے..... ایک باضابطہ ہنگامہ ہوتا جس میں سب شریک ہوتیں۔ کھانے کے وقفے کے بعد دو گھنٹے پیشہ ورانہ تربیت ہوتی۔ سلائی مشین، فٹ بال، جوتے بنانے والی کمپنیوں اور بوتیکوں کے نمائندے اُنھیں اپنے اپنے پیشوں سے متعلق تربیت دیتے۔ فیروزہ کا رجحان سلائی کی طرف تھا تو اُسے قسطوں پر سلائی کی مشین لے دی گئی۔ اُس دِن ایک طویل عرصے کے بعد اُسے اپنے ہونے کا احساس ہوا۔ وہ خوش تھی! وہ دولت مند تو نہیں بن گئی تھی لیکن اُس کے خیال میں یہ اُس سمت میں پہلا قدم تھا۔ وہ محنت کر کے ایک اور مشین حاصل کرنا چاہتی تھی، پھر ایک اور..... پھر کافی مشینیں جن پر بہت ساری عورتیں کام کریں، اُس کے خلاف سازشیں ہوں اور وہ اُن سے نمٹے۔ اُس نے اپنے کام سے واپسی پر سلائی مشین پر کام شروع کر دیا۔ اُس نے پوتڑے سینے سے سلائی کا آغاز کیا۔ وہ شلواروں کے نیفے ڈالنے لگی، کھلی قمیصیں تنگ کرنے لگی، بچیوں کے کھلے فراک تنگ کرنے لگی، چھوٹے بچوں کے شلوار کرتے سینے لگی، عورتوں کے لیے سوٹ سینے لگی، مردوں کی شلواریں، پھر قمیصیں اور پھر کُرتے سینے لگی۔ وہ سلائی مشین کی قسط باقائدگی کے ساتھ ادا کر رہی تھی۔ کمپنی کا نمائندہ اُس کے گھر آتا اور وہ دروازے پر ادائی کر کے رسید حاصل کر لیتی۔ اب اُس کا کام اتنا چل گیا تھا کہ اُسے دوسری سلائی مشین کی ضرورت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اُس نے اُتنا ہی امیر ہونا ہے جتنے کی وہ اہل تھی۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی اہلیت میں اضافہ ہو گیا ہے چناں چہ اُسے دوسری مشین حاصل کرنی پڑیں۔ اب وہ مالی طور پر اتنی مستحکم تھی کہ اُس کے لیے گھروں میں جا کر کپڑے دھونا، صفائی کرنا اور برتن مانجھنا ضروری نہیں رہا تھا، وہ اپنے گھر کے کاموں کے لیے جز وقتی ملازمہ رکھنے کا بھی سوچنے لگی تھی۔ اُسے نیم مردہ یا نیم زندہ خاوند کے دن میں دو مرتبہ پیمپر بدلنے کے لیے بھی کسی مددگار کی ضرورت تھی۔

سلائی مشین کے نمائندے کو فیروزہ نے دفتر کی معرفت ایک اور مشین کا پیغام بھجوایا!

اُس نے گھروں میں کام کرنا تو بند کر دیا تھا لیکن سلائی کا کام لینے کے لیے وہ وہاں باقاعدگی کے ساتھ چکر لگاتی۔ اُس کی زندگی کی مصروفیت میں اضافہ ہوگیا تھا اور اُکھلی میں ڈال کر بدن کے کوٹے جانے کا احساس قائم تھا۔ اُسے اپنا جسم مسلسل کسی اور کا لگتا.....وہ جان گئی تھی کہ سلائی کی تیسری مشین کے آنے کے بعد وہ خود کام کرنا بند کر سکے گی اور تب اُس کا جسم اکھلی میں نہیں کوٹا جائے گا۔

اتوار یا جمعے کو اردگرد سلائی کا کام کرنے والے چھٹی کرتے اِس لیے فیروزہ نے بدھ وار کو چھٹی رکھی ہوتی۔ اتوار اور جمعہ اُس کے مصروف ترین دِن ہوتے، بدھ وار وہ گھر میں کچھ کیے بغیر گزارتی۔

سہ پہر کو کنڈی کھٹکھٹائے جانے کی آواز نے اُسے جگایا۔ وہ بادلِ نخواستہ باہر گئی تو کمپنی کی جیپ سامنے کھڑی تھی اور نمائندہ سلائی کی مشین نکال رہا تھا۔ معمول کے خلاف فیروزہ اُسے کمرے میں لے گئی۔ نمائندہ پہلی مشین کے ساتھ دوسری کو رکھ چکا تو فیروزہ نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ اُس کے ساتھ غیر اہم سی بات چیت کر کے اُس ہلکی سی بے تکلفی کو قائم رکھنا چاہتی تھی جو اُن کے درمیان میں قسط کی ادائی اور رسید لیتے وقت ہوگئی تھی۔ فیروزہ کو محسوس ہوا کہ اُس کا گلا خشک ہوگیا ہے کہ اُس سے بات ہی نہیں ہو رہی.....اُس کے اندر کی عورت نکل کر کسی اور طرف جانے کے بعد اُسے خالی کر گئی تھی۔ اُس نے نمائندے کی طرف دیکھا، وہ اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فیروزہ کو اُس کی نظر میں دل چسپی، بے چینی، انتظار، بے یقینی اور گھبراہٹ کبھی یکجا اور کبھی الگ الگ ہوتے نظر آئے۔ پھر وہ آدمی آہستہ سے مسکرایا، فیروزہ کو محسوس ہوا کہ وہ مسکراہٹ اُسے اُکسا رہی ہے۔ اچانک اُسے اپنے اندر ایک عورت سرایت کرتے ہوئے محسوس ہوئی۔ اُسے لگا کہ اُس کے چہرے پر سرمئی سا رنگ پھیل رہا ہے، وہ اپنی آنکھوں میں ایک بوجھل پن اور اور ہونٹوں پر بے یقینی اور اُمید کی کپکپی محسوس کر سکتی تھی۔ اُس نے تھوک نگلا تو لگا کہ گلے میں نم کی بہتات ہے۔ وہ کچھ دیر اُس آدمی کو دیکھتی رہی!

لگاتار ٹکٹکی لگا کر دیکھنے سے اُس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ اُس نے آنکھیں جھپکیں تو نمائندہ مسکرا دیا۔ اُس کے بعد وہ آہستہ سے اُٹھی اور انگیٹھی پر پڑے ہوئے بٹوے کو کھولنے لگی!

دکھ اور سکھ کے بیچ

وہ ایک عجیب عورت تھی!

وہ اتنی عجیب تھی کہ کوئی بھی اُس کے عجیب ہونے کی وجہ نہ جان سکا یا اُس کے متعلق کچھ ایسا غیر معمولی نہیں تھا کہ اُس کے عجیب ہونے کی وجوہات کھوجتا، وہ جیسی تھی سب کو ویسی ہی لگتی تھی، لیکن وہ تھی عجیب، اتنی عجیب کہ وہ خود بھی نہ جان سکی۔ وہ اپنی ماں کے ہر اشارے کی منتظر ہوتی، وہ اشارے جنھیں گھر کے دوسرے لوگ دیکھتے تو تھے لیکن سمجھتے نہیں تھے، اور وہ جیسے ہی ماں کے چہرے کا تاثر دیکھتی، فوراً وہ کر دیتی جو اُس تاثر کی زبان تھی، وہ ماں کے بعد صبح اُٹھنے والا گھر کا دوسرا فرد ہوتا، باقی سب اپنے دِن کے معمول کے مطابق جاگتے، اور سوتی ماں کے بعد، اِس کے باوجود وہ اپنی پڑھائی سے کبھی غافل نہیں ہوئی تھی، اور جب اپنے کمرے میں پڑھ رہی ہوتی تو فوراً جان جاتی کہ ماں کو اُس کی ضرورت ہے اور وہ ماں کے پاس چلی جاتی۔ وہ پڑھائی میں اپنی کلاس کی تین پہلی لڑکیوں میں سے تھی۔ وہ ماں کے سب کام کرتی لیکن بظاہر اُسے ماں کے ساتھ کوئی دل چسپی نہیں تھی۔

اُس کا باپ ایک سخت گیر آدمی تھا، وہ کسی قسم کی بے ترتیبی، بدنظمی اور بے قاعدگی پسند نہیں کر سکتا تھا، اُسے ہر جگہ سلیقہ چاہیے تھا، جو ممکن نہیں تھا، لیکن، وہ جب چھوٹی تھی، تب ہی سے اپنے باپ کے مزاج کو سمجھ گئی تھی، اُس کی ماں جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اُس کے باپ کے ساتھ گزار دیا تھا، نہیں سمجھ پائی تھی اور، بہن اور بھائی بھی نہیں سمجھ سکے تھے، وہ کیا چاہتا تھا یہ کوئی نہیں جان پایا، صرف

اُس سے خائف تھے۔ جب اُس کے باپ کے گھر آنے کا وقت ہوتا، وہ سب کچھ ایسے سلیقے، قاعدے، ترتیب سے رکھ دیتی کہ جیسے ایسے ہی چلا آرہا تھا اور کبھی کوئی بے قاعدگی یا بے ترتیبی تھی ہی نہیں۔ اُس کے باپ کی خواہش ہوتی کہ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہو، اُس کے پینے کے لیے پانی کا گلاس رکھ دیا جائے، وہ چاہے پیے یا نہ پیے، ماں کا کہنا تھا کہ پینا ہو تو مانگا جا سکتا ہے ورنہ پانی کی ضرورت نہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ جب گھر آئے اُسے کمرہ خالی ملے تا کہ وہ کچھ دیر آرام کر سکے، اور پانی کا گلاس رکھنے کے بعد وہ باپ کا کمرہ بند کر دیتی اور سب کو خاموش کروا دیتی، صبح باپ نے وضو کرنا ہوتا تھا، وہ لوٹا بھر کے رکھ جاتی، جائے نماز جہاں وہ چاہتا تھا، وہاں رکھا ہوتا، چائے وہ جتنی گرم پسند کرتا تھا، اُسے لا کے دیتی۔ وہ یہ سب کرتی لیکن بظاہر اُسے اپنے باپ کے ساتھ کوئی دل چسپی نہیں تھی۔

وہ گھر ایک ایسے نظام سے چل رہا تھا جو ساتھ کے گھروں میں نہیں تھا، اِس کی وجہ اُس کا باپ اور وہ خود تھی۔ وہ اتنی منظم تھی جتنا اُس کا باپ چاہتا تھا، اور اپنی ذاتی زندگی میں اتنی غیر منظم جتنا وہ خود چاہتی تھی۔ جہاں اُسے ماں، باپ، بہن اور دونوں بھائیوں کے ساتھ کوئی دل چسپی نہیں تھی وہاں وہ ہی تھی جو سب کے کام آتی اور پڑھائی میں سب سے اچھی۔ وہ بعض اوقات منہ دھوئے بغیر ہی سکول اور بعد میں کالج چلی جاتی اور جب کوئی دوست مذاق اُڑاتی تو اُس کا جواب ہوتا: منہ دھونے سے میں بدل جاؤں گی؟ یا اگر اتنا ہی ناپسند ہوں تو مت ملا کرو۔ لیکن کوئی بھی اُسے ناپسند نہیں کرتا تھا اور اُسے کسی کے ساتھ دل چسپی نہیں تھی۔

بڑی بہن اُس کے ساتھ دوستی رکھنا چاہتی تھی، اُسے اپنی بہن کے ساتھ ہمدردی تھی، چھوٹی ہونے کی وجہ سے اُس کا احترام بھی کرتی، لیکن وہ اُس کی دوست نہیں تھی۔ بڑی بہن کی شادی کی بات چلی تو وہ پریشان رہنے لگی اور اُس سے بہن کی پریشانی دیکھی نہ گئی۔ اُس نے بہن کی پریشانی کی وجہ جاننے کی کوشش نہ کی، فوراً سمجھ گئی کہ وہ کہیں اور شادی کرنا چاہتی ہے، اُس نے ماں کو بہن کے ساتھ مل کے آنسو بہاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُسے بھائیوں کی بے حسی اور باپ کی سخت گیری پر غصہ آیا۔ اُس نے سن رکھا تھا کہ جب اولاد کی تکلیف سے ماں روئے تو ساتوں عرش کانپ جاتے ہیں۔ اُسے آسمانوں کی لرزش تو محسوس نہیں ہوئی لیکن ماں کی مجبوری اور بہن کی بے بسی نے ایسی طاقت دی کہ ایک رات، جب باپ کمرے میں اکیلا تھا، وہ اُس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ جسے گھر میں کسی نے ضرورت سے

زیادہ بات کرتے نہیں سنا تھا، اُس رات دیر تک بولتی رہی، اُس نے کوئی غیر ضروری بات نہیں کی، صرف باپ کو قائل کیا، پہلے وہ سیخ پا ہوا، پھر غصے اور دلیل کے ملے جلے لہجے کے ساتھ بولنے لگا، غصہ جاتا رہا اور صرف دلیل رہ گئی اور پھر صرف مصلحت ہی باقی بچی۔ باپ کے ساتھ بات کرتے ہوئے اُس کا لہجہ دھیما، دلیل میں وزن اور باپ کی متعدد ذمے داریوں کی نشان دہی تھی۔ پھر باپ مسکرا اُٹھا، اُسے گلے لگایا اور رشتہ بہن کی مرضی سے طے کیا۔ بہن اُس کی شکر گزار تھی لیکن اُس نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ باپ کو اُس نے کن طریقوں سے قائل کیا تھا۔

پھر اُس کی اپنی شادی کی بات چل پڑی اور اُس نے ظاہر کیا کہ وہ گھر میں ہونے والی خاموش قسم کی سرگوشیوں کو سن نہیں رہی۔ اُسے کوئی غرض نہیں تھی کہ اُس کی شادی ہو، وہ بغیر شادی کے بھی زندگی گزارنے کے لیے تیار تھی، اِس تیاری میں تعلیم اُس کی ڈھال تھی۔ اُسے کئی جگہوں سے ملازمت کی پیش کش بھی تھی لیکن وہ شادی کے فیصلے تک ملازمت کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اُس سے جب رشتے کے بارے میں پوچھا گیا تو اُس نے کسی حوصلہ افزا بات سے جواب نہیں دیا اور نہ ہی کسی طرح بھی منع کرنے کی کوشش کی؛ نہ تو اُس کی کسی طرح ہاں تھی اور نہ ہی ناں،: بس شادی ایک فریضہ تھا جو پورا کرنا ہی تھا اور جس کی زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی۔

اُس کی شادی جس آدمی کے ساتھ طے پائی وہ اچھی ملازمت پر تو فائض تھا لیکن شکل اتنی اچھی نہیں تھی کہ کوئی اُس کی تعریف کرتا اور اتنی نامناسب بھی نہیں تھی کہ کوئی بدتعریفی کرتا، اُس کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کی جا سکتی تھی۔ اُس کا ماتھا بالوں سے خالی ہو رہا تھا، ہونٹ بھینچے ہوئے، آنکھیں چھوٹی اور بے چین، اُٹھتا ہوا قد اور آواز بھاری تھی۔ شادی کے بعد وہ اُسے پسند آیا اور نہ ہی ناپسند، وہ خوش تھی اور ناخوش بھی۔ اُسے اپنے نئے گھر میں کئی کام تھے جو وہ مستعدی سے کرتی، اتنی مستعدی سے کہ جب اُس کی ساس اور سسر ملنے آتے اُنھیں حیرت ہوتی۔ وہ ہر وقت کچھ کرنے میں مصروف ہوتی، کھانا عمدہ بناتی، اُن کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی، اُنھیں کبھی بیگانگی کا احساس نہ ہونے دیتی، وہ اُسے سارا دِن مصروف دیکھتے، ایک مشین کی طرح، شکار ڈھونڈتے خاص کتے کی طرح یا ایک دیوانے کی طرح۔ وہ اپنے بیٹے کے گھر کے مستقبل سے مطمئن اور خوش تھے۔ اُنھیں ایک شکایت تھی جو اُنھوں نے کسی سے کی نہیں: وہ اُن کے پاس بیٹھتی نہیں تھی، اُس نے اُن کے ساتھ بات کرنا کبھی گوارا نہیں سمجھا تھا!

وہ اپنی زندگی کا تسلسل برقرار رکھے ہوئے تھی، وہ ہر کسی کے ساتھ ہوتے ہوئے کسی کے ساتھ نہیں تھی، وہ ہر ایک کی ہمدرد تھی لیکن اُسے کسی ساتھ ہمدردی نہیں تھی، وہ کسی غرض کے بغیر ہر ایک کے کام آتی لیکن اُس جتنا خودغرض کوئی بھی نہیں تھا۔ اُس کے دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ وہ اپنی زندگی میں اور بھی مصروف ہوگئی، وہ اُنھیں ایسے سنبھالتی کہ ہر ماں اُس سے حسد کرتی۔ وہ اپنے ذرائع کے اندر رہتے ہوئے اپنی بیٹیوں کی پرورش ایسے کر رہی تھی کہ زیادہ آسودہ ماؤں کو حیرت ہوتی اور اُن کے خاوند اُس کے شوہر کو خوش قسمت گردانتے کہ جسے ایسی سلیقہ شعار بیوی ملی تھی۔

لیکن اُس کے شوہر کی رائے بدلنے لگی!

وہ خوش تھا کہ اُس کی بیوی اتنے سلیقے سے گھر سنبھالے ہوئے تھی کہ اُسے کوئی پریشانی نہیں تھی اور اُس نے اپنی تمام تر توجہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات پر مزکور کردی۔ اُس کی محنت رنگ لانے لگی اور وہ تیزی سے ترقی کرنے لگا۔ اُس کی ترقی کی رفتار لوگوں کے لیے حیران کن تھی، وہ شادی سے پہلے ایک منتشر کارندہ تھا اور پھر شادی کے کچھ عرصہ بعد اُس کے رویے میں تبدیلی آنے لگی اور جو کارکردگی کا حسن وہ گھر میں دیکھتا، ویسا ہی اپنے کام میں لانے کی کوشش کرتا اور بتدریج کامیاب ہونے لگا۔ اُس کی کامیابی میں ایک طرح سے بیوی کا بھی ہاتھ تھا، وہ گھر کی کارکردگی کا اپنے دفتر میں اطلاق کرتا۔ اُسے حیرت ہوتی کہ وہاں سب زنگ زدہ ترتیب سے کام کر رہے تھے اور کہیں بھی جدت پسندی نہیں تھی؛ اُس کا خیال تھا کہ یہ اُس کی اختراع تھی۔

وہ اب محسوس کرتا کہ اُس کی بیوی کے اندر کوئی عورت ہے ہی نہیں، بس ایک چلتی پھرتی مشین ہے جسے زندگی میں کسی کی ضرورت نہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ بیوی اُس کے ساتھ کبھی کسی مسئلے پر ضد کرے، کبھی اُس کی کوئی مانگ ہو، کبھی کسی چیز کو رد کرے اور کبھی کچھ خوشی سے قبول کرلے۔ وہ چاہتا تھا کہ اُن کے درمیان کوئی شدید جھگڑا ہو، بیوی روٹھ جائے اور وہ اُسے منائے یا کسی سنجیدہ مسئلے پر وہ ناراض ہو جائے اور بیوی منت سماجت پر اُتر آئے لیکن ایسا کبھی ہوتا نہیں تھا۔ اُس کی کوئی مانگ ہی نہیں تھی، اُسے جو ملتا وہ اُسی میں گزارا کر لیتی اور اگر نہ ملنے کی اُمید ہوتی تو وہ ایسے ذرائع پیدا کر لیتی کہ جو اُسے چاہیے تھا حاصل کرلے۔

خاوند کو وہ کبھی شکایت کا موقع نہ دیتی لیکن پھر بھی اُسے شکایت رہنے لگی۔ وہ کوئی بھی شکایت بیوی

کے سامنے نہیں لاتا تھا کیوں کہ جانتا تھا کہ جب حقائق پر بات آئی تو اُس نے غلط ثابت ہونا تھا کیوں کہ بیوی نے کہیں کوئی خالی جگہ نہیں چھوڑی ہوتی تھی۔ وہ اُن لمحات میں بھی، جب عورتیں جھجک کا شکار ہوتی ہیں اور کھل کے اظہار نہیں کر پاتیں، وہ جارحیت پر ہوتی اور اکثر خاوند کو شکست ہوتی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایسے لمحات کے بعد وہ دونوں آپس میں یگانگت، گہرے تعلق اور دوستی کی باتیں کریں لیکن اُس نے جو کہنا ہوتا تھا وہ چند منٹ پہلے کہہ چکی ہوتی تھی، اب خاوند کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ خاوند کو اُس وقت اپنا آپ اور کچھ دیر پہلے ہونے والا سب غیر ضروری لگتا، اُسے اپنی کمتری کا احساس ہوتا، وہ سوچتا: کیا اُسے استعمال کیا جا رہا ہے؟ پھر اُس کے ذہن میں سویا ہوا ایک خیال چنگاری کی طرح بھڑک کے دم توڑ جاتا: کہیں ایسا تو نہیں بیوی اُسے پسند ہی نہ کرتی ہو؟ پھر وہ اُس کی گھر میں دلچسپی اور والدین کے ساتھ رویے کو دیکھ کے یہ شک خود ساختہ وہم لگتا لیکن ایک شک آہستہ آہستہ یقین میں تبدیل ہونے لگا: اُس کی بیوی کا کسی کے ساتھ تعلق رہا ہے جسے وہ بھول نہیں سکی اور ہر جنسی ملاپ کے بعد وہ اُس کی کمی محسوس کرتی ہے۔

خاوند اب بیوی سے کچھ دور ہونے لگا، اُسے محسوس ہوتا کہ اُس کے ساتھ مسلسل دھوکہ ہو رہا ہے، اُس کی بیوی اپنی تمام تر اچھائی کے باوجود اچھی نہیں، وہ اُس وقت اُس کے ساتھ نہیں ہوتی جب اُس کی وہاں ہونے کی ضرورت ہوتی ہے یا جب وہ محسوس کرے کہ اُسے وہاں ہونا چاہیے، کیوں کہ اُس وقت وہ وہاں ہوتی ہے جہاں وہ جسمانی طور پر نہیں جا سکی تو ذہنی طور پر وہاں چلی جاتی ہے۔ اُس نے خود کو اکیلا محسوس کرنا شروع کر دیا اور اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے اُس نے دفتر میں ایک عورت کے ساتھ راہ رسم بڑھانا شروع کر دیا۔ وہ عورت خوب صورت نہیں، لیکن جوان تھی۔ وہ عورت خوب صورت نہیں تھی لیکن باتونی تھی، وہ عورت خوب صورت نہیں تھی لیکن اُس کے بدن کے خطوط اُسے پرکشش بناتے تھے۔ اپنے خوب صورت نہ ہونے کی وجہ سے دفتر میں وہ تنہا تھی اور سارا دِن اپنا کام کرتی یا لمبی لمبی سانسیں لیتی رہتی۔ خاوند کو اُس ناخوب صورت عورت میں اپنی تنہائی نظر آئی اور اُس نے اپنی تنہائی دور کرنے کے ساتھ اُس کی تنہائی دور کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا۔ خاوند اپنے دفتر کا سربراہ بن چکا تھا۔ اُس کی تنخواہ اتنی تھی کہ وہ اُس عورت کے ساتھ رہنے کے لیے ایک چھوٹے سے فلیٹ کا بندوبست کر سکے، وہ جانتا تھا کہ ناخوب صورت عورت کسی ہاسٹل میں رہتی ہے اور وہ شہر سے کچھ

فاصلے پر ایک گاؤں کی رہنے والی ہے جہاں سے روز آنا جانا ممکن نہیں، اِس لیے وہ عورت یقیناً کسی بہتر جگہ میں رہنے کو پسند کرے گی۔ وہ اُس کے ساتھ اِس خیال کو ذہن میں رکھ کے سست روی سے آگے بڑھنے لگا۔ اُسے یہ عمل دل چسپ بھی لگا کیوں کہ اُس کی تمام زندگی ہر قسم کی دل چسپی سے خالی رہی تھی۔ خاوند اُس عورت کو قریب لانے کے لیے یا خود اُس کے قریب ہونے کے لیے، کئی منصوبے بناتا، اُنھیں رد کرتا، اُنھیں موخر کرتا، اُنھیں قابلِ عمل سمجھتے ہوئے اُن پر عمل کرتا، اور وہ عورت اُسے ہمیشہ تعاون کے لیے آمادہ نظر آتی۔ پھر ایک دِن خاوند نے اُسے وہ بتادیا جو وہ کہنا چاہ رہا تھا اور اُس عورت نے بھی وہ سن لیا جو وہ سننا چاہ رہی تھی اور خاوند کو پہلی بار وہ عورت خوب صورت لگی؛ اُنھوں نے اکٹھے رہنا شروع کر دیا۔

خاوند نے گھر جانا چھوڑ دیا۔ بیوی نے کبھی شکایت نہ کی؛ اُس نے اپنی زندگی کو نئے حالات کے مطابق گزارنا شروع کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ خاوند ایک ہفتے میں ایک دِن آئے گا، وہ خاموشی کے ساتھ چائے پیتے، بیوی نے چائے کے ساتھ وہ تمام لوازمات رکھے ہوتے جو خاوند کو پسند تھے۔ بیوی کبھی شکایت نہ کرتی، اُس کا رویہ ایسے ہی رہتا جیسے کہ ہمیشہ سے تھا۔ بیوی یہی ظاہر کرتی کہ کچھ ہوا ہی نہیں، جیسے ہمیشہ سے ایسے ہی چلا آرہا ہے، جیسے وہ کچھ اور چاہتی ہی نہیں کیوں کہ اُسے کبھی کوئی کمی ہی نہیں محسوس ہوئی۔ خاوند کو بیوی کے رویے پر حیرت ہوتی، اُسے اپنا شک بھی یقین میں تبدیل ہوتا لگتا، شاید کوئی اُسے ملنے آتا ہو، اُس نے سوچا کہ اِس کا کیسے پتا چلائے؟ اُسے یہ شک بھی ایک منصوبے کی طرف بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ کیا وہ اپنی محبوبہ کو یہ راز جاننے کے لیے استعمال کرے؟ اُسے یہ خیال بعید از قیاس نہیں لگا، وہ محبوبہ کو استعمال کرسکتا ہے۔ لیکن کیسے استعمال کرے؟ اُسے یہ خیال شہہ دینے لگا۔

وہ عورت ایک دِن بیوی سے ملنے آئی اور پھر کئی بار آتی رہی، باتونی تو تھی ہی، بہت باتیں کرتی، اپنے عاشق کی جواب کسی اور کا خاوند ہے، جو چوری چھپے اُسے ملتا بھی ہے، ایک بار کی ہوئی محبت بھولتی نہیں، لیکن بیوی کوئی رائے نہ دیتی، وہ یہ سب سنتی، ایسے سنتی کہ ہر لفظ پر غور کر رہی ہو لیکن کچھ بھی نہ سن رہی ہوتی۔ وہ عورت اب اکثر آتی، اُسے بیوی پسند آنا شروع ہوگئی تھی؛ اُسے بیوی کا سبھاؤ، برتاؤ، ترتیب اور ارتکاز پسند آئے، اُسے حیرت ہوتی کہ خاوند اپنی بیوی کے بارے میں ایسی

اطلاعات کیوں اکٹھی کرنی چاہتا ہے جن کا وجود ہی نہیں، شاید وہ اُن کو بنیاد بنا کے کچھ اور تعمیر کرنا چاہتا ہو جو عورت کو پسند نہیں آیا۔ بیوی نے اُس عورت کو کبھی پسندیدگی سے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی ناپسندیدگی سے، اُسے وہ عورت کبھی اہم نہیں لگی تھی اور غیر اہم بھی نہیں۔ عورت کے اپنے دفاعی نظام میں کچھ دراڑیں پڑنا شروع ہو گئیں، اُسے خاوند پر بھی شک ہونے لگا کہ وہ کسی دِن اُس پر بھی ایسے ہی شک کرنے لگے گا اور کسی کو خبر گیری کے لیے کھڑا کر دے گا۔

بیوی کے مالی حالات اتنے برے نہیں تھے، اُس کے والدین کچھ چھوڑ گئے تھے جس کا ماہانہ اُسے ملتا رہتا، ساس اور سسر نے اپنے بیٹے کے رویے کی وجہ سے اُس کی مالی امداد کرنا شروع کر دی اور اُسے ملنے بھی آتے رہتے، بیوی کا رویہ اُن کے ساتھ پہلے جیسا تھا جو اُنھیں پسند نہیں تھا لیکن وہ اُس سے پہلے کی طرح ہی متاثر تھے، وہ اپنی بیٹیوں کی پرورش اچھے طریقے سے کر رہی تھی۔ عورت کے خاوند کے ساتھ تعلق میں ایک کھچاؤ آ گیا تھا، خاوند کو عورت کی کشش نے ہی بیوی سے دور کیا تھا، وہ اُس کشش سے ابھی تک نکل نہیں سکا تھا، اُس کے بھرے ہوئے جسم میں سے خاوند کی لذت کی تشنگی نہیں جا رہی تھی، وہ اُس کم خوب صورت عورت کو جسے کوئی اور اپنے قابل نہیں سمجھتا تھا، خاوند کے لیے وہ ایک ہیرا تھا جسے اُس نے خود تراشا تھا لیکن ہیرے کو اب اپنے جوہری کے ساتھ دل چسپی نہیں رہی تھی۔ وہ لڑائی کے بہانے ڈھونڈتی، خاوند اُس کی دل جمعی کرتا، وہ ُسے کم تر ثابت کرنے کی کوشش کرتی، خاوند اپنی کم تری کو قبول کرتا، وہ اُسے مکار ثابت کرنے کی کوشش کرتی، خاوند اپنے پر خلوص ہونے کا دعویٰ کرتا اور ایک دِن اُس نے عورت سے اُس کے رویے کی وجہ پوچھ ہی لی۔ اُسے ایک دم احساس ہوا کہ اُسے یہ پوچھنا نہیں چاہیے تھا۔ اپنی طویل ملازمت میں خاوند نے سیکھا تھا کہ افسر اعلیٰ سے اپنی کارکردگی کے بارے میں کبھی نہیں پوچھنا چاہیے، اور یہاں وہ اپنے ہی طے کیے ہوئے اصول کی خلاف کر چکا تھا۔ عورت نے جو جواب دیا اُس کی خاوند کو توقع نہیں تھی؛ عورت نے بتایا کہ اُسے خاوند سے گھن آتی ہے، اُس کی چھوٹی آنکھوں کو دیکھنے کے لیے اُنھیں ڈھونڈنا پڑتا ہے، ایک تو وہ پہلے ہی چھوٹی تھیں اور اُن کے گرد جھریوں کے جال نے اُنھیں بھیانک بنا دیا تھا جنھیں اپنے کسی خیال میں گم جب دیکھتی تو خوف زدہ ہو جاتی، اُس کا ماتھا اب آدھے سر تک پھیل گیا تھا اور سر پر بچے ہوئے بال اتنے کم تھے کہ اُن میں انگلی پھیرتے ہوئے اُلجھن ہوتی، دراز قد جھک گیا تھا اور دبلے جسم پر توند اُسے مضحکہ خیز بنا رہی

تھی۔ خاوند خاموشی کے ساتھ یہ سنتا رہا، اُس نے اپنے بارے میں ایسی رائے کبھی سنی ہی نہیں تھی، وہ ایک سکتے کی کیفیت میں عورت کو دیکھتا رہا۔ عورت نے اُسے یہ بھی بتایا کہ وہ اُسے ملازمت سے نہیں نکال سکتا، اُس کے کمپنی کے مالکوں میں سے ایک کے ساتھ تعلقات ہیں جو کافی عمر رسیدہ ہے اور جسے وہ بیوقوف بنائے ہوئے ہے، اُس سے بھی زیادہ۔

خاوند کو ایک دم اپنی بیوی کا خیال آیا۔ وہ اُسے کسی بلند پہاڑ سے نکلتے ہوئے چشمے کی طرح لگی، جس کے شفاف پانی میں کرنیں بھی خود کو صاف کرتی ہیں۔ اُسے اپنی کم عقلی اور جلد بازی پر غصہ آیا، اُس نے کچھ جاننے کی کوشش کیے بغیر ایک فیصلہ کرلیا، ایسا فیصلہ جسے کرنے کا اُسے حق نہیں تھا۔ چشمے کا شفاف پانی بہتے ہوئے جوہڑ میں اگر گرے گا تو کیا وہ جوہڑ کے پانی میں خود بھی گندا ہوجائے گا یا مسلسل گرتے رہنے کے بعد اُسے صاف کرلے گا؟ ایک چشمے کا پانی کیا جوہڑ کے گندے اور بدبودار پانی کو صاف کردے گا؟

خاوند نے صاف پانی کو جوہڑ میں گرتے جانے دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ اُس چھوٹے فلیٹ سے نکلا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا، اُس کے قدم شرمندگی اور خوف کی سڑک پر چل رہے تھے۔ وہ اپنے گھر کے سامنے رکا، دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا اور وہ اندر داخل ہوگیا۔ پہلے وہ گھر ہر ہفتے تھوڑی دیر کے لیے آتا، پھر آنا کم ہوتا گیا اور اب وہ مدت کے بعد آیا تھا۔ اُسے گھر کبھی اجنبی اور کبھی اپنا لگا۔ اِس گھر میں اُس کی بیوی اور دو بیٹیاں رہتی ہیں لیکن کیا وہ اُن کا سامنا کر پائے گا؟ اُس نے سوچا کہ جو ہزیمت اُسے فلیٹ میں عورت کے ہاتھوں اُٹھانا پڑی، ویسی شاید اُسے یہاں نہ اُٹھانی پڑے کیوں کہ یہاں کے رہنے والے اُس کے اپنے تھے اور عورت کسی کا نہ ہوتے ہوئے ہر کسی کی تھی۔ اُس نے کھڑے ہو کے اِدھر اُدھر دیکھا، اُسے کوئی حرکت نظر نہ آئی تو اُس نے بیوی کو آواز دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک کمرے سے بیوی نکلی، دونوں کی نظر ملی، خاوند کو کرنیں چشمے میں سے صاف ہو کے نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ بیوی کی آنکھیں بغیر تاثر کے تھیں۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑی اُسے دیکھتی رہی، پھر اُس نے دروازہ بند کردیا!........ پھر اُس کی طرف توجہ کیے بغیر اپنے کسی کام سے صحن میں نکل گئی اور خاوند نے محسوس کیا کہ وہ ہر جذبے اور احساس سے عاری ہوگیا ہے!

ایک دکھ

جب تم میرے ساتھ تھیں تو کہیں بھی اجنبیت نہیں تھی۔ تم تو تھیں ہی، مجھے باقی سب بھی اپنا لگتا تھا؛ اپنا گھر، دفتر، دفتر کا راستہ، دوست، تمھاری طرف جانے والا راستہ، وہ کھڑکی جس میں سے ہم باہر کی دنیا دیکھا کرتے تھے، وہ دروازہ جسے بند کر کے ہم کسی کو اپنے اندر نہیں جھانکنے دیتے تھے اور وہ زندگی جس میں تم ہی تم تھیں۔ وہ زندگی پانی کے اُس مدھم بہاؤ کی طرح تھی جس میں بہتے ہوئے میری آنکھیں بند ہوتی تھیں اور میں اپنی ہر تلخی اُسی پانی میں گھولے جاتا تھا؛ مجھے کچھ ہوش ہی نہیں تھا، بس ایک مستی تھی، ہر وقت ہلکا سا سرور.... ہونٹوں پر مسکراہٹ اور اُس مسکراہٹ میں تمھارے قرب کے نشے کا بھاری پن۔

تمھیں دیکھنا بھی ایک تجربہ تھا۔ مجھے لگا کہ میرے سامنے ایک لڑکا کھڑا تھا جو کسی لڑکی کا لباس پہن آیا ہو یا ایسی لڑکی جسے اپنے حلیے میں کوئی دل چسپی نہ ہو۔ میرے سامنے ایک دراز قد کی لڑکی کھڑی تھی جس کا چہرہ پتلا اور لمبا تھا اور آنکھیں گہری اور سیاہ تھیں۔ تمھاری چھاتی میں کوئی نسوانی اُبھار نہیں تھا اور مجھے لگا کہ تم ابھی مکمل طور پر لڑکی سے عورت بننے کا سفر طے نہیں کر سکی تھیں کہ عورت بن گئیں اور میرے سامنے ایک نامکمل عورت یا مکمل لڑکی کھڑی تھی۔ میں تمھیں دیکھتا جاتا تھا اور تم میری نظر سے بے نیاز میرے سامنے کھڑی ہلکے ہلکے مسکراتی جاتی تھیں؛ جیسے میری حیرت میں سے لطف کشید کر رہی ہو۔

تم میرے سیکشن میں تھیں یا میں تمھارے سیکشن کا انچارج تھا۔ میرا مشاہدہ تھا کہ تم ہر وقت دفتر میں ایک میز سے دوسری میز اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے کے چکر کاٹتی رہتی ہو اور بہت کم ہوا تھا کہ اپنی کرسی پر بھی بیٹھی ہو۔ میں نے جب بھی تم سے کچھ پوچھایا جاننا چاہا تو تم نے مجھے اِس تفصیل سے بتایا کہ جیسے تم کوئی فایل کھولے مجھے جواب دے رہی ہو۔ مجھے لگا کہ تم ایک متحرک انسا کلائیو پیڈیا ہو جہاں سے ہر قسم کی اطلاع حاصل کی جا سکتی ہے۔

مجھے جو بھی جاننے کی ضرورت ہوتی، وہ فائیلیں پھرولنے کے بجائے تمھیں اپنے سامنے بٹھا لیتا۔ مجھے تمھارا اِس قسم کا بے نیازی سے ڈھکا ہوا غرور پسند آیا۔ اب میں تمھیں اپنے سامنے بٹھانے لگا۔ جب میں نے پہلی مرتبہ تمھیں اپنے سامنے بٹھایا تو مجھے ایک طرح خوف زدگی کا احساس ہو رہا تھا۔ تم مجھے ایسے دیکھ رہی تھیں جس طرح ماں اپنے بھوکے بچے کو دلاسہ دینے کے لیے دیکھتی ہے۔ مجھے تمھارے اعتماد سے چڑ بھی ہوئی۔

میں اب تمھیں اپنی میز پر بلانے لگا۔ تم لاپرواہی میں ڈوبی اپنی ذہانت کے ساتھ میرے سامنے موجود ہوتیں اور میں خاموش بیٹھا کچھ کہنے کی کوشش کرتا رہتا۔ تمھارے وہاں آنے کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیے جس کے لیے میں سوچتا رہتا؛ مجھے کوئی بھی سبب بنتے ہوئے محسوس نہ ہوتا اور مجھے محسوس ہوتا کہ تم وہاں بیٹھیں میرا تمسخر اُڑا رہی ہو۔

- پھر میں تمھارے اِس رویے کا عادی ہونے لگا۔

اب میرے اندر بھی ایک تبدیلی آ گئی تھی۔ میں تمھارے اِس رویے کو جذب کرنے لگ گیا تھا اور تم مجھے اُتنی برتر نہیں لگ رہی تھیں جتنا کہ شروع میں تھیں۔ میں تمھاری سپاٹ چھاتی اور تمھارے بغیر ڈوپٹے کے دفتر میں آنے کا عادی ہو چکا تھا۔ مجھے دوسرے لوگوں کا تو علم نہیں تھا لیکن اب تم اِتنی مانوس لگنے لگی تھیں کہ اگر تمھاری چھاتیاں بھری ہوتیں اور تمھارا سر ڈوپٹے سے ڈھکا ہوتا تو میں شاید تمھیں ملنے سے گریز کرتا۔

میری ذاتی زندگی کیا تھی؟ میرے خیال میں تمھیں علم نہیں تھا اور اِسی طرح مجھے بھی تمھارے متعلق جاننے میں دل چسپی نہیں تھی۔ ہم شاید اُن گاہکوں کی طرح تھے جنھیں صرف سودے سے غرض ہوتی ہے دکان سے نہیں۔ مجھے اب ایک اور اُلجھن نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں سوچتا: کیا تم عورت

پن کی تکمیل پا چکی ہو؟ مجھے اِس اُلجھن نے اپنی جکڑ میں جکڑ لیا۔ میں کبھی سوچتا کہ میں ایسے کیوں سوچتا تھا؟ مجھے اپنے ہی سوال کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملتا اور میں اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں غور کرتا رہتا۔ میں یہ کیسے جان سکتا تھا؟ ایک دِن اپنے وہم یا شک کے بارے میں جاننے کی ترکیب میرے ذہن میں آ گئی۔ تم جب بھی غسل خانے میں زیادہ وقت گزارتیں، میں فوراً تمھارے بعد وہاں گھس جاتا گو وہ عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ تم مکمل عورت بن چکی ہو؟ مجھے اپنے اِس فعل پر شرمندگی بھی ہوتی لیکن کھوج میں لگا رہا اور ایک دِن مجھے خون میں بھیگا ہوا سراغ مل گیا۔ مجھے اتنی طمانیت ہوئی کہ میں تمھارے ساتھ جیسے جنسی رشتے میں بندھ گیا ہوں۔

تمھیں میری ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔

میری ذاتی زندگی میں ایسی کوئی پیچیدگی یا کوئی ایسا انجانا پہلو نہیں تھا۔ میں شادی شدہ تھا اور فرم میں ایک اہم عہدے پر میری تعیناتی تھی۔ میری گھریلو زندگی خوش حال تھی اور مجھے ایسی عورتوں کے ساتھ جن سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا..... مجھے اُن سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ میں اپنے حالات سے کافی حد تک مطمئن ایک مصروف زندگی گزار رہا تھا۔ کچھ مصروفیات تو میری زندگی کا حصہ تھیں اور کچھ کو میں نے خود وجود دیا ہوا تھا اور وہ دوستوں کے ساتھ میری ہر شام کی محفلیں تھیں۔ وہ لوگ لکھنے والے تھے اور اُن سب کے درمیان میں مَیں ایک غیر لکھاری۔ وہ جتنا پڑھتے میں اُن سے زیادہ پڑھتا اور وہ جو لکھتے، میں وہ بھی پڑھتا۔ اِس طرح میں اُن کا ایک مداح ہونے کے ساتھ نقاد بھی تھا۔ میری بیوی کو میری ہر شام کی گھر سے غیر حاضری پسند نہیں تھی اور میری خود وجود دی ہوئی یہ مصروفیت مجھے ازحد پسند تھی۔ چناں چہ یہ ایک ایسی پیچیدگی تھی جس کے بارے میں تمھارا جاننا ضروری نہیں تھا۔

تم جس طرح دفتر میں اپنا رویہ رکھے ہوئے تھیں وہ مجھے پسند تھا..... بطور ایک اعلیٰ افسر کے اور خاموش مداح کے۔ تم دلیر تھیں اور اُس دور میں جب معاشرہ عورتوں کے حقوق سے روگردانی پر مائل تھا تم سب کے لیے ایک چیلنج ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ کردار کا نمونہ بھی تھیں۔ دفتر میں کسی نہ کسی دور میں کسی نہ کسی زنانہ رُکن کے ساتھ ایک آدھ قصہ ضرور جڑا ہوتا لیکن تمھارے ساتھ ایسا کچھ نہیں تھا جب کہ تم ہر وقت یہ دعوت دیتیں کہ ایسا کیا جائے؛ شاید کھوجی کوئی کھوج نہیں نکال سکے تھے۔

ہمارا تعلق خالصتاً پیشہ ورانہ ماحول میں پیشہ ورانہ ڈھنگ سے پروان چڑھتا رہا۔ تم ایک برتر

سی لاتعلقی کے ساتھ میرے سامنے بیٹھتیں، اپنے لیے کوفی کی فرمائش کرتیں اور میرے سوالات کے جواب دیتیں۔ ہم اب ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلف بھی ہو گئے تھے۔ یہ بے تکلفی صرف پیشہ ورانہ معاملات تک ہی محدود تھی۔ ہماری فرم اُس دور کے مطابق اپنے لیے طے کیے اہداف حاصل کرنے میں جدید خطوط پر گامزن تھی کہ دنیا ایک بھونچال سے لرز گئی۔ اُس بھونچال کے جھٹکے ہماری فرم کی دیواروں سے بھی ٹکرائے جس کے نتیجے میں سب اُلٹ پلٹ ہو گیا۔ بزدل لوگ دوسری ملازمتوں کی تلاش میں نکل گئے جب کہ جو چند وہاں وفاداری نبھانے کے لیے کہیں نہیں گئے، ہم دونوں اُن میں شامل تھے۔ پھر ایک دِن سننے میں آیا کہ فرم ہمارے والا دفتر بند کرنے کا سوچ رہی تھی۔ یہ ایک کم شدت کا بھونچال تھا جب کہ اِس کے جھٹکے شدید تھے۔ میں نے تمھارے ساتھ ایک خصوصی ملاقات کرنے کا سوچا۔ میں اِس ملاقات میں دونوں کے اور کمپنی کے مستقبل کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ کمپنی کا مستقبل طے کرنے کا مجھے کوئی اختیار تو نہیں تھا لیکن میرا اپنا مستقبل کمپنی کے ساتھ وابستہ تھا اِس لیے میں کچھ تجاویز کمپنی کے بڑوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا جس کا فیصلہ کرنے کے وہ بھی مجاز نہیں تھے اور اُنھیں امریکہ میں اپنے بڑوں کے ساتھ رابطہ کرنا پڑتا ہوگا۔ میں نے تم سے ساتھ دینے کا کہا اور تجویز دی کہ تم کمپیوٹر پر ہر وقت بین الاقوامی کاروباری مراکز میں مالی حالات کی ہر لمحہ خبر رکھو اور میں اپنے کلائینٹوں کو یقین دہانی کرواتا رہوں گا کہ وہ ہم پر اعتماد رکھیں۔

میں نے کمپنی کے اربابِ اِختیار کو ایک پریزینٹیشن دی جو منظور کر لی گئی۔ ہمیں زمینی منزل پر ایک کمرے کا فلیٹ لے کر دے دیا گیا جہاں تم کمپیوٹر لے کر بیٹھ گئیں۔ فلیٹ میں ایک ہال تھا جو کثیر المقاصد تھا۔ ایک جدید باورچی خانہ تھا اور سہولتوں سے لیس غسل خانہ۔ فیلٹ کے سامنے وسیع پارک تھا جس کا سبزہ ماحول کو ہر وقت ایک تازگی دیے رکھتا اور پیچھے ایک پھلواری تھی جو فلیٹ کا حصہ تھی۔

تم نے اِس فلیٹ کو اپنا مرکز بنا لیا اور میں سارا دِن مختلف دفتروں کے چکر لگاتا۔ ہماری کمپنی سرمایہ کاری میں ملوث تھی اور ملک پر مختلف پابندیوں کی وجہ سے سرمایہ کاری روک دی گئی تھی جو ہمارے کلائینٹس کی شاہ رگ پر چھری چلائے جا رہی تھی۔ میں بنکوں، دفتروں اور سرکاری اداروں کے چکر لگاتا اور امریکہ میں کمپنی کے ہیڈ کوارٹر کو روزانہ رپورٹ بھیجتا جسے یا تو پڑھا ہی نہیں جاتا تھا اور یا پھر پڑھ

کے پھاڑ دیا جاتا تھا۔ میں نے اپنے ارادے میں کسی طرح کی لرزش نہیں آنے دی اور پھر مجھے ایک آدھ جواب طلب سوال موصول ہونے لگا جو میرے لیے کامیابی کی اُمید تھی۔ میں جب بھی فلیٹ میں جاتا تم نے میرے لیے ہمیشہ ایک نئی اطلاع رکھی ہوتی جس پر ہم گفتگو کرتے اور کوئی حل نکالتے۔ یہ دِن تھکا دینے والے تو تھے ہی لیکن ہم نے شکست قبول نہیں کی۔ تم نے مجھے ہمیشہ مزید کرنے کے لیے اُکسایا اور میں نے تمھاری ہر رپورٹ کو ایک پیشہ ورانہ مہارت کا نمونہ قرار دیا۔

یہ پیشہ ورانہ رفاقت ہمیں پیشہ ورانہ طور پر مزید قریب لے آئی۔ مجھے تمھارے اندر ایک اور ہستی بھی نظر آنے لگی۔ مجھے تم دوسری عورتوں سے مختلف تو لگا ہی کرتی تھیں اب تم مجھے ہر پیشہ ور سے بہتر لگنے لگیں اور میں یہ بتانے میں کبھی جھجک محسوس نہ کرتا۔ مجھے تم ہمیشہ اپنی تعریف سے خوش نظر آتیں۔ جب بھی میں تمھاری تعریف کرتا، تمھارا چہرہ کھِل اُٹھتا اور مجھے تمھاری آنکھیں ایک انجانے بھار سے دبی ہوئی محسوس ہوتیں۔ مجھے ہمیشہ لگتا کہ تم ایک مختلف ہستی ہو؛ اپنی جسمانی ساخت کی طرح۔

تم بعض اوقات تھکاوٹ کی بات کرتیں۔ میں نے امریکہ میں کمپنی کے مرکزی دفتر سے رابطہ کر کے ایک بستر نما صوفے کی اجازت حاصل کر لی اور اُس کے بعد تم وہاں کچھ دیر ستا بھی لیتیں۔

ایک دِن کمپنی نے دفتر دوبارہ کھولنے کی ہدایات دیں اور ہم نے سٹاف رکھنا شروع کر دیا۔ اب میں ملک میں تمام آپریشنز کا انچارج اور تم میری ڈپٹی۔ ہمارے لیے اِس سے بڑی کامیابی کیا ہو سکتی تھی؟ کمپنی نے جہاں ہمیں نئے دفاتر کھولنے کا کہا، ایک کمرے والے اُس زمینی منزل والے فلیٹ کے متعلق کوئی ہدایات نہیں دیں اور وہ ہمارے پاس ہی رہا۔ کمپنی کی طرف سے ہماری کوششوں کو سراہا گیا اور ہمارا ذکر کمپنی کے غیر ملکی دفاتر میں ہونے لگا۔ یہ ہماری ایک بڑی کامیابی تھی۔ ہم دو غیر اہم افراد نے اپنی محنت، جدت پسندی اور نامساعد حالات میں شکست تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے اپنے ہی طور ایک تاریخ رقم کر دی تھی جس کی خوشی میں ہم دونوں نے ایک جشن منانے کا فیصلہ کیا۔ ہم دونوں اُس فلیٹ میں اکٹھے ہوئے، موم بتیاں جلا کر کیک کاٹ کر ایک دوسرے کو کھلایا اور اُس نیم روشن کمرے میں مَیں نے اپنے بازو کھولے اور تم اُن میں آ گئیں۔ ہم دیر تک اُسی طرح کھڑے رہے۔ تمھارا سر میری چھاتی پر تھا، میری ٹھوڑی تمھارے بالوں پر اور بازو تمھارے دبلے بدن کو بھینچے ہوئے تھے۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ ایک جوان عورت میری بانہوں میں ہے، میرے اندر کسی خواہش نے سر نہیں اُٹھایا اور تم بھی

میرے ساتھ چھٹی تو رہیں لیکن مجھے تمھارے چمٹنے میں کسی لمحے بھی کوئی دعوت موصول نہیں ہوئی۔ کیا یہ ایک احترام تھا یا خوف؟ میں ایک خواب میں گم دیوار کی طرح کھڑا تھا جس کے گرد تازہ کونپلوں والی بیل لپٹی ہوئی تھی اور موسم بھی ساکن تھا۔ ہم نے اپنے لیے رات کا کھانا آرڈر کیا ہوا تھا اور اگر ڈلیوری والا نا آتا تو ہم شاید صبح تک اُسی طرح کوئی حرکت کیے بغیر کھڑے رہتے۔

ہم نے موم بتیاں بجھا دیں اور پاس سے گزرتی سڑک اور سامنے پارک سے اندر آنے والی روشنی میں کھانا کھاتے ہوئے باتیں کیں یا باتیں کرتے ہوئے کھانا کھایا۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ ہم نے اتنی باتیں کی ہوں۔ ہم کوئی بات مکمل ہی نہ کر سکے اور خاموش بھی نہ ہوئے۔ ہمارے درمیان میں دفتری معاملات کے علاوہ خاموشی کا جو ایک بند تھا وہ شاید اُس اندھیرے نے توڑ دیا تھا اور باتوں کا سیلاب اِس طرح بہہ نکلا تھا کہ روکتے ہوئے بھی رُک نہیں رہا تھا۔ ہم بولے جا رہے تھے، مسکرائے جا رہے تھے اور خوشی کی طغیانی میں دانستہ بہے جا رہے تھے۔

تب مجھے تمھاری شخصیت کا غیر سنجیدہ پہلو نظر آیا، شاید تمھیں میرے اندر بھی نظر آیا ہو۔ تم بات کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کے ایک دم خاموش ہو گئیں۔ تمھارے ہونٹوں پر مسکراہٹ جم کے رہ گئی تھی اور تمھارے گال اُس نیم اندھیرے کمرے میں ایک چمک لیے ہوئے تھے۔ میں نے تمھارا ہاتھ پکڑا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔ تمھارے گال اب بھی چمک رہے تھے لیکن اُن کی چمک کا اب رنگ مختلف تھا۔ وہاں ایک خاموشی تھی جو اُس نیم روشن کمرے میں ہر طرف گردش کر رہی تھی۔ شاید تم اُس خاموشی کا بوجھ نہیں اُٹھا سکیں یا شاید اُس خاموشی کا اپنا ایک اَسرار تھا جس نے تمھیں خوف زدہ کر دیا اور یا پھر وہ خاموشی تھی ہی نہیں صرف ہماری چپ نے اُسے وجود دے دیا تھا۔ تم ایک دم اُسی طرح اُٹھ کھڑی ہوئیں جس طرح خاموش ہو گئیں تھیں اور ایک نظر گھڑی کی طرف دیکھا۔

میں نے ایک ردِعمل کے طور پر بتی جلا دی۔ مجھے روشنی میں تمھارا وہی چہرہ نظر آیا جو میں روز دیکھتا آیا تھا!

ہم اب ہفتے میں تین بار فلیٹ میں ملتے۔ تم وہاں اپنا کمپیوٹر لے آئی تھیں اور کمپنی والا وہاں سے دفتر منتقل ہو گیا تھا۔ فلیٹ کی ایک ایک چابی ہم دونوں کے پاس تھی۔ ہم اُس کمرے میں ملتے اور ہماری ملاقات میں کبھی پیشہ ورانہ مسائل پر بات نہ ہوتی۔ ہم وہ مسائل دفتر میں ہی چھوڑ آتے اور ہم

اُس کمرے میں ایک ایسی زندگی کا آغاز کر چکے تھے جس کا ہمیں خود بھی علم نہیں تھا۔ میں شادی شدہ تھااور تمھاری منگنی ایسے آدمی سے ہو چکی تھی جو تمھیں پسند تھا لیکن تم جب بھی اُس کمرے میں آتیں صرف میرے لیے آتیں۔ ہم ایسی باتیں کرتے جو کبھی ختم نہ ہوتیں اور ہم حسبِ معمول بولے جاتے۔ میں سوچتا: کیا بولے جانا ہی ہمارا تعلق تھا؟ کیا تم مجھے پسند تھیں؟ یا کیا تم مجھے پسند کرتی تھیں؟ میں ایک بے یقینی کا شکار تھااور یہ بھی سوچتا کہ تم میری طرح شاید اپنی کسی بے یقینی کا شکار تھیں۔ مجھے کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ تم مجھے پسند کرتی ہو۔

ہم ایک عجیب قسم کے رشتے میں سے گزر رہے تھے۔ ہماری کمپنی اپنے کام کا از سرِنو آغاز کر رہی تھی اور ہم دونوں اُس کے ملک میں دوبارہ قدم جمانے میں ایک ستون کی طرح تھے۔ ہم لوگوں سے ملتے جن میں بینکار، سرمایہ کار، صنعت کار، زمین دار، سرکاری اہل کار اور غیر وابستہ لوگ شامل تھے۔ ہم دفتر میں ہی ایک دوسرے کے کام کا تجزیہ کرتے اور اگلے دِن کی مصروفیات کا فیصلہ ہوتا۔ ہم جب دفتر سے نکلتے تو تھکاوٹ سے چور ہوتے اور شام کو جب کمرے میں ملتے تو ہمارے اندر ایک تازگی ہوتی۔

ایک شام میں کمرے میں گیا تو تم اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھیں۔ کمرے میں کوفی اور سگریٹ کی خوشبو تھی۔ یہ میرے لیے ایک حیران کن بات تھی۔ تمھارے دائیں ہاتھ کی طرف کوفی کا مگ تھااور دوسری طرف ایش ٹرے میں سلگتا ہوا سگریٹ۔ تم مجھے دیکھ کے مسکرائیں اور سگریٹ اُٹھا کر ایک کش لینے کے بعد پھر مسکرائیں۔ تمھاری اُس مسکراہٹ میں شرارت کے ساتھ خجالت بھی تھی۔ میں نے اپنے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آنے دیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میرا تاثر کیا ہونا چاہیے۔ تم نے اُسی مسکراہٹ میں بتایا کہ تم افسانے بھی لکھتی ہو اور چوں کہ میں ایک زبانی قسم کا نقاد تھا اُس کے افسانوں پر رائے دیا کروں۔

یہ ہمارے تعلق کا ایک نیا رُخ تھا۔

تم نے بتایا کہ تمھارے والد ایک chain smoker تھے اور اُنھیں سگریٹ پیتے دیکھ کے تم ایک عجیب قسم کی رومانویت کا شکار ہو جاتیں۔ تمھیں محسوس ہوتا کہ زندگی کے ہر کام کا آغاز اور اختتام سگریٹ کے پینے سے ہی ہوتا ہے۔ تم نے بتایا کہ تم سگریٹ صرف اُسی وقت پیتی ہو جب افسانہ لکھ رہی ہوتی ہو۔ سگریٹ کا کش اور ناک کے راستے نکلتا ہوا دھواں تمھیں تخلیقیت کے کسی بلند مقام پر

لے جاتے ہیں جہاں تم خود کو دوسروں سے مختلف سمجھتی ہو۔ میں نے دیکھا کہ تم سستے قسم کے سگریٹ پیتی ہو اور تم نے اعتراف کیا کہ کبھی کبھار تمھیں کھانسی کا دورہ بھی پڑ جایا کرتا ہے۔

میں ہر ملاقات کے لیے آتے ہوئے مہنگے سگریٹوں کی ڈبیہ لے آتا؛ پتا نہیں میں تمھیں پینے سے منع کیوں نہیں کرتا تھا!

تمھارے افسانے ایک مبتدی کی تحریریں تھیں لیکن اُن میں ایک کہنہ مشق لکھاری کا عکس بھی تھا۔ مجھے اُن ناپختہ قسم کی تحریروں میں ایک ایسی سوچ کا پہلو نظر آتا جو ہم عصر لکھنے والوں کے ہاں نہیں تھا۔ میں نے یہ سب تمھیں نہیں بتایا اور تمھیں لکھے جانے پر اُکساتا رہا اور تم میری حوصلہ افزائی پر لکھتی رہیں۔ تم کمرے میں مجھ سے پہلے پہنچ جاتیں اور میرے آنے تک کافی لکھ چکی ہوتیں۔ میں تمھاری ہمت اور طاقت کی داد بھی دیتا۔ مجھے حیرت ہوتی کہ اتنی دھان پان سی عورت زمین کے اندر اتنا گڑی ہوئی ہے!

فلیٹ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لانے کا ایک ذریعہ تھا۔ میں نے سنا تھا کہ لوگوں کو زندگی کے معاملات اور مسائل ایک دوسرے کے قریب لاتے آئے ہیں لیکن ہمارے لیے یہ بند کمرہ ہی وہ راستہ تھا جو ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کی منزل تک لے گیا۔ کیا ہم ایک دوسرے کو سمجھتے تھے؟ تم مجھے یقیناً نہیں سمجھتی تھیں اور میں بھی تمھیں نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ میری بیوی اور تمھارا منگیتر ہمارے راستے میں حائل نہ ہوتے ہوئے بھی حائل تھے۔ ہم آپس میں وہ رشتہ قائم نہیں کر سکے تھے جو اُن سے ورا ہوتا۔

وہ یقیناً ہمارے درمیان میں حائل تھے!

کیا میں تمھارے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کرنا چاہتا تھا؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں ایک اُلجھاؤ پیدا کرتا اور میرے پاس اِس کا کوئی جواب نہ ہوتا۔ میں سوچتا: کیا جسمانی تعلق کے علاوہ بھی کسی عورت اور آدمی کا کوئی رشتہ ہے؟ اور ایک زہرخند کے ساتھ میرے ذہن میں فوراً خیال آتا؛ ہم دونوں کا۔ اب اچانک مجھے یہ رشتہ ایک بے تکمیلی اور تشنگی کا شکار نظر آتا۔ کیا میں تمھیں ورغلاؤں یا قائل کروں ؟ پھر مجھے ایک مایوسی کا احساس ہوتا کہ کیا ایک سپاٹ چھاتی والی عورت کسی مرد کی تکمیل کا سبب ہو سکتی ہے؟ میں نے اپنے ذہن میں کئی کتابوں اور فلموں کے بارے سوچنے کی کوشش کی جو ایسے موضوع پر ہوں لیکن مجھے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ میرے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ پھیل گئی جس میں دل چسپی کے

ساتھ ایک بے بسی بھی تھی۔ میں شادی شدہ ہونے کے باوجود تکمیل کی تلاش میں تھا اِسی لیے مجھے تم جیسی عورت اچھی لگی جس کے ساتھ میں جنسی تعلق قائم کرنے سے خائف تھا کہ تمھارا سینہ سپاٹ تھا۔ مجھے کبھی خیال آتا کہ تم ماں بن کر اپنے بچے کو دودھ کیسے پلاؤ گی؟ مجھے اپنی سوچ پر ہنسی کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوتا کہ میں تمھارے بارے میں ایسی باتیں سوچتا ہوں جن کے بارے میں سوچنا مجھے زیب نہیں دیتا۔

ہمارے بیچ شاید ذہنی مطابقت کم ہونے کے باوجود باہمی اعتماد کی فراوانی تھی۔ تم مجھے ملنے سے کبھی کتراتی نہیں تھیں لیکن میرے ساتھ اپنے منگیتر کے ذکر سے ہمیشہ گریز کرتیں حال آنکہ وہ تمھیں پسند بھی تھا۔ یہی بات ذہنی مطابقت کے نہ ہونے کے ساتھ گہرے اعتماد کو بھی ظاہر کرتی کیوں کہ تم شام کے گہرے ہونے تک میرے ساتھ اُس کمرے میں رہتیں اور تمھیں تب کسی قسم کا خوف نہیں ہوتا تھا۔ تم کوفی کے گھونٹ کے ساتھ سگریٹ کا کش لیتیں اور یکسوئی کے ساتھ اپنے کمپیوٹر پر فقروں کو شکل دینے میں مصروف ہوتیں۔ میں صوفے پر بیٹھا تمھارے کمپیوٹر پر کمپوز کرنے کی rhythmatic آواز میں کھو جاتا۔

میں معمول کے مطابق اِسی آواز میں گم تھا کہ تم نے میری طرف دیکھے بغیر بتایا کہ تمھاری شادی کا دن طے کیا جا رہا تھا۔ میرے اوپر بجلی تو نہیں گری لیکن میں سکتے ضرور آ گیا۔ میں کیا جواب دیتا۔ تم لفظ لکھے جا رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ میں سکتے کی کیفیت میں کیوں تھا؟ میرا جسم تو ایک طرح سے بے جان تھا لیکن دماغ کام کیے جا رہا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جنگل بھی اپنا دفاع کرنا جانتے ہیں۔ مجھے تم سے شادی کے بارے میں جاننے کی پریشانی ہونی چاہیے اور نہیں بھی۔ یہ شادی جلد یا بدیر تو ہونی ہی تھی اِس لیے میں نے اپنے حواس کو قابو میں رکھنے کا فیصلہ کیا۔

تم نے سگریٹ کا کش لیا اور دھواں ناک میں سے باہر نکالا!

مجھے اچانک تم ایک خود غرض عورت لگیں۔ تمھاری منگنی ہو چکی تھی تو مجھے اپنے اتنا قریب کیوں آنے دیا یا میرے اتنا قریب کیوں آئیں؟ تم جب چلی گئیں تو میں اکیلے زندگی گزار سکوں گا؟ میں کسی بھی طرح اکیلا نہیں تھا، میری بیوی تھی اور شام کی دوستوں کی محفلیں جہاں ادب پر دیر تک بحثیں ہوتا تھیں اور میں نے تمھارے افسانوں کا بھی ذکر کرنا تھا۔ یہ بھی درست تھا کہ میں نے اکیلے ہی رہ جانا تھا۔ ہم ایک ایسی ساجھے داری بنا بیٹھے تھے جس کا متبادل کہیں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا تم نے اکیلے نہیں ہو

جاتا تھا؟ کیا تمھاری زندگی میں میری کمی نہیں ہو جاتا تھی؟ کیا میں نے تمھارے ساتھ ہر وقت موجود نہیں ہوتا تھا؟ تم نے یقیناً ہر قدم پر میری کمی محسوس کرنا تھی اور مجھے تم خود غرض بھی محسوس ہونے لگی تھیں۔

تم نے میری طرف دیکھے بغیر کہا کہ میں تمھاری شادی پر آؤں!

مجھے یہ ایک مذاق لگا۔ تم چاہتی تھیں کہ میں تمھیں کسی اور کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھوں؟ میں بھی تو ہر شام تمھارے قریب سے اُٹھ کر کسی اور کے پاس چلا جایا کرتا تھا۔ مجھے تمھارے کسی کے ساتھ چلے جانے پر اعتراض کیوں تھا؟ میں نے صرف ایک بار تمھیں اپنے ساتھ لگایا تھا اور اُس گلے لگانے میں ایک احترام اور خوف تھا اور ہاتھ چومنے میں محبت اور دعوت تھی جسے تم نظر انداز کر گئیں۔ میں تمھاری شادی پر کیوں نا آؤں؟ تم نے کبھی تو کسی کے ساتھ جانا ہی تھا اور میں تمھیں کیسے روک سکتا تھا؟

اُس رات ہمارے جدا ہونے میں ایک اُداسی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب ہم کبھی نہیں مل سکیں گے اور بچھڑنے سے پہلے میں تمھیں گلے لگانا چاہتا تھا..... احترام اور خوف کے ساتھ نہیں..... ایک ایسے جوش کے ساتھ جو مجھے بعد میں تمھاری یاد دلاتا رہے۔ لیکن تم کمرے کے اندھیرا ہونے سے پہلے ہی باہر نکل گئیں اور کمرے کو مجھے تالا لگانا پڑا۔

صبح دفتر میں مَیں ایک بے یقینی کے سفر پر چل نکلا۔ جن ملکوں کے لوگ تلاشِ روزگار میں نقل مکانی کر کے دوسرے ممالک میں جاتے ہیں اُنھیں کبھی وہاں سکون نصیب نہیں ہوتا کیوں کہ وہ وہاں سکون کے بجائے دولت کے متلاشی ہوتے ہیں۔ ہم اُن خانہ بدوشوں کی طرح نہیں تھے لیکن ہمیں سکون کی بھی تلاش نہیں تھی۔ وہ لوگ دوسرے ممالک میں جا کر اپنی شناخت کو قائم رکھنے یا تلاش کرنے کی کوشش میں اپنی شناخت کھو بیٹھتے ہیں۔ ہمیں کس چیز کی تلاش تھی؟ ہم اپنی اپنی شناخت قائم رکھے ہوئے تھے اور کیا ہمیں ایک دوسرے کی تلاش تھی؟ نہیں! ہم شاید کسی بھی تلاش میں نہیں تھے۔ ہمارے سر پر تمھارے منگیتر اور میری بیوی کی تلوار تھی جسے ہم کند سمجھتے آئے تھے لیکن اب اُس نے ایک ہی وار میں ہمیں جدا کر دیا تھا۔ مجھے تمھارے معاشی پس منظر کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ میرا تعلق تو متوسط طبقے کے اُس حصے سے تھا جو اپنی سفید پوشی اور بقا کے لیے صبح شام کوشاں رہتے ہیں اور اِس کوشش کو جاری رکھنے کے لیے ریلے ریس کا ڈنڈا اگلی نسل کو تھما جاتے ہیں۔ تم بھی شاید میری ہی طرح تھیں اِسی لیے سستے سگریٹ پیتی تھیں؟ یا تمھیں کوئی دل چسپی ہی نہیں تھی؟ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں تمھاری شادی

پر چلا گیا تو یہ پردہ اُٹھ جائے گا جسے میں لٹکتا ہی رکھنا چاہتا تھا۔

میں نے تمھاری شادی پر نہ جانے کا فیصلہ کر لیا اور اِس فیصلے نے مجھے ایک طاقت دی۔ مجھے لگا کہ میں اب آزاد ہوں۔ دوسرے ممالک میں تلاشِ روزگار کے سلسلے میں جانے والے کبھی آزاد نہیں ہوتے۔ وہ اپنی اور اپنے نئے ملک کی اقدار میں جکڑے ہوتے ہیں۔ کیا تم بھی آزاد ہو گئی تھیں؟ یہ کون بتا سکے گا؟ اب شاید ہم کبھی مل نہ سکیں اور یہ معما کبھی حل ہی نہ ہو سکے۔ میری آزادی کا دورانیہ اتنا ہی تھا کہ میں آزاد ہوتے ہی تمھاری زنجیروں میں جکڑا گیا۔ میں پھر قید تھا اور مختصر سی آزادی نے مجھے کوئی لطف نہیں دیا۔

میں اب بالکل آزاد تھا، اتنا آزاد کہ میرا کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ دفتر ایک ایسی جگہ تھی جہاں تم ہر طرف موجود رہی تھیں اور ایک دِن تم نے وہاں کہیں بھی نہیں ہونا تھا۔ مجھے دفتر اپنا دشمن لگنے لگا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میرے ماتھے پر ہر وقت شکنیں ہوتیں جو تمھارے لیے پریشان کن تھیں۔ میں اپنے آپ کو حوصلہ دیتا کہ اُن دنوں میں تم اُس حالت میں تھیں جب ہر عورت پریشان ہوا کرتی ہے۔ مجھے مایوسی اور اکلاپے نے اتنا پریشان کیا کہ میں نے دفتر چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ تمھیں اپنے اِس فیصلے سے آگاہ کر دوں لیکن پھر خیال آیا کہ تمھارے ذہن میں کئی سوال اُٹھیں گے جو اُس وقت تمھارے ذہن میں نہیں ہونے چاہئیں۔ تمھاری حالت بھی میری بیوی والی تھی لیکن حالات مختلف تھے۔

میں نے کمپنی کو اطلاع کر کے دفتر جانا چھوڑ دیا۔ اب میرے سامنے وہ راہیں تھیں جن پر تمھارے قدموں کے نشان تھے۔ میں ہر طرف جاتا سوائے اُس فلیٹ کے جہاں کوفی اور تمھارے سگریٹوں کے دھوئیں کی خوشبو ابھی تک قید ہوگی۔ کمپیوٹر کی میز کی دراز میں سگریٹوں کی وہ کئی ڈبیاں پڑی ہوں گی جو ابھی تک کھولی نہیں گئی تھیں اور جن کے بارے میں تم کہا کرتی تھیں کہ تم اُنھیں اپنی پان سگریٹ کی دُکان پر بیچا کرو گی۔ میں نے سوچا: مجھے اُس فلیٹ میں جانے کا ڈر کیوں ہے؟ کمپنی نے کسی دِن اُسے واپس لینا ہے تو مجھے وہاں پڑے سامان کی فہرست بنا لینا چاہیے۔ مجھے دنیاوی معاملے کو اپنے خوف پر حاوی ہونے پر حیرت بھی ہوئی۔

میں فلیٹ کے سامنے کھڑا تھا اور مجھے تمھارا بانہوں میں آ جانا یاد تھا۔ کھڑکی تب کھلی تھی اور

پارک کی روشنی اُس میں سے اندر آ رہی تھی اور تم ایک بیل کی طرح میرے بدن کی دیوار کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں۔ مجھے پھر ایک خوف نے اپنی گرفت میں لے لیا اور میں نے بظاہر خوف کو نظر انداز کرتے ہوئے تالا کھولا۔ میں بوکھلاہٹ میں اندر داخل ہوا تو کوفی اور سگریٹ کی خوشبو نے میرا استقبال کیا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ تالا تو پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔ کمرے میں کمپیوٹر کی سکرین کی روشنی تھی اور مجھے 'کی بورڈ' پر لفظ بنائے جانے کی rhythmatic آواز نے جکڑ لیا۔ میں سحر زدہ وہاں کھڑا تھا کہ تم نے میری طرف دیکھا۔ میں اپنی نیم خوابیدگی سے باہر آیا۔ میں نے تمھاری آنکھوں کی زبان سمجھنے کی کوشش کی۔ تم اپنے پتلے چہرے پر نمایاں آنکھوں سے مجھے دیکھے جا رہی تھیں۔ مجھے وہ آنکھیں بے تاثر لگیں، تم شاید میری آنکھیں پڑھنا چاہتی تھیں، میری آنکھوں میں کیا تھا؟ میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ تب تم نے کافی کا گھونٹ لے کے چھوٹا سا کش لیا اور مجھے اطلاع دی کہ نامکمل افسانہ مکمل کرنے کے لیے کئی شامیں وہاں گزار رہی تھیں لیکن میں کبھی نہیں آیا تھا۔ پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا پھر خیال آیا کہ فوجی غلط فیصلہ کرے تو کئی جانیں جاتی ہیں، سیاست دان غلط فیصلہ کرے تو ملک تباہی کے دہانے پر آ جاتا ہے، دانش ور غلط فیصلہ کرے تو نظریہ خطرے میں پڑ جاتا ہے اور اگر عاشق..... میں آگے بڑھا اور 'کی بورڈ' پر چلتی ہوئی تمھاری انگلیاں اپنی گرفت میں لے کر......!

موڑ

گلی اور گھر میں کوئی خرابی تو نہیں تھی لیکن صابر دونوں سے تنگ تھا!

وہ ایک سرکاری دفتر میں نائب قاصد تھا۔ اُسے حیرانی ہوئی جب پتا چلا کہ کچھ عرصہ پہلے قاصد کو چپڑاسی کہتے تھے۔ اُسے لفظ چپڑاسی سے ایک انسیت محسوس ہوئی۔ اُس کے گھر میں بھی کسی نہ کسی وجہ سے کسی کو چپڑاسی کا خطاب دے دیا جاتا اور دوست بھی ایسے ہی کہتے۔ چپڑاسی اُسے اپنا سا لگتا آیا تھا اور اب جب وہ چپڑاسی کے بجائے نائب قاصد بن کے چپڑاسی گیری ہی کر رہا تھا تو اُسے نائب قاصد ہونا اجنبی سا لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ امیر لوگ اپنے گھر میں کام کرنے والے کو تنخواہ دار کہنے کے بجائے نوکر کہنا پسند کرتے تھے۔ نوکر کہنے سے وہ اُس کی تضحیک نہیں کر رہے ہوتے تھے؛ اُنھیں تو اپنی برتری مقصود تھی۔ قاصد، چپڑاسی کو برتر بنانے کے لیے کہا جاتا تھا۔

وہ اپنی یہ زندگی اِسی گھر میں رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے باپ نے اپنی اب تک کی زندگی اِسی گھر میں گزار دی تھی اور جو باقی تھی وہ بھی یہیں گزارے گا؛ اور اُس نے جانا کہاں ہے؟ اُسے شاید اِس گھر کے باہر زندگی گزارنے کا پتا ہی نہیں تھا۔ وہ خود بھی جب کبھی کسی عزیز کے ہاں دوسرے شہر میں جاتا تو اُس کے لیے وہاں رات گزارنا مشکل ہو جاتا۔ وہ سوچتا: صابر میاں! اپنے گھر سا سکون اور آرام کہیں اور میسر نہیں ہو سکتا۔ اُسے اپنا صحن، ماں باپ کی بے وجہ کی لڑائی جو اپنائیت میں ڈوبی ہوتی، بھائیوں کی آپس کی بحث اور اُس کی اپنی ہر کسی سے لاتعلقی وہاں یاد آتی۔ وہاں وہ سوچتا کہ کسی نئے گھر

،اجنبی گلی میں زندگی گزاری جا سکے گی؟ وہ اپنے گھر پہنچنے کے لیے بے تاب ہوا اُٹھتا اور بعض اوقات اُسی وقت نکل پڑتا۔

صابر کو جب ملازمت کا حکم نامہ ملا تو اُس میں شرط تھی کہ وہ نو مہینوں کے بعد پکا ہوگا۔ اُسے یہ نو مہینوں کا امتحان عجیب لگا۔ وہ ماں کی کوکھ میں بھی نو مہینے رہا تھا۔ ماں کی کوکھ کے نو مہینے تو کسی کو یاد نہیں ہوتے لیکن اُس نے آزمائش کے دنوں میں ہر کسی کو مرعوب کرنا تھا۔ ماں کی کوکھ میں وہ کسی کو نظر نہیں آتا تھا لیکن ہر کوئی اُسے کسی نہ کسی شکل میں دیکھ رہا ہوتا۔ اندازے لگائے جاتے کہ وہ لڑکی ہوگی یا لڑکا؟ ماں کی شکل کا ہوگا یا باپ کی یا پھر اپنے ہی نین نقش لے کے آئے گا؟ دفتر میں سب کے سامنے بیٹھے ہونے کے باوجود وہ کسی کو نظر نہ آتا۔ ہر کوئی آواز دے کر یہی پوچھتا: کہاں مرے رہتے ہو؟ اُسے یہ فقرہ دن میں بیسیوں دفعہ سننا پڑتا اور ہر بار اُسے محسوس ہوتا کہ اُسے بے لباس کر دیا گیا ہے اور ساتھ ہی خیال آتا کہ وہ اُسے اگر برہنگی کی حالت میں دیکھ لیں تو کتنا لطف رہے گا اور اُن سب کے چہروں کے تاثرات کیا ہوں گے؟ یہ خیال آتے ہی وہ اپنی کڑواہٹ بھول جاتا اور اُن کی بے بسی پر اُسے ترس آنے لگتا کہ وہ اُس کے بغیر کسی کام کے نہیں ہیں۔

پکا ہونے سے پہلے وہ دفتر کے باہر برآمدے میں بیٹھا کرتا تھا۔ وہ کھڑکی کے سامنے ایسے بیٹھتا کہ بابوؤں کی میزیں اور صاحب کے دفتر کا بند دروازہ اُس کی نظر میں ہوتے۔ صاحب تو اُسے دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن بابو اُسے دیکھ رہے ہوتے اور بعض اوقات آواز دینے کے بجائے اُسے ہاتھ کے اشارے سے ہی بلا لیتے۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے فرائض میں صرف صاحب کی سرکاری ضروریات پوری کرنا تھا لیکن یہ بھی اُس کے علم میں آ گیا تھا کہ اُس نے بابو بھی خوش رکھنے ہیں۔ اُسے ہر وقت ڈانٹتے رہنے کے باوجود بابو اُس سے خوش تھے؛ صاحب نے کبھی غصے یا اطمینان کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ صابر کو ایک ہی تاثر کے ساتھ دیکھتا خواہ گھنٹی بجنے کے فوراً بعد دفتر میں گیا ہو یا کچھ منٹوں کی تاخیر سے۔ جب بھی اُسے کچھ دیر ہو جاتی وہ خود ہی شرمندگی سے دفتر میں داخل ہوتا اور صاحب اپنے مخصوص تاثر سے دیکھتا۔ وہ چاہتا تھا کہ صاحب کبھی اُس کی تعریف کرے اور اُسے ڈانٹے بھی، اُسے بابوؤں کی تعریف یا ناراضی کی پروا نہیں تھی۔

اُسے ملازمت پر پکا ہونے کی اطلاع صاحب نے دی۔ اُس نے صاحب کو پہلی مرتبہ

مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ صابر کو لگا کہ اُسے یہ اطلاع دیتے ہوئے صاحب کے چہرے اور آنکھوں میں ایک خوشی تھی، ایسی خوشی جو اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ جب صاحب کے دفتر سے نکل رہا تھا تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ دینا کا کامیاب ترین آدمی ہے اور سب اُسے دیکھ کے خوش ہو رہے ہیں۔ وہ جب دفتر سے باہر نکلا تو اُس نے ایک نظر بابوؤں کو دیکھا جو سر جھکا کے اپنے کام میں مشغول تھے۔ ایسا کبھی ہوتا نہیں تھا۔ وہ جب بھی صاحب کے دفتر سے نکلتا؛ کوئی نہ کوئی بابو اُسے دیکھ رہا ہوتا اور وہ اُس کی آنکھوں میں سوال فوراً پڑھ لیتا: سب ٹھیک ہے؟ اِس سوال کا مطلب اُسے بعد میں سمجھ آیا۔ وہ پوچھنا چاہتے تھے: صاحب غصے میں تو نہیں۔ وہ محسوس کر چکا تھا کہ کوئی بابو دفتر سے اپنی چال میں لچک لیے آتا محسوس ہوتا اور کوئی ایسے بھاری قدموں سے چلتے ہوئے آتا کہ قابلِ رحم لگتا۔ جب وہ اپنی خوشی میں خوش اُن کے پاس پہنچا تو سب کام چھوڑ کے مسکرانے لگے اور ہر کوئی ثابت کر رہا تھا کہ اُس کے مستقل ہونے میں اُسی کا ہاتھ تھا۔

اُس نے اونٹ والا قصہ اپنے باپ سے سن رکھا تھا جس نے تنبو میں گھس کر مالک کی جگہ سنبھال لی تھی۔ صابر ایسے تو نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ اُس کے پاس بابوؤں کو نکال باہر کرنے کی تعلیمی اہلیت نہیں تھی لیکن وہ اپنے پکا ہونے کا فائدہ ضرور اُٹھا سکتا تھا۔ اُس نے اب کھڑکی کے پاس برآمدے میں بیٹھنا بند کر کے صاحب کے دفتر اور بابوؤں کے دفتر کو ملانے والی راہداری میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ پہلے وہ بابوؤں کو کھڑکی میں سے دیکھا کرتا تھا اور اب وہ اُن کی باتیں سنتا تھا۔ وہ عمر میں اُس سے زیادہ تھے اور اُن کی تعلیمی اہلیت بھی اُس سے زیادہ تھی ورنہ وہ اُس کی جگہ پر ہوتے اور وہ اُن میں سے کسی کی کرسی پر۔ اُسے اُن کی باتوں پر حیرت ہوتی۔ جب بھی موقع ملتا یا کوئی نئی فائل اُن تک پہنچتی، وہ حکومت وقت کو خوب رگیدتے جیسے اُنھیں کوئی ذاتی رنجش ہو۔ صابر اِس کی وجہ ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔ اُسے اب یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ہمیشہ سے ہی حکومتِ وقت کے خلاف رہے تھے کیوں کہ حکومتیں وہ سب کرنے میں ناکام رہتی تھیں جو وہ چاہتے تھے۔ صابر اُن کے لیے کینٹین سے چائے اور سموسے لاتا تھا اور جب وہ اُن سے پیسوں کا تقاضا کرتا تو وہ مہنگائی کا دکھڑا لے بیٹھتے۔ وہ اُن کی زندگیوں کا اپنے حالات سے موازنہ کرتا رہتا۔ اُس کی تنخواہ اُن سے کافی کم تھی لیکن پھر بھی اُسے اپنی زندگی میں مہنگائی کا سانپ کہیں بھی ڈستے ہوئے محسوس نہ ہوتا۔ اُس کے گھر میں حالی آسودگی تو نہیں تھی لیکن تنگ دستی کا بھی نام و

نشان نہیں تھا۔ اُس کی ماں ہی گھر کا نظام چلا رہی تھی اور اُس کے ہونٹوں سے کبھی حرفِ شکایت نہیں نکلا تھا۔ وہ اُسے ہمیشہ مطمئن اور خوش نظر آتی۔ اِس طمانیت کی وجہ اُن تینوں بھائیوں کا ملازمت پر ہونا بھی تھا جو اُسے ہر مہینے کے آغاز میں تنخواہ کا زیادہ حصہ تھما دیتے۔ صابر کا بڑا بھائی ایک پرائیوٹ سکول میں گیٹ کیپر تھا۔ سکول کی انتظامیہ نے اُسے ایک موٹر سائیکل دیا ہوا تھا۔ ہر صبح وہ سکول کی وردی پہن کے..... جو ٹریفک وارڈنوں کی وردی سے ملتی جلتی تھی..... گھر سے نکلتا۔ اُس نے ٹریفک وارڈنوں کی طرح چالان کی کاپی سے ملتی جلتی ایک کاپی ہینڈل اور پٹرول کی ٹینکی کے درمیان کی وتھ میں پھنسائی ہوتی۔ دوسرا بھائی ایک سٹور میں سنئیر سیلز مین تھا اور وہ صبح دس بجے سے رات بارہ بجے تک کام کرتا۔ اُن تینوں کا ملازمتوں پر ہونا کسی سفارش کی وجہ سے نہیں تھا۔ اُن کا باپ ایک پٹرول پمپ پر معمولی سی ملازمت کرتا رہا تھا۔ اُس کی قلیل تنخواہ میں گزارا کرنے میں اُن تینوں بھائیوں کا بھی دخل تھا۔ بڑے کے لیے دوپہر کو ہمیشہ دو روٹیاں بنتیں اور وہ آدھی روٹی صابر کے لیے بچالیتا۔ اُن میں درمیان والا بھائی پیٹو مشہور تھا۔ اُس کے لیے روزانہ تین روٹیاں بنتیں اور وہ دو کھاتا جب کہ ایک اپنے چھوٹے بھائی کے لیے بچالیتا۔ صابر کے لیے دو روٹیاں بنتیں جن میں سے وہ آدھی بچالیتا اور یہ بچی ہوئی دو روٹیاں صبح پالتی سے چوپڑ کے ناشتے میں دی جاتیں۔ باپ نے تینوں بھائیوں کو، جتنا وہ پڑھ سکتے تھے، پڑھایا لیکن ملازمت پر رکھ لیے جانے کی اصل وجہ اُن کا خوش شکل ہونا تھی۔ اُن کی ماں خوب صورت تھی لیکن قد چھوٹا تھا جب کہ باپ خوش شکل نہ ہوتے ہوئے دراز قد تھا اور یہ اُن کے والدین کے بیچ ایک ہنسی کھیل کی لڑائی کی وجہ بھی رہتی کہ بچے کس پر گئے ہیں؟ صابر کبھی سوچتا کہ اُس کی اُکتاہٹ کی وجہ ماں کا رویہ بھی تھا۔ وہ ایک گاڑی بان کی طرح اطمینان کے پائدان پر کھڑی سب پر نظر رکھے ہوئے تھی اور گھر میں کسی کو کچھ اختیار نہیں تھا۔ اُس کے دونوں بھائی ایسی زندگی سے خوش تھے جس میں اُن کی سوائے اپنی ملازمتوں کے اور کوئی ذمے داری نہیں تھی۔ کبھی وہ سوچتا کہ گھر میں ایک اور عورت بھی ہونی چاہیے تا کہ ماں کی اجارہ داری ختم ہو اور یہ تبھی ممکن تھا کہ اُسے کہا جائے: ''بے جی! گھر میں ایک بہو ہی لے آؤ تا کہ توازن کچھ تو برابر ہو۔ صابر کو خیال آتا کہ کہیں وہ ماں کی گرفت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کسی اور جگہ رہنے کے لیے جانا چاہتا ہے؟ اُسے خیال آتا کہ اپنے گھر کے علاوہ جہاں وہ ماں، باپ اور بھائیوں کی موجودگی کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ کسی عزیز کے گھر رات گزارنا ایک وبال بن جاتا تھا، کہیں

اور رہ سکے گا؟ اگر وہ کہیں منتقل بھی ہو گیا تو ماں سے ملنے ضرور آیا کرے گا کیوں کہ تینوں بھائی سونے سے پہلے ہمیشہ ماں کے پاس کچھ دیر بیٹھتے تھے اور اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے پھر واپس پلٹا کرے گا کہ یہ دیکھنے کے لیے کہ ماں کہیں جاگ تو نہیں رہی؟ اور وہ ایسے ہی چکر کاٹتا رہے گا کہ صبح ہو جائے گی۔ اُسے ماں کی اجارہ داری ہی اپنے مسئلے کا حل لگتا۔ وہ ماں کی برتری قبول کرنے کے بعد پھر اِسی سوچ میں محو ہو جاتا کہ اپنے گھر اور گلی سے تنگ آ چکا ہے۔

صابر اب اپنے بابوؤں کے پاس بیٹھا مہنگائی کا رونا سنتا رہتا۔ اُسے اب مہنگائی کے رونے سے بھی اُکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ اُس نے بھوک دیکھی اور سہی ہوئی تھی کیوں کہ وہ ایک عرصہ پیٹ بھر کے کھا نہیں سکا تھا۔ شاید اِن بابوؤں میں سے کسی نے اتنی بھوک نہ دیکھی ہو جتنا وہ بھوکا رہا تھا اور اب جب اُس کا پیٹ بھر رہا تھا تو یہ مہنگائی کا رونا اُسے بے کار کی بحث لگ رہا تھا۔ جب سے وہ بابوؤں کی باتیں سننے لگا تھا، اُس کی نظر میں اُن کی اہمیت نہیں رہی تھی۔ اب اُس کی توجہ کا مرکز صاحب تھا۔ وہ جب صاحب کے دفتر میں جاتا تو وہ تین کاموں میں سے ایک کر رہا ہوتا۔ وہ فائل سامنے رکھے اُس کے الفاظ کی گہرائی میں اتنا غرق ہوتا کہ اُسے صابر کے دفتر میں آنے کا پتا ہی نہ چلتا۔ کبھی وہ سرکاری ٹیلی فون پر بات کر رہا ہوتا۔ اُس کی کسی نئے منصوبے کو تعطل کا شکار کرنے کے لیے اپنے کسی ساتھی کے ساتھ مشاورت چل رہی ہوتی۔ وہ اُس منصوبے کو اتنی طوالت دینا چاہتا تھا کہ وہ خود ہی دم توڑ دے یا اُسے ختم کرنے کے لیے مکڑی کے جالے کی طرح اُس میں گنجلیں ہی بنائے چلے جانا چاہتا تھا۔ اگر کوئی بھی منصوبہ کامیابی سے ہم کنار ہو گیا تو دوسرا سر پر آن پہنچے گا۔ صاحب کبھی موبائل فون پر بات کر رہا ہوتا تو وہ مختلف آدمی ہوتا۔ اُس کا لہجہ دھیما، بھاری، مٹھاس سے بھرا ہوا، سوز کے گداز میں بہتا ہوا اور اپنی ہی سرشاری میں گم ہوتا۔ صابر کو اُس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے، اُس تک صرف آواز پہنچتی تھی اور وہ لفظوں کو جاننے کی کوشش ہی نہ کرتا۔

صاحب کس سے باتیں کرتا تھا اور وہ کیا باتیں ہوتی تھیں؟ صاحب کے دفتر کے ساتھ ہی قبر نما ایک تنگ سا کمرہ تھا جس میں اُس کی چائے بنتی۔ وہ چائے کی تھیلی کے بجائے کھلی پتی والی چائے پیتا تھا۔ جب وہ چائے بنا رہا ہوتا اور معمول سے زیادہ وقت لے رہا ہوتا تو اُس کی کوشش ہوتی کہ وہ سمجھ سکے کہ موبائل فون پر کیا کہا جا رہا تھا لیکن اُس کے کانوں تک وہی آواز پہنچتی جس کی موسیقیت سے اُس

کی شناسائی تھی۔ اُسے ایک بار چائے بناتے ہوئے ایک دم خیال آیا کہ اُسے اُکتاہٹ کا احساس کیوں رہتا ہے؟ وہ اپنے گھر کے افراد کے علاوہ جسے بھی جانتا تھا، اُس کے پاس موبائل فون ضرور تھا۔ صرف اُن کے گھر میں یہ کسی کے پاس نہیں تھا۔ اُس نے سوچا کہ بے جی نے کبھی منع تو نہیں کیا تھا لیکن اُس نے کبھی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ موبائل فون کا گھر میں نہ ہونا بے جی کی اجارہ داری کا ایک تسلسل بھی ہو سکتا تھا۔ وہ پاس سے گزرتے لوگوں کو دیکھتا جنھوں نے کانوں کو ٹوٹیاں لگائی ہوتیں اور چٹکی بجا رہے ہوتے یا وہ بات کر رہے ہوتے، اُن کے ہلتے ہوئے ہونٹ اور ہاتھوں کے اشارے اُسے اپنی طرف متوجہ کرتے، وہ سوچتا کہ ایسی کیا ضروری بات ہوگی جو وہ بغیر رکے کیے جا رہے تھے۔ اُسے یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے گھر اور گلی میں تبھی رہ سکے گا اگر اُس کے پاس موبائل فون ہو اور وہ چلتے ہوئے باتیں کرے اور چٹکی بجاتے ہوئے گانے سنے۔

موبائل فون کے لیے ماں کو قائل کرنے کے لیے صابر کو زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑی۔ موبائل فون آنے پر گھر میں تبدیلی کا ایک چھوٹا جشن منایا گیا۔ اُنھیں حیرت ہوئی کہ اُن کے تمام رشتے داروں اور جاننے والوں کے پاس موبائل فون تھے اور اپنی جو برتری وہ محسوس کرتے تھے، یہ سہولت اِن کے پاس آنے سے نہ رہی۔ اب صابر دفتر جاتے ہوئے گانے سنتا اور اگر کسی کی کال آجاتی تو وہ محسوس کرتا کہ وہ بھی اوروں کی طرح ہاتھوں کے اشارے کرتے ہوئے چلا جا رہا ہے لیکن اُسے صاحب کی طرح کی آواز اپنے اندر سے نکلتے ہوئے محسوس نہ ہوتی؛ وہ اُسی طرح بات کر رہا ہوتا جیسے صاحب سرکاری ٹیلی فون پر کیا کرتا تھا۔ کیا صاحب کے اندر دو ہستیاں آباد تھیں جو بوقت ضرورت سامنے آجاتیں۔ صابر اُلجھن میں گرفتار ہو جاتا کہ اگر صاحب کے اندر دو ہستیاں ہیں تو ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار تو رہتی ہوں گی؟ اُس کے پاس اب موبائل فون تھا لیکن اُس کے اندر ابھی تک دوسری ہستی نے وجود نہیں پایا تھا۔ کیا دوسری ہستی صرف افسروں کے اندر ہی وجود پاتی ہے؟

صابر اب اپنے جاننے والوں کو موبائل فون کے ذریعے پیغام بھیجتا اور اُسے بھی مختلف قسم کے پیغامات وصول ہوتے۔ بعض اوقات یہ ایک دل چسپ قسم کا سلسلہ چل نکلتا اور وہ لوگ دیر تک آپس میں پیغامات کے ذریعے گپ بازی کرتے رہتے۔ صابر اپنے موبائل کی وجہ سے نئی مصروفیت میں اِس قدر محو ہو گیا کہ اُسے اپنی اکتاہٹ کا احساس ہی نہ رہا۔ اُسے محسوس ہوتا کہ وہ دو زندگیاں جی رہا

ہے،ایک وہ جواُس کی ہے جس میں اُس کے والدین، بھائی، بابواور صاحب ہیں اور دوسری وہ جس کا جنم موبائل فون نے دیا ہے۔وہ اب اکیلانہیں رہا تھا۔موبائل فون ایسا ساتھی تھا جس نے اُسے ایک انجمن میسر کردی تھی۔اُس کی حالت نیند میں ڈوبے ہوئے اُس آدمی کی طرح تھی جو جانتا ہی نہیں تھا کہ وہ سور ہا ہے۔وہ پیغام بھیجتا اور وصول کرتا۔یہ پیغامات نصیحت نامے ہوتے جو وہ اپنے جاننے والوں کو بھیجتا رہتا، چٹکلے ہوتے جنھیں پڑھتے ہوئے وہ مسکراتا اور کسی کو نہ بھیجتا کہ وہ اُن سے خود ہی لطف کشید کرنا چاہتا تھا اور چند بے کار قسم کے پیغامات ہوتے جن کے بھیجنے والوں پر وہ لعنت بھیجتا۔وہ بھول گیا تھا کہ حقیقت کا اپنا ایک عکس ہوتا ہے جو اصل سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔وہ حقیقت کے غیر حقیقی عکس میں گم تھا کہ اُسے ایک پیغام موصول ہوا۔

''کیسے ہو؟'' صابر کے لیے یہ نمبر اجنبی تھا۔اُس نے ذہن پر زور دیا لیکن وہ یاد نہ کر سکا۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' اُس نے جھجکتے ہوئے لکھا۔وہ سوچ رہا تھا کہ یہ جھجک اُس نے الفاظ میں منتقل تو نہیں کردی؟

''تمھارا نام؟''

''جی صابر۔'' اُسے ملنے والے پیغام کے الفاظ میں ایک تمسخر اور دل چسپی محسوس ہوئی۔پھر اُس نے ہمت کی۔

''جی آپ کا؟'' صابر نے پھر قدرے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''میرے نام کو چھوڑو۔'' اُسے اِس حکم سے اُلجھن بھی ہوئی اور کچھ کشش بھی محسوس ہوئی۔

''اپنی ایک تصویر بھیجو۔'' اِس حکم کو پڑھتے ہی صابر کو اپنے ہاتھوں میں کپکپی محسوس ہوئی۔

''جی بھیجنی نہیں آتی۔'' صابر کو محسوس ہوا کہ دوسری طرف اُس کے پیغام پر قہقہہ لگایا گیا ہے۔قہقہہ کی گونج کو ذہن میں لاتے ہی وہ جھینپ گیا۔

اب صابر کو پریشانی ہونے لگی کہ یہ کون ہوسکتا ہے جو اُسے ایسے بیوقوف بنا رہا ہے۔اُس نے سوچا کہ کیا وہ بیوقوف بنتا جائے؟

''مجھے بھیجنی نہیں آتی جی!'' صابر نے سچ کا سہارا لیا۔اب وہ اِس گفتگو سے لطف اندوز ہونا شروع ہو گیا تھا۔

''میرے خیال میں پورے ملک میں تمھی واحد آدمی ہو جسے تصویر بھیجنی نہیں آتی۔ اپنے کسی دوست کو بتاؤ کہ تمھاری مدد کر دے۔'' صابر نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اُسے اگلے کسی پیغام کا انتظار تھا جو نہیں آیا۔ اُس نے پہلے تصویر نہ بھیجنے کا سوچا۔ یہ فیصلہ صابر کی پہلی ہستی کا تھا جب کہ دوسری ہستی نے اُسے اُکسایا کہ حقیقت کے عکس کو غیر حقیقی نہیں ہونا چاہیے۔ اُس نے اپنے کسی دوست کے ذریعے ایک تصویر بھجوا دی۔ جیسے ہی تصویر چلی گئی اُسے خود سے شرمندگی ہونے لگی۔ دوسرے طرف جو بھی تھا وہ کیا سوچے گا؟ یہ کیسا احمق ہے جس نے بغیر سوچے تصویر بھیج دی۔ چند دِن صابر کو جواب موصول نہیں ہوا تو وہ مطمئن ہو گیا اور غیر مطمئن بھی۔ پھر اُسے جواب موصول ہوا:

''تم تو ایک ہینڈسم آدمی ہو۔'' صابر کے ذہن میں اپنے ماں باپ کا جھگڑا گھوم گیا۔ وہ مطمئن محسوس ہوا۔

''تعریف کرنے کا شکریہ۔ لیکن میں ہوں نہیں۔'' صابر نے تکلف کیا۔

''آپ بھی اپنی تصویر بھیجیں۔'' صابر نے اپنی جھجک پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی تصویر ابھی نہیں بھیج سکتی۔ جب ہماری دوستی کوئی شکل لے گئی تو ضرور بھیجوں گی۔'' صابر کو اپنی نظر پر یقین نہیں آیا۔ اُس نے پیغام کو کئی بار پڑھا اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ جو اُس نے پڑھا وہ حقیقت تھی جس کا عکس بھی وہی حقیقت تھا۔ اُسے پیغام کی عبارت سے زیادہ اپنے ہی خوف سے خوف آنے لگا۔ صابر کو اپنے اندر ایک تیسری ہستی بھی نظر آئی جس کا دوسری دو ہستیوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ہستی ہی شاید اُس کی اپنی تھی اور دوسری دونوں کو اُس نے گھڑا ہوا تھا۔ اب اُس کے اندر عبارت کے خوف کے بجائے ایک دل چسپی تھی۔

''اب آپ اپنا نام بتا ہی دیں۔'' صابر نے لکھ کر بھیج دیا اور اب اُسے جواب کا انتظار تھا لیکن جواب نہ آیا اور وہ چند دِن تو ایک کھچاؤ میں رہا۔ اُس کا دفتر اور گھر میں کہیں دل نہیں لگ رہا تھا، اُسے محسوس ہوتا کہ اُس کا کچھ کھو گیا ہے جسے وہ مسلسل کھوج رہا ہے۔ اُس کے اندر کی تینوں ہستیاں ایک ہی نکتے پر جڑ گئی تھیں اور پھر وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے الگ ہونے لگیں۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ بکھر گیا تھا اور اب وہ تینوں ہستیاں اپنی اپنی جگہوں پر ٹکتی جا رہی تھیں اور اُس کا کھچاؤ بھی ختم ہو گیا تھا۔ اُسے بابوؤں کی باتوں میں دل چسپی کے کئی پہلو محسوس ہونے لگے اور صاحب کی موبائل فون پر

باتیں اُتنی پراسرار لگنے لگیں جتنا لگا کرتی تھیں۔

ایک شام اُسے پیغام موصول ہوگیا۔ صابر کو نمبر دیکھتے ہی اپنی زبان حلق میں اٹکتے محسوس ہوئی۔ اُس نے تھوک نگلا، اپنے آپ کو مجتمع کیا اور پیغام پڑھا۔

''میرا نام فریدہ ہے۔'' صابر کو موبائل فون تھامے ہوئے ہاتھ میں کپکپی محسوس ہوئی۔ اُسے محسوس ہوا کہ فریدہ اُسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی ہے۔ وہ کچھ شرمندہ ہوا اور اُسے اپنے آپ پر غصہ بھی آیا کہ اِس میں ڈرنے والی ایسی کیا بات تھی؟ صابر نے اُس پیغام کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کھچاؤ کے جس عمل میں سے گزرا ہے فریدہ بھی اُسے تھوڑا چکھ لے۔ اب وہ مطمئن تھا اور دفتر کے معاملات میں اُس کی دل چسپی معمول پر آگئی تھی اور رات کو سونے سے پہلے اپنی ماں کے پاس بیٹھتا اور سوچتا کہ کوئی طریقہ ہو جس سے بے جی کی اجارہ داری ختم ہو۔ اُسے اپنے باپ سے ہمدردی تھی جس نے عمر کا زیادہ حصہ ایک پٹرول پمپ پر معمولی ملازمت کرتے ہوئے اُنھیں کسی قابل بنا دیا تھا جب کہ بے جی تو ایک ایک روٹی کم کھلا کے اُنھیں بھوکا رکھتی تھی تاوقتیکہ اُنھوں نے اپنی بھوک خود ختم کر دی۔

''ناراض یا مصروف؟'' ایک دِن پیغام آیا۔ اب صابر کسی پریشانی میں نہیں تھا۔

''مصروف جی!'' صابر کو اپنے جواب میں اعتماد محسوس ہوا۔

''کیا کرتے ہو؟''

اب صابر گھبرا گیا اور شش و پنج میں بھی پڑ گیا۔ وہ کیا جواب دیتا؟ یہی کہ وہ چپڑاسی ہے؟ نہیں! وہ قاصد ہے۔ یہ پڑھ کے فریدہ شاید اُس کے ساتھ مزید بات ہی نہ کرے۔ ''میرا اپنا کاروبار ہے۔'' اُس نے اپنے پیغام کو پراعتماد بنانے کی کوشش کی۔ وہ پریشان بھی ہوا کہ فریدہ کاروبار کی نوعیت کے بارے میں پوچھ سکتی ہے۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' صابر کو کئی دِن اگلا پیغام موصول نہیں ہوا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ اگلا پیغام آئے اور یہ بھی چاہتا تھا کہ پیغام نہ آئے۔ وہ انتظار میں تھا اور لاتعلق بھی کہ ایک رات موبائل فون پر گھنٹی بجی۔ صابر نے دیکھا کہ نمبر فریدہ کا تھا۔ اُس نے موبائل فون کا کال سننے والا بٹن دبا کہ کان کو لگایا۔

''ہلو صابر!'' صابر کو یقین ہی نہ آیا کہ کوئی عورت اُس کے ساتھ بات کرنا چاہتی تھی۔ اُسے

فریدہ کی آواز میں ایک شرارت محسوس ہوئی۔ اُس کے بدن میں خوف اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''ہیلو فریدہ!'' صابر کو اپنا لہجہ دھیما، بھاری، مٹھاس سے بھرا ہوا، سوز کے گداز میں بہتا ہوا اور اپنی ہی سرشاری میں گم لگا۔

صابر کے ہونٹوں پر اطمینان سے بھری ہوئی مسکراہٹ پھیل گئی!!

پیڑاں دا پراگا

ہر خوش گوار واقعہ کسی خوش گوار صبح کو ہی ہوتا ہے!

وہ ایک خوش گوار صبح تھی جس کی کرنوں میں کنوار پن کی تازگی تھی اور دھیمی ہوا میں بغیر زہر والے سانپ کے ڈسے کا چس تھا۔ اُس صبح میں بھی خوش تھا کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ میرا پہلا دِن تھا اور میں فراغت اور جوانی کے نشے میں بدمست تھا کہ میں نے اپنی پسندیدہ جگہ پر جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ جگہ اپر چناب کینال سے نکلتی نوکھر ڈسٹری بیوٹری پر کوٹ عنایت خان سے پہلے آتی ہے جہاں ایک جھال ہے جسے سرکنڈوں کے ایک جھنڈ نے ڈھانپا ہوا ہے۔ کوٹ عنایت خان میں حبیب بنک کی ایک چھوٹی برانچ ہے جس میں میرے ایک عزیز کام کرتے تھے اور ایک بار، اپنی آوارہ گردی کے ہاتھوں مجبور میں اُنھیں ملنے گیا کہ جھال دیکھی اور پہلی ہی نظر میں کسی حد تک گمنام جگہ کو دِل دے بیٹھا۔ یہ نہر ششماہی ہے جو وسط جون میں بہنا شروع ہو جاتی ہے۔ میں جب کبھی اپنے کسی فرضی نفسیاتی دباؤ کا شکار ہوتا تو علاج کے لیے اُس جھال پر جاتا جب نہر بہہ رہی ہوتی۔ میں وہاں بلند آواز میں گانے گاتا یا خاموش بیٹھا پانی کے گرنے کی سریلی آواز سنتا رہتا۔ مجھے اِس آواز میں ایک موسیقی سنائی دیتی جو دھیرے دھیرے میری سوچ کو تھپکتی رہتی اور میں جب وہاں سے واپس چلتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میں اپنی ہر پریشانی وہیں چھوڑ چلا ہوں۔ میں وہاں اپنے دباؤ دور کرنے کے لیے ہی نہیں جاتا تھا، جب میں خوش ہوتا تو اپنی خوشی کی اُن پانیوں کے ساتھ ساجھے داری کرنے جاتا جو وہاں کے نہیں تھے اور میں

نہیں جانتا کہاں جا کے مٹی کا حصہ بن جاتے تھے۔ لیکن اُس وقت جب میں وہاں ہوتا، اور وہ جھال سے نیچے گر رہے ہوتے، وہ اُس وقت میرے ہوتے اور میں اُن کے نیچے گرنے کے مدھر شور کی دھمک اپنی چھاتی میں محسوس کرتا جو مجھے سکون دیتی اور محسوس ہوتا کہ میری تحلیل نفسی ہوئے جا رہی ہے۔

شہر کے جس علاقے میں، مَیں رہتا تھا، جھال وہاں سے کافی فاصلے پر تھی اور مجھے اپنے موٹر سائیکل پر وہاں پہنچتے گھنٹہ سے کم وقت نہیں لگتا تھا۔ اُس صبح جب میں گھر سے نکلا تو دِن ابھی طلوع ہوا ہی تھا اور شہر کی کثافت ابھی صبح کی پاکیزگی پر حملہ آور نہیں ہوئی تھی اور میں جوانی کی مستی میں مست جھال کی طرف چل پڑا۔ میں خوش تھا، میرا جسم مجھے ایک نئے سانچے میں ڈھلا ہوا محسوس ہوا۔ آخری امتحان کے بعد والی بے فکری کا میرا پہلا دِن تھا اور ابھی آنے والے نتیجے کا خوف میری سوچ میں داخل نہیں ہوا تھا۔ میں اپنی دھن میں مست جھال کی طرف چلتا رہا اور میں جانتا تھا کہ جھال متواتر قریب تر آئے جا رہی ہے جب کہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں تو بیل گاڑی سے بھی آہستہ جا رہا ہوں۔

شاید ہر خوش گوار صبح کو ایسے ہی محسوس ہوتا ہو!

جب میں جھال پر پہنچا تو جہاں میں موٹر سائیکل کھڑا کیا کرتا ہوں وہاں ایک چھوٹی کار کھڑی تھی۔ مجھے اپنی جگہ پر یہ قبضہ غیر قانونی لگا۔ میں ایک عجیب کیفیت میں مبتلا تھا، شاید وہاں آنے والا کچھ دیر کے لیے رکا ہو اور میری موجودگی اُس کے وہاں بیٹھنے میں خلل انداز ہو رہی ہوگی جیسے اُس کی موجودگی میری تنہائی میں۔ نہر کے کنارے سرکنڈوں کا جھنڈ اتنا گھنا تھا کہ اُن میں کسی تنہائی کے متلاشی کو سرسری نظر سے دیکھنا مشکل تھا۔ یہ سڑک جی ٹی روڈ سے نکل کے انجینئرنگ یونیورسٹی تک جاتی تھی لیکن وہاں ٹریفک کا بہاؤ اتنا تیز نہیں تھا اور وہاں سے گزرنے والے اپنے ہی خیالوں میں گم گزرتے رہتے۔ اُن کے لیے یہ جگہ غیر اہم تھی کیوں کہ وہ اِسے روز دیکھتے تھے جب کہ میرے جیسے لوگوں کے لیے اِس میں یہ ایک رومانوی کشش کی حامل تھی۔

پانی گرنے کے شور میں وہاں بیٹھنے والے نے میرے رکنے کو نہیں سنا ہوگا۔ میں نے اُسے دیکھنے کا سوچ کے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور پھر مجھے خیال آیا کہ یہاں رکنے والا شاید اپنی کسی حاجت سے فارغ ہو رہا ہو اور مجھے اپنی سوچ پر غصہ بھی آیا اور اگر سچ ہوا تو اُسے اکڑوں بیٹھے دیکھنے پر خود سے ہی شرمندگی، لیکن میں اپنے تجسس میں آگے بڑھ گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے وہاں دو

عورتوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا جو میری موجودگی سے بے خبر گرتے ہوئے پانی کے سحر میں گم تھیں۔ مجھے اُن کا یہ ارتکاز پسند بھی آیا کیوں کہ میں بھی پانی کے اِس جادو کو ایسے ہی دیکھا کرتا تھا اور مجھے اِس انہماک پر رشک بھی آیا۔ ایک عورت کی عمر چالیس سے کچھ کم لگتی تھی اور دوسری اُس سے کم از کم پندرہ سال کم عمر؛ یہ میرا اندازہ تھا کیوں کہ مجھے عورتوں کی عمریں ناپنے کا تجربہ نہیں تھا۔

جھال کے گرتے ہوئے پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں گرتے ہوئے پانی میں آسمان کی طرف چھلانگیں لگاتے ہوئے واپس نہر میں آ گرتیں۔ وہ عورتیں اور میں جھال میں گرتے ہوئے پانی کو سحر زدہ دیکھ رہے تھے کہ ایک بڑی مچھلی نے نیچے گرتے ہوئے پانی میں اوپر کو چھلانگ لگائی اور پھر نیچے ڈبکی لگا گئی۔ اُس مچھلی کے چھلانگ لگانے نے ہم تینوں کی توجہ پانی کی طرف سے ہٹا کر پہلے مچھلی کی چھلانگ کی قوس کی طرف اور پھر ایک دوسرے کی طرف کر دی۔ جب ہماری نظر ملی تو مجھے اپنے چہرے کے تاثر کا نہیں پتا لیکن بڑی عورت کے چہرے پر خوف تھا، مجھے لگا کہ اُس کے مطابق وہی ہوا جو ہونا تھا یا وہ نہیں ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا یا وہ نہیں ہوا جو ہونا چاہیے تھا یا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں جب کہ چھوٹی عورت کی آنکھیں حیرت سے کھلیں اور اُس کے ہونٹوں نے ہائے کی شکل بناتے ہوئے، اُس نے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کے ایک شرمندہ سی مسکراہٹ مسکرائی۔ اب وہ مجھے اور میں اُنھیں دیکھ رہا تھا اور پھر وہ مجھے نظر انداز کرتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگیں اور میں بھی اُن سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گیا۔

مجھے اُس خوش گوار صبح کی خوش گواری میں ایک نیا رنگ بھی نظر آیا جس میں ناخوش گواری کے بجائے جو کرنوں کے کنوار پن اور بغیر زہر والے سانپ کے ڈسنے کی چس سے مختلف تھا کیوں کہ اب اُس خوش گوار صبح میں دو خوب صورت عورتیں شامل ہو کے اُسے مزید خوش گوار کر گئی تھیں۔ میں اب پانی کو کم دیکھ رہا تھا اور اُن عورتوں کو زیادہ کہ اب وہ مجھے جھال کا حصہ نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ میری موجودگی سے بے خبر تھیں جب کہ میں اب جھال سے بے خبر تھا۔ مجھے یہ اتفاق لگا اور ایسا سچ بھی کہ جس کا اتفاق کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ہم وہاں بیٹھے تھے اور پانی ایک شور کرتے ہوئے گر رہا تھا اور بہے جا رہا تھا۔ تب ہی بڑی عورت اُٹھی اور کار کی طرف چل پڑی۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ جا رہی ہے یا واپس جانے کے لیے کار موڑے گی، میں چاہتا تھا کہ وہ میری جگہ میرے لیے خالی کر جائیں اور یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ نہ جائیں کیوں کہ میں یہاں کے سحر سے اکیلا ہی لطف اندوز ہوتا رہا تھا اور اپنے کسی

دوست کو بھی اِس جگہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا، مجھے لگتا کہ یہاں کی کسی کے ساتھ ساجھے داری مجھے اپنی نظر میں ہی گرادے گی۔ میرا اندازہ غلط نکلا اور وہ عورت کار میں سے ایک ٹوکری اور تھرمس نکال کے لے آئی اور پاس سے گزرتے ہوئے مسکرائی۔ کیا وہ اِس لیے مسکرائی تھی کہ اُسے کوئی ردِعمل تو دکھانا ہی تھا یا اِس لیے مسکرائی تھی کہ مسکرانا ایک مہذب عمل تھا یا وہ مسکرا کے کہنا چاہتی تھی: بچو جی! تم بیٹھو اور پانی دیکھو اور ہم کچھ کھاتے ہیں۔

وہ اپنی جگہ پر بیٹھی نہیں تھی کہ چھوٹی عمر کی لڑکی اُٹھی اور کار سے ایک چادر اُٹھا لائی جسے اُس نے گھاس پر بچھایا، وہ دونوں اُس پر بیٹھ گئیں، بیٹھ کے ایک دوسرے کو دیکھا، نظروں سے کوئی گفتگو کی جو میں سمجھ گیا اور پانی کی طرف دیکھنے لگا۔ اب میں بظاہر اُن سے بے خبر تھا لیکن اپنے اندر کسی چھپی ہوئی آنکھ سے اُنھیں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب وہاں عجیب سی کیفیت تھی یا میں نے فرض کیا ہوا تھا کیوں کہ میں اُنھیں دیکھنے کے باوجود دیکھ نہیں رہا تھا اور خود کو اُن سے چھپانے کے باوجود چھپا نہیں پا رہا تھا۔ میرے لیے اب وہاں پانی کا کوئی شور نہیں تھا، سرکنڈے بھی مصلوب سے سیدھے کھڑے تھے اور دھیمی رفتار میں بہتا ہوا ٹریفک اپنی آواز پیچھے ہی کہیں چھوڑ آیا تھا۔ مجھے کسی کی آواز سنائی دی یا مجھے شک گزرا کہ میں نے اِس خاموشی کے گنبد میں کچھ سنا ہے۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا تو مجھے جھال کی موسیقی سنائی دی، مصلوب سرکنڈے زندہ ہو گئے اور ٹریفک کی بھدی آواز نے اپنی موجودگی کی طرف اشارہ کیا۔

''سنو!'' میں میٹھی آوازیں سننے کا عادی نہیں تھا۔ دونوں میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ''ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔'' میں کشمکش میں مبتلا اُنھیں دیکھنے لگا۔ مجھے اُن کی پیشکش سمجھنے میں کچھ سیکنڈ لگے جو کسی بھی طرح ایک مختصر دورانیہ نہیں تھا۔ میں نے ماتھے پر ہتھیلی رکھ کے سیلیوٹ کا انداز بنایا جس کا مطلب معذرت تھا۔ چھوٹی عورت نے پلکیں جھپکیں، مسکرائی اور مسکراتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کا اشارہ کیا۔ میرے پاس مسکراہٹ میں ڈوبی ہوئی اُس دعوت کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں اپنی جگہ چھوڑ کر اُن کے پاس ایک پھوہڑ پن کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو میں دیکھ رہا تھا وہ سچ بھی تھا؟ میں اُسی گھامڑ پن میں وہاں کھڑا رہا اور وہ پر اعتماد مجھے دیکھتی رہیں۔ تبھی چھوٹی عورت نے پھر پلکیں جھپکیں، مسکرائی اور مسکراتے ہوئے مجھے چادر کے کنارے پر

بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بڑی عورت ٹوکری میں سے کھانے کا سامان نکال چکی تو چھوٹی عورت disposeable پلیٹیں ہمیں تھمانے لگی۔ چکن سینڈوچ، سلاد اور کیچ اپ ہم نے تقسیم کے مطابق لیا، پلیٹوں کے ساتھ گلاس بھی تھے جن میں پانی ڈال دیا گیا اور مجھے تھرمس کے ڈھکن میں کوفی، جب کہ دونوں اپنے لیے پیالیاں لائی ہوئی تھیں۔ بڑی عورت نے پہلا لقمہ لیا تو ہم دونوں نے اُس کی تائید کی۔ سینڈوچ خوش ذائقہ تھے اور کوفی کڑوی۔ میں سینڈوچ کے ذائقے سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ بڑی عورت نے مجھے باہر کھینچا۔

''میرا اِس چھوٹی سی آبشار کے ساتھ جذباتی لگاؤ ہے۔'' بڑی عورت نے ایک لمبی سانس کھینچی؛ وہ ایک آہ تھی یا اُس نے لمبی سانس لے کر کسی سوچ کا آغاز کیا تھا جو اُس کی ذاتی تھی یا وہ ، یہاں، اُس کی ساجھے داری کرنا چاہتی تھی۔ میرے لیے یہ دل چسپی کا پہلو تھا کہ میں کسی کے کسی جگہ کے ساتھ جذباتی لگاؤ کی وجہ جان سکوں؛ میں زیادہ متجسس بھی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے بات سن تو لی تھی لیکن ظاہر کیا کہ جاننے کے لیے زیادہ بے چین نہیں ہوں۔ ''میں شاید یہ بات نہ کرتی جو میں نے کی ہے اگر آج اُس بڑی مچھلی نے آبشار میں گرنے سے پہلے آسمان کی طرف چھلانگ نہ لگائی ہوتی۔ یہ چھلانگ ہی میری زندگی کا المیہ ہے۔'' چھوٹی عورت نے پلکیں نہیں جھپکیں، وہ مسکرائی بھی نہیں اور نہ ہی میری طرف دیکھا۔ میں اب پریشان ہو گیا تھا اور اِس پریشانی میں تجسس بھی شامل تھا۔ بڑی عورت نے چھوٹی عورت کی طرف دیکھا اور چھوٹی عورت کار میں سے اُس کا کندھے والا جھولا اُٹھا لائی۔ بڑی عورت نے ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ اور سر کی ہلکی جنبش سے شکریہ ادا کیا۔ بڑی عورت ہمیں نظر انداز کرتے ہوئے سینڈوچ کا ایک بڑا ٹکڑا منہ میں ڈال کے چبانے لگی۔ مجھے یہ خوش گوار صبح اب ناخوش گواری میں تبدیل ہوتے لگی۔ ''سحرش میرے المیے کا جانتی اور سمجھتی ہے۔'' میں نے چھوٹی عورت کی طرف دیکھا جو اپنی خالی پلیٹ کو دیکھے جا رہی تھی۔ ''میرے خاوند انجیرنگ یونورسٹی میں اسٹنٹ پروفیسر تھے۔ وہ ایک مہم جو تھے جس کی وجہ سے اپنے شاگردوں میں خاصے مقبول تھے۔ ہماری پسند کی شادی تھی۔ ہمارے ہاں پسند کی شادی جہاں ایک تجربہ ہے وہاں المیہ بھی ہے۔ میرا خاندان روائیتی سوچ کا حامل تھا، اُنھوں نے ہماری شادی کی اجازت نہیں دی تھی،'' وہ رُکی، ''اور شادی کے بعد مجھے واضع کر دیا کہ میں اب اُن کا حصہ نہیں رہی اور میرے سسرال نے بھی مجھے قبول نہیں کیا تھا کیوں کہ میں کسی

کی حق تلفی کر رہی تھی۔ میرے شوہر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور میں بھی ایک آدھ ڈگری لے چکی تھی جو شاید ناکافی تھی۔ وہ یہاں سے گزرتے ہوئے یونیورسٹی جاتے۔ اُنھیں یہ جگہ بہت پسند آ گئی۔ وہ دِن میں دو مرتبہ یہاں سے گزرتے اور ہم چھ مہینے ہر اتوار کی صبح یہاں آتے۔ میں چاہتی تھی کہ یہ نہر شش ماہی کے بجائے سارا سال ہی بہتی رہے لیکن یہ میرے بس میں نہیں تھا۔ ہم شدید گرمی، بارش اور حبس میں آتے سوائے اُن دنوں کے جب کوئی سماجی مجبوری حائل ہو جاتی۔'' وہ رکی۔ میں اُس کی خاموشی کے بعد جھال کے پانی کی موسیقی سننے لگا۔ یہ ایک صبر آزما مختصر خاموشی تھی۔ کوئی بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہا تھا؛ شاید ہم تینوں ہی خائف تھے۔ مجھے یہ بھی خیال آتا کی میرا آج اِس وقت آنا ضروری تھا؟ میں عموماً شام کو آتا رہا تھا اور آج ایک خوشی میں ملبوس انجانے پن میں یہاں کہانیاں سننے آ گیا؟ مجھے اپنا ایک کہانی نویس دوست یاد آ گیا جو کہانیوں کے کھوج میں سرگرداں رہتا ہے۔ ''وہ ایک مہم جو تھے اور ایک تیراک بھی۔ وہ یہاں نہاتے۔ ایک دِن اُنھوں نے جھال کے پانی کے ساتھ نیچے گرنے کا فیصلہ کیا۔ میں خوف زدہ تھی لیکن اُنھیں روک نہیں سکتی تھی۔ وہ کامیابی کے ساتھ اُلٹا تیرتے ہوئے پاؤں پہلے جھال کے پانی کے ساتھ نیچے آ رہے۔ اب وہ کئی بار ہر اتوار ایسے کرتے۔ ایک دِن ہم یہیں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بڑی مچھلی آج کی طرح اوپر سے ڈائیو کر کے نیچے آئی۔ میرے خاوند نے اُس مچھلی کی طرح ہوا میں سے ایک قلابازی لگا کے نیچے آنے کا فیصلہ کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ وہ پانی میں ایسے نیچے آئیں گے کہ پاؤں پہلے آئیں، سر نہیں۔'' وہ خاموش ہو گئی اور میرے ذہن میں امریکہ کے مشہور ڈائیور گریگ لوگانیس کی وہ ڈائیو آ گئی جس نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ''میں جانتی تھی اُنھیں روکنا ناممکن تھا۔'' میں نے سوچا: مجھے اُس کے خاوند کے شوق اور کہانی سنانے سے کیا دل چسپی ہو سکتی تھی؟ پھر مجھے اپنا کہانیوں کا متلاشی دوست یاد آ گیا۔ ''ایک صبح وہ پانی کے ساتھ بہتے ہوا نیچے آتے رہے جیسے کہ وہ کئی بار کر چکے تھے۔ پھر اُنھوں نے مچھلی کی طرح قلابازی لگانے کا اعلان کیا۔ میں اب خوف زدہ کم اور متجسس زیادہ تھی۔'' پھر ایک مختصر خاموشی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی اور میں اُسے دیکھ رہا تھا اور سحرش کسی کو بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ بڑی عورت نے لمبی سانس لی۔ آج وہ کئی بار لمبی سانسیں لے چکی تھی۔ ''وہ ہمیشہ کی طرح پانی کے ساتھ بہتے ہوئے آنے کے بجائے تیرتے ہوئے آئے، جہاں پانی نیچے گرتا ہے وہاں سے تھوڑا پہلے ہوا میں اچھلے اور پیروں پر گرنے کے بجائے ڈائیو کرتے ہوا نیچے گئے

اور باہر نہیں آئے۔'' وہ خاموش ہوگئی۔ مجھے یہاں آنے کا شدید پچھتاوا ہوا۔ میں یہ نہ ہی سنتا تو اچھا تھا۔ ''اُن کی لاش جی ٹی روڈ پر پل کے نیچے سے ملی۔'' میں خاموش تھا۔ میں کیا کہہ سکتا تھا؟ ''میں اب بے یارو مددگار تھی۔ سسرال میرے نہیں تھے اور نہ میرے والدین۔ میں دنیا میں اکیلی تو تھی لیکن مجھے زندہ رہنا تھا۔'' اُس نے اپنے جھولے میں کچھ ٹٹولتے ہوئے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس نکال کے سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کی لمبی لکیر اپنے ہونٹوں اور نتھنوں سے خارج کی۔

میں سحرش کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا اور نہ عورت کی طرف۔ وہ دونوں کس طرف دیکھ رہی تھیں، میں نہیں کہہ سکتا۔ شاید وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھیں اور یا ممکن ہے سر جھکائے اپنے خیالوں میں گم ہوں یا وہ دور دیکھتے ہوئے کسی وقت میں جانا چاہتی ہوں، ایسا وقت جسے وہ جانتی نہیں تھیں لیکن شاید جاننا چاہتی ہوں۔ مجھے اچانک بڑی عورت کے ساتھ ہمدردی ہوگئی۔ وہ دنیا میں تنہا تھی۔ سحرش کون تھی؟ کیا اُس کی کوئی رشتے دار یا صرف جاننے والی؟

میں نے بڑی عورت کی کہانی میں منطق میں سے لایعنیت اور لایعنیت میں سے منطق کو تلاش کرنے کی کوشش میں جھال کی طرف دیکھا۔ پانی اپنی ہی بے حسی میں گم ایسے بہے جا رہا تھا جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہیں تھا یا اُسے دل چسپی نہیں تھی یا جو بڑی عورت نے بتایا وہ ہوا ہی نہیں تھا کیوں کہ اُس وقت کا پانی وہاں موجود نہیں تھا جو گواہی دے سکتا۔ کیا گواہی کی ضرورت تھی؟ جو بڑی عورت نے بتایا کیا اُس کی تصدیق ضروری تھی؟ میں نے پانی کی طرف دیکھا جو مسلسل گرے جا رہا تھا اور اُسے اسسٹنٹ پروفیسر اور اُس کی بیوی کے المیے کے ساتھ کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ میں پانی کو دیکھے جا رہا تھا اور مجھے پانی نظر آنا بند ہوگیا، صرف ایک شور باقی تھا۔ وہ شور صحراؤں میں چلتی آندھی سے مشابہ تھا۔ اُس صحرا میں ایک اونٹنی تھی جس کے گلے میں گھنٹیاں تھیں اور جس پر بیٹھا سوار مہار نہیں موڑ رہا تھا اور ہوا کی سیٹیاں منتیں کر رہی تھیں کہ سوہنی والیا ہمیں بھی ساتھ لے جا۔ اونٹنی چلے جا رہی تھی اور سیٹیاں بجاتی تیز ہوا اُس کے پیروں کے نشان مٹاتی جا رہی تھی۔ وہاں اونٹنی کا کہیں نام و نشان ہی نہیں تھا۔ مجھے ایک درد بھری آواز سنائی دی۔ وہ آواز بھٹی والی سے مخاطب تھی۔ وہ کہے جا رہی تھی کہ بھٹی والی اُس کی پیڑوں کا پراگا بھون دے اور وہ عوضانے میں ہنجوؤں کا بھاڑا دے گی۔ یہ کس کی آواز تھی؟ بڑی عورت کی یا جھال کے پانی کے اندر چھپی اُس روح کی جو اونٹنی والے کے کھوج میں تھی؟

میں نے جلدی سے بڑی عورت کی طرف دیکھا۔ وہ سگریٹ سے نکلتی دھوئیں کی سلیٹی لکیر کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے میری طرف دیکھا۔

''میں تنہا اور کمزور تھی اور مجھے زندہ رہنا تھا۔'' اُس نے آنسوؤں کے بیچ میں مجھے ایک بار پھر یاد کراتے ہوئے سگریٹ کا کش لیا۔ میں نے سوچا:

کیا ہر خوش گوار صبح کو ہمیشہ صرف خوش گوار واقع ہی رونما ہوتا ہے ؟

ہمراز

شکور جب دس سالوں کے بعد گھر میں داخل ہوا تو وہی منظر تھا؛ نسرین دروازے کی طرف پیچھا کیے چولھے کے پاس بیٹھی تھی اور ماں دالانی کے دروازے کے سامنے پیڑھی پر۔ وہ یہی منظر چھوڑ کر گھر سے گیا تھا یا وہ اِس منظر سے اُکتا کر بھاگ جانے میں عافیت نظر آئی۔ ایک واضح تبدیلی اس کی آنکھ پہلی نظر میں نہیں دیکھ سکی تھی یا وہ اُسے اِتنی غیر اہم لگی کہ اُس نے کوئی اہمیت دینا مناسب نہ سمجھا، وہ گھر کا وہی نقشہ ذہن میں رکھے ہوئے تھا جو چھوڑ کر گیا تھا یا جس سے چھٹکارا پانے کے لیے اُس نے گھر کو ہی خیر آباد کہہ دیا تھا۔ آج وہ جب گھر میں داخل ہوا تو کچھ بھی نہیں بدلا تھا؛ وہی صحن اور جھلانی، سکڑی ہوئی سی دالانی اور ایک کمرہ جہاں ماں سوتی تھی۔ گھر کا یہ نقشہ کیسے بدلتا؟ وہ گھر میں ہوتا تو کوئی تبدیلی لاتا! جو تبدیلی اُس کی آنکھ داخل ہوتے ہی نہیں دیکھ سکی تھی اب ذہن کی گرفت میں آ گئی، دو ننگ دھڑنگ بچے صحن میں بے مقصد ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے پھر رہے تھے۔ وہ اُنھیں دیکھ کر کسی قدر برہم سا ہوا لیکن اُسے حیرت اِس بات سے ہوئی کہ بچے اُس کی طرف توجہ دیے بغیر اپنے کھیل میں مصروف رہے اور بھاگتے ہوئے بچوں کے ہانپنے کی آواز نے صحن کو اُن کی موجودگی سے زیادہ بھرا ہوا تھا؛ وہ بچے اُسے گھر کے ساتھ اپنے سے زیادہ مانوس لگے۔

شکور اپنی حیرت، اجنبیت اور ایک طرح کی جھجک پر قابو پاتے ہوئے نسرین کے سامنے بیٹھ گیا، بالکل اُسی طرح جیسے وہ اُس جگہ سے اُٹھ کر چلا گیا تھا۔ بچے یک دم بھاگنا بند کر کے ایک غیر شناسا سا

استعجاب کے ساتھ اُسے دیکھنے لگے اور تب ہی نسرین نے اُسے دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اُس کی آنکھوں کا سوال سمجھ گئی۔

''یہ بچے میرے ہیں۔'' اُس کے اندر آگے سننے کی ہمت نہیں تھی یا جو اُس نے سنا بے معنی تھا، وہ وہاں سے اُٹھ کر دالانی میں چلا گیا۔ اُس کی ماں نے ظاہر کیا کہ اُس نے اُسے دیکھا ہی نہیں۔ وہ دیر تک اندر کھڑا رہا، اتنی دیر کہ سورج غروب کے قریب آ گیا۔ تب وہ باہر نکلا، صحن کے نظارے میں معمولی سا ردوبدل ہو چکا تھا۔ نسرین دالانی کے دروازے کے پاس بیٹھی تھی اور ماں نے چولھا سنبھالا ہوا تھا۔ دونوں لڑکے ماں کے پاس بیٹھے اُسے آتے ہوئے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے، جب وہ آیا تھا تو انھوں نے اُس کے ساتھ ایک طرح عدم دلچسپی کا اظہار کیا تھا اور شائد اب وہ اُنھیں گھر کا حصہ لگنے لگا تھا۔ وہ ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کے بیٹھتے ہی دونوں لڑکے وہاں سے کھسک گئے۔ لڑکے جب وہاں سے کھسکے تو وہ طے نہیں کر پایا کہ اُسے اُن کا بیٹھے رہنا پسند تھا یا کھسک جانا۔ وہ حیران سا اُنھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور اُس کی ماں اُسے۔

''کچھ کھا لو!'' ماں نے پریشانی میں ڈوبی محبت میں کہا۔

''یہ لڑکے کون ہیں؟'' اُس کی آواز میں تجسس کے ساتھ ساتھ ایک لاتعلقی بھی تھی۔

''تمھارے بیٹے ہیں۔'' ماں نے آنکھیں بند کر کے ایسے کہا کہ دعا مانگ کر پھونک مارنے والی ہو۔

''میرے بیٹے؟'' اُس نے جو سُنا اُس پر یقین کرنا ممکن نہیں تھا۔

''ہاں، تمھارے بیٹے!''

''بغیر باپ کے؟'' اگر اُسے قہقہہ لگانا آتا ہوتا تو لگا دیتا۔ وہ تو مسکرانا بھی بھول چکا تھا۔

''بغیر باپ کے کیوں ہوں گے؟ گھاس کے بیج کا چھٹا دیا جاتا ہے کیا؟ وہ تو خود ہی اُگ آتا ہے۔'' ماں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''خود نہیں اُگ آتا، زمین کے اندر پہلے سے گھاس کا بیج موجود ہوتا ہے۔'' شکور نے درستی کی۔

''مُرغی، مرغ کی بانگ سُن کر ہی انڈے دے دیتی ہے۔ مرغ کا اُس کے پاس ہونا

ضروری نہیں۔اُن انڈوں کو ہوائی انڈے کہتے ہیں۔''

''تم کہنا چاہتی ہو کہ یہ لڑکے باپ کے بغیر ہی پیدا ہوئے ہیں؟ کھانے کو کچھ ہے تو دے ہی دو۔''اُس نے موضوع بدل کر بات کو اختتام دینا مناسب سمجھا۔وہ لاتعلق سا گھر واپس آیا تھا لیکن اب اُسے تجسس میں ڈوبی دل چسپی پیدا ہو گئی تھی۔وہ بار بار دالانی کے سامنے بیٹھی نسرین کے گھٹنوں کے ساتھ جُڑ کے بیٹھے ہوئے لڑکوں کو دیکھتا۔ماں نے کھانا نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا، کھانا کیا تھا؟ پانی کے چند قطرے ڈال کر پیسی ہوئی لال مرچوں کو روٹی پر ڈال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔وہ اُکتاہٹ کے ساتھ کھاتے ہوئے کن اکھیوں سے دالانی کی طرف دیکھتا رہا۔اب صحن مکمل طور پر اندھیرے میں تھا، ساتھ والے گھروں میں جلتے ہوئے قمقموں کی روشنی بھی اُس اندھیرے کی چادر کو چیر نہیں سکی تھی۔

''تم اب سو جاؤ۔'' ماں نے حکم دینے کے انداز میں بات کی۔جب اُس کی شادی ہوئی تھی تب بھی ماں نے اُسے ایسے ہی سونے کے لیے بھیجا تھا، اُس کا باپ ابھی زندہ تھا اور وہ اپنی شادی والے دن کو یاد کرتے ہوئے کوئی واقعہ سُنانا چاہتا تھا جو ماں نے مکمل نہیں ہونے دیا تھا۔وہ اپنے منہ میں مرچوں کا بدمزہ ذائقہ لیے ہوئے اُٹھا تو نسرین دالانی کے سامنے نہیں تھی۔وہ کئی سوچوں میں گم دالانی میں داخل ہوا تو اُس کے ذہن میں سہاگ رات تازہ ہو گئی۔نسرین نے کمرے کو اُسی ترتیب سے کر دیا تھا۔وہ ترتیب کیا تھی؟ بس چارپائی دیوار سے ہٹا کر کمرے کے درمیان میں رکھ دی تھی۔اُسے لڑکے نظر نہیں آئے اور اُس نے پوچھنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

نسرین اُسے غور سے دیکھے جا رہی تھی۔وہ چاہتا تھا کہ یہ خاموشی فجر کی اذان تک جاری رہے لیکن نسرین نے پردے کی اِس چادر کو چاک کر دیا۔

''تم نے اِس طرح جا کر میری زندگی کو کن خانوں میں بانٹ دیا۔میرا کبھی خیال نہیں آیا؟''

وہ اُس کے سامنے کھڑی تھی اور کمرے کے گھُپ اندھیرے میں اُس کا سراپا سوالات کی روشنی سے منور لگ رہا تھا۔وہ تھوڑا خائف بھی ہو گیا۔

''اِسی خیال سے چھٹکارا پانے کے لیے میں گھر سے گیا تھا لیکن ناکام ہو کر واپس آ گیا ہوں۔''نسرین نے ایک لمبا سانس لیا جو پہلے تو اُسے ایک آہ لگی اور پھر اُکتاہٹ یا بے یقینی کا ایک آوازہ۔وہ ہونٹوں کے کناروں کو اندر کی طرف بھینچ کر کچھ دیر خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔اب

اندھیرے سے اُس کی آنکھیں اِتنی مانوس ہوگئی تھیں کہ اُسے کمرہ روشن لگنے لگا۔ ''میں نے لاری اڈے پر مزدوری کی۔ دو دِنوں میں میرے پاس اِتنے پیسے بن گئے تھے کہ میں سفر کرسکتا۔ پتا نہیں کیوں میں دینہ چلا گیا۔ میں اوکاڑے بھی جا سکتا تھا۔'' وہ ایک خشک اور پھیکی سی ہنسی ہنسا، جیسے چھاتی کے کسی مرض میں مبتلا ہو۔ ''دینہ میں مَیں سبزی اور پھلوں کی منڈی میں مزدوری کرنے لگا۔ وہاں میری ایک شناخت تو بن گئی لیکن تمھارا خیال اُسی طرح رہا۔ میں ایک دن بس میں سوار ہو کر چکوال چلا گیا۔ وہاں بھی میں سبزی منڈی میں کام کرنے لگا۔ میں غریب اور تھوڑا جنونی تھا۔ میرا لہجہ اور عادتیں مقامی لہجے اور عادتوں سے مختلف تھیں لیکن مجھے قبول کیے جانے لگا اور میری ایک محنتی اور ایمان دار کارندے کے طور پر شناخت ہونا شروع ہوگئی۔ میں چکوال میں بھی تمھارے خیال سے چھٹکارا نہ پا سکا۔ تم میرے لیے وبال بن رہی تھیں۔ میں سرگودھا چلا گیا۔ محنت اور ایمان داری مجھے تم سے دور نہ کرسکی تو میں نے کچھ اور کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک رات مونا ڈپو کو جانے والی سڑک پر میں نے کسی کو لوٹ کر اُس کی نقدی واپس کردی۔ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ میں نے اُسے لوٹا کیوں اور پھر نقدی کیوں واپس کی؟'' وہ خاموش ہوگیا۔ نسرین کے سراپے میں تبدیلی آچکی تھی، وہ اُسے اب بے یقینی یا اُکتاہٹ کا شکار نہیں لگ رہی تھی؛ اُس کے سانسوں میں اُسے اُنس کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ ''لٹے ہوئے آدمی نے اپنی نقدی واپس لینے سے انکار کردیا۔ کہنے لگا: رقم واپس نہ لے کر میں ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں کہ لُٹنے کے بعد میرے اعتماد میں کتنی کمی آئی ہے؟ میں نے وہ پیسے دوبارہ جیب میں ڈالے تو مجھے ایک طرح سے سکون ملا اور یہ بھی لگا کہ تمھاری یاد ختم ہوگئی ہے۔'' وہ ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھے جا رہے تھے۔ دونوں ہی اگلی بات سے خوف زدہ لگے۔ ''میں وارداتیں کرنے لگا، محنت اور دیانت داری کے ساتھ! اب میں اکیلا تھا، تم مجھ سے دور ہوگئیں تھیں یا میں تم سے دور ہوگیا تھا۔ میں ایک طرح سے سکون میں تھا۔ مجھے تم اور طرح سے یاد آنے لگیں، رات کو خوابوں میں، ڈائین کے روپ میں۔'' بیوی نے حیرت اور ایک طرح سے خوف کے ساتھ اُسے دیکھا۔ لٹو اُلٹا نہیں گھوم سکتا، اُس کے اندر بنے ہوئے گُنجل کھلنے لگے تھے۔ اُس نے کمرے کا ایک سِرے سے دوسرے تک چکر لگایا اور پھر بیوی کے سامنے آن کھڑا ہوا، ''تمھارے خوابوں سے دور ہونے کے لیے میں سرگودھا کو چھوڑ کر اوکاڑہ چلا گیا۔ میری جیب اب خالی نہیں تھی۔ وہاں پہلی رات مجھے خواب نہیں آیا اور نہ دوسری اور نہ ہی تیسری اور نہ ہی تمھارا خیال۔ میں بے

چین رہنے لگا۔ میں سارا دن شہر کے گردونواح کے چکر لگاتا رہتا، تب میں چکر لگانے کی وجہ نہیں جان سکا تھا۔''

''کیوں لگاتے تھے؟'' نسرین نے تیزی کے ساتھ پوچھا۔ وہ اب بے چین ہوگئی تھی اور اُسے جلد از جلد اختتام تک پہنچنا تھا۔ جواب دینے سے پہلے شکور نے نسرین کو غور سے دیکھا اور ایک گمبھیر سی ہنسی ہنسا جس نے اُس کی بیوی کے اندر خوف کی لہر دوڑا دی۔

''میں شہر سے باہر جانے والے راستوں اور اُن پر لوگوں کی تعداد کا پتا چلا رہا تھا اور ساتھ ہی وارداتوں کے لیے جگہ تلاش کر رہا تھا۔ پہلی واردات میں ہی مجھ سے قتل ہو گیا۔'' اُس نے دونوں ہاتھ چہرے کے سامنے ایسے کیے کہ کوئی وار بچا رہا ہو۔ وہ خاموش ہو گیا۔ نسرین چھلانگ لگا کر ایک دم دور ہو گئی جیسے اُس نے سانپ دیکھ لیا ہو اور پھر اُس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی کہ اپنا خوف دور کر رہی ہو۔ ''میں قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ نسرین کو لگا کہ اُسے سہارے کی ضرورت ہے۔ اُس نے اُسے ہاتھ سے پکڑا اور چارپائی پر لے گئی۔ وہ دیر تک، بغیر کسی حرکت کے، اُس کے ساتھ چمٹ کر لیٹی رہی۔ پھر دونوں کے جسم اپنے اپنے مدار میں حرکت کرنے لگے اور اُسے اپنی تنہائی مٹتے ہوئے محسوس ہوئی۔

نسرین نے اُس کی طرف کروٹ لی۔ ''تم نے قتل کیوں کیا؟''

''میں قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جتنے بھی لوگوں کو لوٹا، اُن سب نے میرے ساتھ تعاون کیا لیکن اُس آدمی نے شور کر دیا۔ یا میں خود مارا جاتا یا اُسے مار دیتا۔ میں قتل نہیں کرنا چاہتا تھا، میں نے اُسے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے مارا۔''

''کسی نے دیکھا؟''

''نہیں!''

''کسی کو شک؟''

''نہیں!''

صبح کی نرم سی روشنی جیسی خاموشی کمرے پر قابض ہو گئی۔ اُس نے لمبا سانس لیا، ''میں نے کئی دن پولیس کا انتظار کیا، وہ تو نہیں آئی لیکن تمھارا خیال واپس آ گیا جو پہلے سے شدید تھا۔''

نسرین جو شائد اونگھ میں چلی گئی تھی، ہڑ بڑاہٹ کے ساتھ جا گی۔

''اب؟'' نسرین نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ شکور نے اپنی خاموشی کو ہی جواب بنایا۔ پھر وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ نسرین اُس کی بے چینی سمجھ گئی،

''دونوں بیٹے میرے ہیں۔'' وہ بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ماں کہتی ہے کہ وہ ہوائی ہیں۔'' اُس نے نسرین کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ بیوی کی سانسوں میں مدافعت تھی۔

''وہ اُس نے فرض کر رکھا ہے، ویسے بھی ایک دوسرے سے چمٹے رہنا ہم دونوں کی مجبوری تھی۔ اگر...... خیر...... وہ میرے...... میرے جائز بیٹے ہیں جن کو ایک آدمی نے میرے اندر اپنے تخم سے اُگایا۔ مجھے پچھتاوا نہیں۔'' شکور کو لگا کہ قتل کا خون بہا ادا ہو گیا ہے۔ وہ چار پائی پر بیٹھے ایک کشتی میں سوار دو اجنبی بن گئے۔ وہ تھوڑا ہٹ کر بیٹھ گیا کہ نسرین کا بدن اُس کے بدن کے ساتھ نہ لگے۔

''تمھیں اپنے شکار کے بارے میں کچھ علم ہے؟'' نسرین کے لہجے میں گستاخی سے ملتا جُلتا اعتماد تھا۔ اِس سوال پر اچانک شکور کو اپنی ماں کا خیال آیا۔ اُس نے ہوائی بیٹوں کی بات گھڑ کر گھر کے ماحول کو ہموار رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن نسرین نے پوری بات کھول کر رکھ دی۔ شکور نے نسرین کے سوال کا جواب دینے کا سوچا ہی تھا کہ وہ بول پڑی، ''اگر تم چاہو تو میں اپنے بیٹوں کے باپ کا نام بتا سکتی ہوں۔''

''نہیں۔ یہ تمھارا راز ہے۔''

نسرین کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ہم ایک دوسرے کے رازوں کی حفاظت کریں گے۔''

اُسی وقت فجر کی اذان گونجی۔ نسرین اذان کی آواز سے تھوڑا پریشان سی ہو گئی۔ اُسی وقت بلی کے پنجوں کے دروازے کو کھرچنے کی آواز نے دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ نسرین نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا، صبح کے نرم سے اُجالے میں چھوٹا لڑکا وہاں کھڑا کانپ رہا تھا۔ وہ ہاتھ سے پکڑ کر اُسے اندر لے آئی۔ لڑکا ماں کے ساتھ لگا، جھجکتے اور شرماتے ہوئے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھایا تو لڑکا اقرار اور انکار کرتے ہوئے گھٹنے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

’’تمھارا بڑا بھائی جاگ رہا ہے؟‘‘ لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔’’جاؤ، اُسے بلالاؤ۔‘‘
لڑکا جھجکا اور پھر ماں کے اشارے پر باہر بھاگ گیا۔
’’یونیں کونسل میں اِن کی پیدائش کا اندراج ہے؟‘‘ نسرین نے نظر جھکا لی۔ شکور جواب سننا چاہتا تھا، ’’بتاؤ؟‘‘
نسرین پہلی مرتبہ پُراعتماد نہیں رہی تھی۔ وہ خاموشی سے دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔
’’کل میں دونوں کا اندراج کروالوں گا اور .....‘‘ وہ خاموش ہوگیا۔ نسرین کھسک کر اُس کے ساتھ لگ گئی۔
’’اور کیا ؟‘‘ نسرین کی آواز میں ایک خوف اور مایوسی تھی۔ باہر دونوں لڑکوں کے پاؤں گھسیٹنے کی آواز آئی۔
’’اور پھر میں قتل کا حساب دینے چلا جاؤں گا۔‘‘
’’جانا ضروری ہے؟‘‘ نسرین کی آواز میں اِلتجا تھی۔ لڑکے اندر داخل ہوئے تو اُس نے دونوں کو اپنے پاس بلایا۔
’’مجھے جانتے ہو؟‘‘ شکور نے دونوں کا ایک ایک ہاتھ اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔
’’میں تمھارا باپ ہوں۔‘‘ بڑے لڑکے نے معنی خیز نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ نسرین نے سر سے ہلکا سا اشارہ کیا تو وہ خوشی سے مسکرا اُٹھا۔
’’ابا! اب تو نہیں جاؤ گے؟‘‘ بڑے لڑکے نے پوچھا۔ شکور اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ہلکا سا مسکرا دیا!
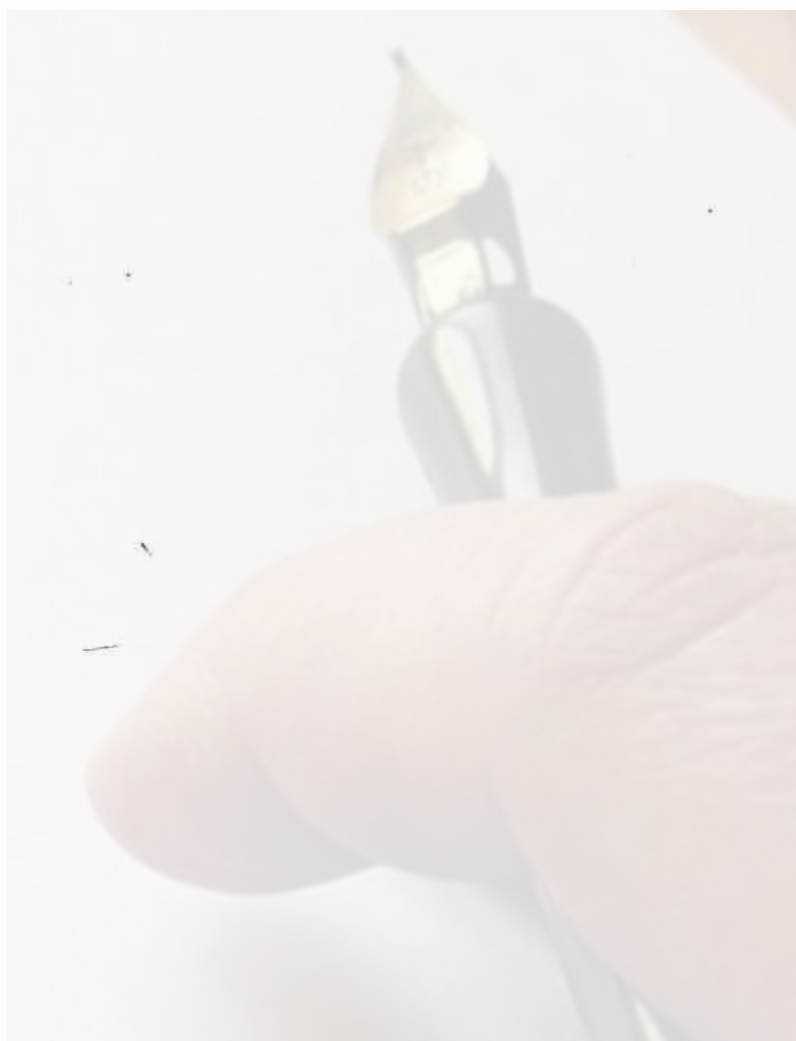
راکھ میں چنگاری

غلام نے جب آنکھ کھولی تو روشنی کی تیز برچھیاں اُس کی آنکھوں کے آر پار ہو گئیں، اُس نے سر میں اُٹھنے والی ٹیسوں کی شدت سے دوبارہ آنکھیں میچ لیں اور اپنی اُلانی چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا رہا۔ بند آنکھوں پر تیز روشنی کے لمس نے اُس سے آہستہ آہستہ آنکھیں کھلوائیں اور اُس نے گہری نیند سونے کے باوجود تھکی ہوئی نظر سے صحن کو دیکھا جو اُسے ہر دن کی طرح اجنبی سا لگا۔ وہ ایک مرتبہ اپنی ماں کے عزیزوں کو ملنے گٹ والے گیا تھا۔ اُن کا گھر گاؤں کے باہر تھا اور سامنے رڑی تھی جس میں بتاشے کی شکل والے مٹی کے بے شمار چھوٹے چھوٹے کنکر پھیلے ہوئے تھے۔ یہ کنکر اُس رڑی کو ایک اُجڑی ہوئی شکل دیتے تھے۔ غلام ہر صبح جب اپنے صحن کو دیکھتا تو اُسے وہ میدان یاد آ جاتا۔

غلام نے تھکی ہوئی نظر سے صحن کو دیکھنے کے بعد کسل مندی سے ایک انگڑائی لی اور بھاری قدموں سے چلتے ہوئے نلکے تک گیا۔ وہ نلکے سے کلی کر کے گھر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اُس کے گھر سے باہر رہنے کی دو وجوہات تھیں: ایک تو اُس کا گھر کی ویرانی سے جی گھبراتا تھا، ایسے لگتا کہ دم گھٹ جائے گا اور دوسرے، بھرے ہونٹوں اور بھرے ہوئے جسم والی اُس کی بھابھی جو ہر وقت اُس کے ساتھ کھیتی تھی۔ وہ گھر کی ویرانی سے اتنا نہیں گھبراتا تھا جتنا اپنی بھابھی سے جو اپنا سارا رس اُس پر نچوڑ دینا چاہتی تھی۔ اُس کا بھائی کھیت مزدور تھا اور سارا دن کسّی، درانتی اور کلہاڑا لیے مختلف کام کرتا اور رات کو جب تھکا ہوا آتا تو اُسے اپنی بیوی ایسی ڈائن لگتی جو اپنے بچے کھا کر اب پڑوسن کے بچوں کو للچائی ہوئی نظر سے

دیکھ رہی ہو۔ وہ اُس سے کسی حدتک خوف زدہ رہتا تھااور وہ ابھی سورہی ہوتی جب اپنا سامان کندھے پر لٹکائے اور ہاتھ میں تھامے گھر سے نکل جاتا۔ اُسے یہ بھی جلدی ہوتی تھی کہ جہاں اُس نے کام کرنا ہوتا تھا وہاں تین وقت کا کھانا بھی ملنا ہے۔

غلام نے کلی کر کے نہار پیٹ ایک گھونٹ پانی کا پیا تو اُسے پانی کی تازگی اپنے اندر سرایت کرتے ہوئے محسوس ہوئی۔ اُسے دوستوں کے ساتھ رات کی محفل یاد آ گئی۔ وہ تینوں جیرو کے تنور پر رات دیر گئے بیٹھے گپیں ہانکتے رہے تھے اور وہ چولھے کے پاس بیٹھی اُن کی باتیں غور سے سنتے ہوئے اپنی رائے بھی دے دیتی رہی تھی۔

جیرو اور اُس کے گھر کی دیوار سانجھی تھی۔ غلام کو اپنا گھر جہاں رَڑے کی طرح ویران لگتا، ساتھ والے گھر میں اُسے پپلوں کے قہقے سنائی دیتے۔ جیرو کے گھر میں پیپل کے دو درخت تھے، ایک صحن میں اور دوسرا اُس کے چھوٹے سے احاطے میں جہاں تنور اور چائے کا چولھا تھا۔ وہ تنور کو ہر دوپہر گرم کرتی اور کئی گھروں سے گندھا ہوا آٹا یا بنے ہوئے پیڑے آتے اور روٹی لگوانے والیاں ایک پیڑے کے برابر کا خشک آٹا روٹی لگوانے کی مزدوری لاتیں۔ جیرو کا خاوند شیدا بائیسکل پر پھیری لگا کر سبزی بیچتا، جس کے لیے اُسے ہر روز صبح سبزی منڈی کے باہر بیٹھے پھڑیوں کے پاس جانا ہوتا۔ غلام کے بھائی کی طرح وہ بھی رات کو تھکا ہارا آتا اور لیٹتے ہی سو جاتا۔ اس کے باوجود جیرو ہر سال ایک بچے کو جنم دیتی! کہا یہی جاتا تھا کہ غلام ہی اُس کے بچوں کا باپ ہے۔

رات بھی جب وہ اُن کی باتیں سُن رہی تھی تو دنوں کے قریب اپنے پیٹ کو ڈوپٹے سے ڈھانپے ہوئے تھی!

غلام نے ایک نظر جیرو کے صحن میں لگے پیپل پر ڈالی۔ ہمیشہ کی طرح پیپل کے پتے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے، دھوپ میں رکھے آئینوں کے بے شمار ٹکڑوں کی طرح۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا، پتے ایک دوسرے سے ٹکرائے اور پیپل نے اِس گدگدی سے ایک قہقہہ بلند کیا۔ غلام پیپل کو دیکھتے ہوئے تھوڑا سا مسکرا دیا۔ اُس نے صحن میں چاروں طرف نظر دوڑائی، چولھا ٹھنڈا پڑا تھا، اُس نے قریب جا کر دیکھا، آگ جلنے کے بعد بجھ گئی تھی۔ اُسی وقت اُس کا بھائی اور بھابھی کمرے سے نکلے ، دونوں قدرے شرمندہ سے تھے جیسے بچہ ماں سے چوری ہٹی میں ڈالنے کے لیے گندم سے جھولی بھرتا

پکڑا گیا ہو۔ غلام کو حیرت ہوئی کہ اُس کا بھائی، جو عید کے دن بھی نماز پڑھنے کے بجائے کام پر جانے کو ترجیح دیتا تھا، آج کام پر نہیں گیا اور اُسے اپنی بھابھی کے چہرے پر سکون کا غرور اور وقار دیکھ کر رقابت کے خنجر کے وار کے درد نے ادھ موا کر دیا۔ اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی بھابھی کی طرف دیکھا۔ اُسے خود پر غصہ آیا اور ترس بھی کہ جب وہ پاس سے گزرتے اُس کے ساتھ کھیتی تھی تو اُسے اُلجھن اور ایک طرح سے گھن آتی تھی اور اب، جب وہ اپنے خاوند سے سیراب ہو کر آئی ہے تو اُسے بُرا کیوں لگا؟ اُسے تو اِس رستے ہوئے جامن سے زیادہ دھوپ میں پڑے رہنے کی وجہ سے مرجھائے ہوئے بدمزہ بیر میں زیادہ کشش نظر آتی تھی۔ وہ اُن دونوں کے پاس سے گزر کر اپنی رسی اور چادر لینے کے لیے اندر چلا گیا۔ اُس نے چادر کندھے پر لٹکا کر رسی ہاتھ میں لی اور پھر اُن کے پاس سے گزرا تو اُس کی بھابھی نے کہا:

''کچھ کھا جاؤ، گامے!''

غلام نے گھبراہٹ، بے چینی، بے یقینی اور کسی حد تک خوف کے ساتھ اپنی بھابھی کی طرف دیکھا۔ غلام کو اُس کی آنکھوں میں ایک پل کے لیے دھند کی گہرائی نظر آئی اور پھر اُسے وہ ایک گہرے سکون کو اوڑھے ہوئے محسوس ہوئی۔

''نہیں! میں نے رات جیرو کو ناشتہ بنانے کا کہا تھا۔ وہ میرے انتظار میں ہوگی۔'' غلام جواب کا انتظار کیے بغیر دونوں کے درمیان میں سے گزر کر گلی میں آ گیا۔ اُسے جیرو کا ذکر کرتے ہی رات تنور والی ملاقات کی تفصیل یاد آ گئی۔ وہ شہر میں کسی راج یا مستری کے ساتھ کام کرنے کے بجائے دال بازار میں دکانوں پر کام ڈھونڈتا۔ اُسے ٹرکوں سے بوریاں اُتارنے یا چڑھانے کا کام مل تو جاتا لیکن مزدوری اتنی کم ہوتی تھی کہ وہ بمشکل اپنے کھانے اور چائے کے اُدھار ہی اُتار سکتا، چناں چہ وہ دکانوں پر خریداری کرنے والی عورتوں سے بھی گڑگڑاتے ہوئے خریدا ہوا سامان گھر تک پہنچانے کی درخواست کرتا رہتا۔ کل ایک عورت نے اپنی خریداری کرنے کے بعد اُس کا پانڈیوں والا حلیہ دیکھنے کے بعد جھجکتے ہوئے اُسے اپنا سامان کھنڈ بازار تک پہنچانے کا کہا۔ غلام کو وہ دراز قد عورت پسند آئی تھی۔ اُس نے سر پر ڈوپٹہ ایسے رکھا ہوا تھا کہ نہ بھی رکھا ہوتا تو اتنا فرق نہیں پڑتا تھا۔ اُس عورت کی نظر بے باک اور متجسس تھی۔ ایسی عورتوں کے متعلق اُس نے دکان داروں سے اکثر سن رکھا تھا کہ وہ یا

تو کنجوس ہوتی ہیں اور یا پھر کھلے ہاتھ والی۔ وہ عورت آگے چلتی رہی اور غلام اُس کے پیچھے پیچھے۔ اُس نے اتنا سامان بھی نہیں اُٹھایا ہوا تھا کہ اُسے کوئی دقت محسوس ہوتی مگر وہ اُس گھوڑے کی طرح تھا جس کا سوار اناڑی ہو۔ عورت اپنے گھر کی ڈیوڑی کے سامنے رُکی اور غلام کو وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کر کے اندر چلی گئی۔ غلام کو وہ مختصر سا انتظار طویل ترین لگا۔ عورت نے اُسے اندر بلایا اور وہ نیم روشن ڈیوڑی میں داخل ہو گیا۔ اب عورت پھر اُس کے سامنے نہیں تھی۔ وہ کسی حد تک حیران کھڑا گھر میں پھیلے گہرے اَسرار کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ عورت شیشے کے جگ میں لسی اور پلاسٹک کا گلاس لے کر آ گئی۔

''یہ وہاں رکھ آؤ!'' عورت نے صحن کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ غلام نے صحن کے اندر نظر دوڑائی تو ایک آدھ کھلے دروازے میں لٹکتے پردے کے پیچھے اُسے چار زنانہ پاؤں نظر آئے۔ سامان رکھ چکنے کے بعد اُس نے پھر ایک دفعہ اُس طرف دیکھا تو اُسے اُن دونوں میں سے ایک عورت نظر آئی جو نوجوان تھی اور جس کا رنگ سفید اور آنکھوں میں حیرت تھی۔ غلام اُس کی آنکھوں کی حیرت اپنی آنکھوں میں سمیٹتے ہوئے واپس پلٹا تو عمر میں بڑی عورت نے اُسے لسی کا گلاس تھماتے ہوئے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

غلام ڈیوڑی کے وسط میں بیٹھ گیا۔

''کہاں کے رہنے والے ہو؟'' اُس وقت تک غلام ایک بڑا سا گھونٹ لے چکا تھا۔ اُس نے جواب دینا چاہا تو جلدی سے لسی کو حلق میں سے گزارتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عورت نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا تو غلام نے اپنی خفت مٹانے کے لیے دروازے کی طرف دیکھا تو سامان کے پاس دونوں کم عمر عورتیں کھڑی نہایت دل چسپی سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ اُسے تینوں عورتوں کا تجسس پسند آیا!

''بھکوے والی!'' غلام نے آخری گھونٹ اُتارتے ہوئے کہا۔ عورت نے فوراً اُس کے گلاس کو پھر بھر دیا۔

''پڑھنا لکھنا کے راستے میں نہیں پتہ؟'' اُس عورت کی آواز میں دل چسپی تھی۔

''ہاں!''

عورت نے ایک لمبی سانس لی، اُس کے چہرے پر دھندسی چھا گئی تھی۔ غلام کو لگا کہ اُس کی

آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''نہر سے تھوڑا پہلے ہے۔'' غلام نے بات کو لمبا کرنے لیے کہا۔

''یاد ہے۔ بچپن کیسے بھولا جا سکتا ہے؟'' آواز اُداسی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''ایسے ہی ہے۔'' غلام نے فلسیانہ انداز میں جواب دیا۔

''تم وہاں سے روز شہر آتے ہو؟'' عورت کا اعتماد بحال ہو چکا تھا۔

''ہاں جی!''

''روز کے کرائے کی وجہ سے تمھارا خرچ کیسے پورا ہوتا ہے؟'' عورت کے چہرے کی سنجیدگی سے خائف ہو کر غلام اُس کی طرف دیکھنے سے کترا رہا تھا۔

''پیدل آتا ہوں۔''

''وہاں سے دال بازار تک؟ بہادر آدمی ہو۔''

''ہاں جی!''

''زندگی میں عجیب اتفاق ہوتے ہیں۔ پنا کھہ میرا مائیکہ ہے۔ یہاں شادی ہوگئی، کچھ عرصہ ماں باپ سے ملنے کے لیے وہاں جانا ہوتا رہا اور پھر اُن کے جانے کے بعد بالکل ختم ہوگیا۔ گھر والا روٹی روزی کے چکر میں باہر چلا گیا اور واپس نہیں آیا، صرف باقائدگی سے پیسے آتے ہیں.....'' وہ عورت خاموش ہوگئی۔ ''کبھی آ ہی جائے گا!'' اُس نے غلام کے ہاتھ میں خالی گلاس دیکھا تو اُسے بھرنے کے لیے آگے بڑھی مگر غلام نے گلاس کے اوپر ہاتھ رکھ کر بھرنے سے منع کر دیا۔ غلام کو اپنے اندر ایک کھوہ سی پڑتے ہوئے محسوس ہوئی، وہ زندگی کے ایسے واقعات اور اُن کے ساتھ وابستہ المیوں سے واقف ہی نہیں تھا، اُس کی زندگی تو جیرو کے گھر اور دال بازار کے درمیان میں قید تھی، اُس نے تو اپنے بھائی کے متعلق بھی نہیں سوچا تھا۔ غلام نے صحن والے دروازے کی طرف دیکھا تھا، دونوں جوان عورتیں بھی اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

''میری بیٹیاں ہیں۔'' عورت کی آواز میں ایک کپکپی تھی، غلام کو لگا تھا کہ اگر وہ بولا تو آواز اُس کے جذبات کا اظہار کر جائے گی۔ اُس نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنا گلا صاف کیا تھا۔

عورت ایک بجھی بجھی سی ہنسی ہنسی تھی۔

''ہم نے اتنی باتیں کرلیں، میں نے تمھارا نام ہی نہیں پوچھا۔'' عورت نے مصنوعی سی خوش مزاجی سے پوچھا تھا۔

''غلام!'' اُس نے اپنی ڈوری اور چادر سنبھالتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''شادی شدہ ہو؟'' عورت کے اِس سوال پر غلام نے اُسے عجیب سی نظر سے دیکھا تھا، اُسے ایسے لگا کہ تیز ہوا اُس کی دھوتی کو آگے سے اُڑا رہی تھی۔ اُس نے نہ جانے کیوں دھوتی کو اُڑنے دیا تھا۔

''ہاں!'' غلام نظر جھکاتے ہوئے شرمندہ سی آواز میں بولا تھا۔

''میں نے کسی غلط فہمی کے تحت گھر کو بڑا کرا دیا تھا۔ غلام! نتیجے میں اوپر والی منزل میں دو کمرے خالی ہیں، وہاں آ جاؤ۔ اگر تمھارے بچے ہیں تو اور بھی اچھا ہوگا، رونق لگی رہا کرے گی۔'' عورت کی آواز میں ایک معصومانہ جوش تھا۔ غلام نے عورت کی طرف رحم طلب نظر سے دیکھا تھا، جیسے اپنی طاقت سے زیادہ وزن اُٹھاتے ہوئے پھسل گیا ہو۔ عورت نے ایک بار پھر اُس کا مسئلہ حل کر دیا تھا، ''میں دو مرتبہ خاندانوں کو یہاں رکھ چکی ہوں اور وہ چوری کر کے بھاگ گئے۔ مجھے تم شریف آدمی لگے ہو۔'' غلام کا دل قہقہہ لگانے کو کیا تھا، گاؤں والے اُسے جیرو کا یار اور نہ جانے کیا کچھ کہتے تھے۔ اُسے عورت پر ایک دم ترس آیا۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل گیا۔

''کل آؤ گے!'' عورت کی بے بسی نے اُس کا پیچھا کیا تھا۔

غلام جب بھابھی اور بھائی کے پاس سے گزر کر جیرو کے تنور پر آیا تو وہ چولھے پر اُس کے انتظار میں نہیں بیٹھی تھی۔ اُس کی بیٹی نے بتایا: ''ماما! ماں کی طبعیت خراب ہے اِس لیے اُس نے کہا ہے کہ تم کہیں اور ناشتہ کر لو۔''

غلام کو تھوڑی سی پریشانی ہوئی۔ اُسے پچھلے دو دنوں سے وہ کمزور اور پریشان لگی تھی۔ وہ ناشتہ کہاں کرے؟ وہ گھر جا کر ناشتہ کر سکتا تھا لیکن جیرو نے اُسے کہیں اور جا کر ناشتہ کرنے کو کہا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ گھر جا کر ناشتہ کر لے اور اُس نے اپنا ماما ہونا بھی اپنے اور گاؤں کے ساتھ ایک سنجیدہ مذاق سمجھا تھا۔ جیرو کی بیٹی اُس کی اپنی بیٹی تھی لیکن وہ اُس کا ماما ہی بن سکتا تھا، باپ نہیں!

غلام شہر کی طرف چل پڑا۔ وہ جیرو کی وجہ سے تھوڑا پریشان اور کسی حد تک مطمئن بھی تھا کہ

آج وہ ایک اور مرحلے میں سے گزر جائے گی؛ کھنڈ بازار والی عورت اُس کے ذہن سے نکل گئی۔ وہ دال بازار گیا تو اُسے تین ٹرکوں کا سامان اُتارنے کی مزدوری ملی۔ ہر بوری اُتارتے ہوئے اُسے لگتا کہ وہ جیرو کو اُٹھائے ہوئے ہے لیکن پھر خیال آتا کہ جیرو اِتنی بھاری تو کبھی نہ تھی، وہ تو اب ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی جسے بوقتِ ضرورت وہ اپنے بازوؤں میں لے کر توڑ دیتا تھا اور ٹوٹی ہوئی جیرو کو جُڑنے میں پورے نو مہینے لگتے۔ وہ پھر جُڑنے والی تھی لیکن اب وہ اُسے کبھی نہیں توڑے گا! جب آخری ٹرک شروع ہوا تو اُسے کل والی عورت کی درخواست یاد آئی۔ وہ رُک گیا تو منشی نے آواز لگائی: ''دیکھو یارو! آج گاما تھک گیا ہے۔''

غلام نے چادر سے منہ صاف کیا اور تھکاوٹ کو ماں کی گالی دے کر بوری اُٹھائی تو اُسے تھکاوٹ کا احساس ہوا۔ اُس کے ساتھ والے مزدور تیزی سے بوریاں گودام تک پہنچا رہے تھے۔ وہ کسی کو بتائے بغیر کھنڈ بازار کی طرف چل پڑا۔ وہ تھوڑا سا پریشان بھی تھا کہ اُس عورت کو کیا جواب دے گا؟ ڈیوڑی کا دروازہ کھٹکھٹانے کے تھوڑی دیر بعد جھجکتے ہوئے دروازہ کھلا تو وہ عورت غلام کو سامنے دیکھ کر کھل اُٹھی۔

''بیٹھو!''

غلام ڈیوڑی کے اندھیرے میں بیٹھ کر اپنا پسینہ خشک کرنے لگا تو وہ کل والے جگ میں شربت لے آئی اور جگ اور گلاس غلام کو دے دیے۔ غلام جب پہلا گلاس پی چکا تو وہ بولی:

''بیوی سے بات کی؟''

''نہیں جی۔''

''کیوں؟''

''میری جی شادی نہیں ہوئی......'' وہ رکا اور پھر تیزی کے ساتھ بات مکمل کر گیا، ''میں اپنے بھائی اور بھابھی کو بھیج دوں گا۔'' اور غلام نے اپنے آپ کو اتنا تازہ دم محسوس کیا کہ اُس کا دِل واپس دال بازار جانے کو چاہا لیکن آج شاید جیرو نے..... !

بارش کا دوسرا قطرہ

بارش کا جب پہلا قطرہ گرا تو شیدے نے خوف کے مارے چاروں طرف دیکھا!

وہ جب سویا تو آسمان ریوڑی کی طرح چمک رہا تھا اور اب جب اُس نے اوپر دیکھا تو بادلوں کا تنبو آسمان کو چھپائے ہوئے تھا اور ہوا کی رفتار میں حاملہ عورت کے چلنے کا بھاری پن تھا۔ بارش کا پہلا قطرہ اُس کے جسم کے کسی حصے پر نہیں گرا تھا اور نا ہی وہ اردگرد دھول پر گرا تھا کہ پانی اور مٹی کے ملاپ سے پیدا ہونے والی سوندھی خوشبو اُس تک پہنچی ہو۔ شیدے کو احساس ہو گیا تھا کہ بارش کا قطرہ کہیں گرا ہے اور اُس نے آسمان کی طرف دیکھنے کے بعد اپنی چارپائی کے ساتھ پڑے ڈھیر کو دیکھا جس کا بارش کے ساتھ ساس اور بہو والا تعلق تھا۔ اِس ڈھیر کے ساتھ اُس کی چند مہینوں کی محنت اور پورے خاندان کا مستقبل وابستہ تھا۔ ڈھیر کے ایک ایک دانے میں اُس کا اپنا چہرہ تھا اور اُس کے چہرے میں دانوں کا ڈھیر نظر آتا تھا۔ اُس نے محبت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ڈھیر کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ ماں کے چہرے کو اُس وقت دیکھتا تھا جب اُس کا باپ ماں کو غصے میں گالیاں دے رہا ہوتا اور اُسے لگتا کہ باپ کسی بھی وقت ڈنڈا لے کے ماں کو مارنا شروع کر دے گا۔ اُس نے اِس ڈھیر اکٹھا کرنے کے لیے بہت محنت کی تھی۔ اُس کی محنت میں انا کی تذلیل بھی شامل تھی کیوں کہ اُس نے طے کر رکھا تھا کہ ایک دن اپنے دانے پیدا کرے گا تا کہ اُسے کسی کے سامنے از سرِ نو ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔

شیدے نے پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ اُس نے بادلوں کے تنبو میں کہیں کوئی سوراخ یا وِتھ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن جب اُسے کوئی تارا نظر نہیں آیا تو اُس کی پریشانی اور خوف میں اضافہ ہو گیا۔ وہ چارپائی پر سے زمین پر ٹانگیں رکھ کے بیٹھ گیا اور بالوں میں انگلیاں پھیر کے ایک تھکی ہوئی انگڑائی لیتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے سوچا کہ ہر سٹے کے پودے کو اُس نے اپنے پسینے سے سینچا ہے اور اب وہ بارش کو اِنھیں گیلا کر کے خراب نہیں کرنے دے گا۔ گندم توقع سے زیادہ ہوئی تھی اور بیساکھ کا آخیر بارش کا موسم بھی نہیں تھا، ہوسکتا ہے کہ ہوا بادلوں کو اُڑا ہی لے جائے لیکن ہوا میں اُسے اتنی طاقت نظر نہیں آتی تھی کہ ایسا کر سکے۔ اُس کا باپ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ بیساکھ کی ہوائیں بہت طاقت ور ہوتی ہیں اور یہ بھرے میلوں کو ایک ہی وار میں اُجاڑ دیتی ہیں، وہ یہ بھی بتاتا کہ اِن ہواؤں میں توڑی اور دانے الگ کیے جاتے تھے؛ کئی کئی دن ہوا کے چلنے کا انتظار کرنا پڑتا تھا اور اب تو تھریشروں اور دوسری مشینوں نے یہ انتظار ختم کر دیے تھے۔

شیدے نے ڈھیر کو ڈھکنے کا فیصلہ کیا؛ اُس کے پاس ایک چادر تھی جس سے پورا ڈھیر ڈھانپنا ممکن نہیں تھا۔ کیا وہ گھر جا کر تمام چادریں نہ لے آئے؟ پہلے تو گھر میں اتنی چادریں تھی ہی نہیں اور پھر گاؤں سے ہو کر واپس آتے تک کافی وقت لگ جاتا ہے اور کوئی ڈھیر میں سے دانے نکال کر اگر لے گیا تو؟ اُس نے سوچا کہ اُس کی محنت پر ہاتھ صاف کرنا اتنا آسان نہیں؛ وہی چوری کرے گا جو اُس سے طاقت ور یا زیادہ ہوشیار ہو گا۔ اُس نے اپنی چادر، گھاس پھوس اور ارد گرد بکھرے ہوئے گندم کے پودوں سے ڈھیر کو ڈھانپنے کا فیصلہ کر کے چادر اوپر ڈال کر ارد گرد نظر دوڑانا شروع کر دی تا کہ دوسری چیزیں اکٹھی کرنا شروع کر دے۔ اُسی وقت ہوا تھوڑا زور پکڑ گئی اور دور کہیں سے اُسے اپنے باپ کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ وہ باپ کی متوقع آمد سے تھوڑا سا پریشان بھی ہوا کہ اُس نے ہر کام میں غیر ضروری دخل اندازی کرنا تھی اور شیدے کی اہمیت کو کم کرنے کی پوری کوشش کرتے رہنا تھا لیکن اُس کی باتوں میں ایک دلچسپی بھی تھی جس سے وقت کٹنے میں بہت مدد ملنا تھی۔ شاید وہ اتنا دور نہیں تھا اور ہوا کے مخالف رُخ کی وجہ سے آواز دور سے آتے ہوئے لگ رہی تھی۔ اُس نے سن رکھا تھا کہ پہاڑ سے آنے والی ہوا بادلوں کو اُڑا دیتی ہے اور وہ شمال کی طرف منہ کر کے بار بار کھڑا ہوتا کہ ہوا کا رُخ جان سکے۔ ایک بار وہ گھر میں ایسے ہی کھڑا تھا کہ اُس کے باپ کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ وہ اپنے

دروازے میں کھڑا باہر گلی میں گزرنے والوں کو دیکھ رہا تھا کہ اُسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا تو اُس کا باپ پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اُسے باپ کے عمل اور اپنے ردِعمل پر غصہ، حیرانی اور ہنسی آئی اور اپنے چہرے کو معمول کا رکھنے کے لیے کچھ وقت لگا۔ اب وہ شمال کی طرف منہ کر کے ہوا کو اپنے چہرے کے ساتھ مس کرتے محسوس کرنا چاہتا تھا؛ اگر ہوا اُس کے چہرے سے ٹکرا رہی ہو تو بادلوں کے اُڑ جانے کے امکانات روشن تھے۔ لیکن ہوا اُس کے چہرے کو مس نہیں کر رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ بادل اُڑیں گے نہیں۔ پچھم کی طرف سے آتی ہوا بادلوں کو برسنے میں مدد دیتی ہے اور پھر وہ مغرب کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ یہاں بھی ہوا نے اُس کے چہرے کو مس نہیں کیا تو اُسے اپنے اندر اُمید آنکھیں کھولتے محسوس ہوئی۔ اُس نے مشرق کی طرف منہ کیا تو ہوا کے نرم جھونکے اپنے چہرے سے مس کرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اِس کا مطلب تھا کہ ابھی مزید بادل آئیں گے۔ وہ مایوس ہو گیا۔ کیا اُس کے اوپر کا آسمان ایک پیالہ بن گیا تھا جس میں پورب سے آنے والی ہوائیں بادل ڈالے جا رہی تھیں؟ دکھن سے آنے والی ہوائیں تو خشک سالی کا پیغام لاتی ہیں اور اُسے وہ ہوائیں پسند تھیں جو بادل لائیں اور مینہ برسائیں، بھلے اُس کے دانے ہی خراب ہو جائیں۔

شیدے کو اب اپنے باپ کے قدموں کی پہچان تھی؛ ایک قدم لمبا اور ٹانگ میں درد کی وجہ سے دوسرا چھوٹا، وہ قدموں کی آواز سے اکثر آنے والے کو پہچان لیا کرتا تھا۔ اُس کے لیے یہ ایک کھیل تھا کہ وہ اپنے گھر کے دروازے میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا اور گزرنے والے قدموں سے چلنے والے کو شناخت کرنے کی مشق کرتا رہتا۔ وہ آدمیوں کو اُن کی چالوں سے پہچاننے لگا تھا لیکن عورتوں کی چال اُس کے لیے ایک مسئلہ تھا۔ وہ عموماً پاؤں اتنے دھیرج سے رکھتیں کہ اُن کی آہٹ کو سن ہی نہ سکتا، شناخت کرنا تو دور کی بات تھی۔ ہوا کے نرم جھونکوں میں سے چھنتی ہوئی قدموں کی جو آواز وہ سن رہا تھا اُس کے باپ کی نہیں تھی۔ یہ آواز متواتر، ایک ہی رفتار سے آ رہی تھی، چال میں اعتماد کے ساتھ ایک احتیاط بھی تھی۔ وہ بارش اور ہواؤں کے رُخ کو بھول کر نزدیک آتے قدموں کی آواز سننے لگا۔ یہ قدم دو بار اُس کے دروزے کے سامنے سے گزرے تھے لیکن اُن کی آواز سے وہ گزرنے والے کو شناخت نہیں کر سکا تھا۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو دونوں مرتبہ گزرنے والا نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ قدم نزدیک آ رہے تھے اور شیدا شکست ماننے کو تیار نہیں تھا؛ اُس کا ذہن اُس مداری کے جسم کی

طرح اُلٹی سیدھی قلابازیاں لگا رہا تھا جو اپنے بدن کے گرد لپیٹے گئے رسوں میں سے نکلنے کے لیے کوشش کر رہا ہو۔ وہ قدم اُس کے پیچھے آ کر رُک گئے۔ اُسے گھر کے دروازے میں اپنے پیچھے کھڑا باپ یاد آ گیا؛ تب وہ چونک گیا تھا۔ اب اُس نے نہ چونکنے کا فیصلہ کر کے پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو اُس کے سامنے مڑا سا مارے ہوئے ایک لمبا رتڑنگا آدمی کھڑا تھا۔ شیدے کے پاس اُسے پہچاننے کا وقت بہت کم تھا۔ ابھی تک بجلی نہیں چمکی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ بجلی کا ایک لشکارا ہو جو سامنے کھڑے آدمی کو روشنی میں نہلا دے تاکہ وہ اُسے پہچان سکے۔ اُسے اچانک احساس ہوا کہ ہوا کسی ایک سمت سے آنے کے بجائے رُخ بدلتے ہوئے چل رہی ہے اور ہوا کی اسی گھمن گھیری سے بادلوں کی حرکت کے نتیجے میں ایک لمحے کے لیے نرم سا اُجالا ہر طرف پھیل گیا اور اگلے ہی لمحے گھُپ اندھیرا! شیدے نے دیکھا کہ اُس آدمی کے دائیں ہاتھ میں ایک پستول تھا اور اُسے تسلی ہوئی کہ وہ دستے کے بجائے پستول کو بیرل سے پکڑے ہوئے تھا۔ شیدے کی توقع کے خلاف اُس آدمی کے جسم میں بجلی کے کوندے سی حرکت ہوئی اور پیشتر اِس کے کہ وہ اپنا بچاؤ کر سکتا پستول کا دستہ اُس کے بائیں کان کے اوپر سر میں لگا۔ گہری اندھیری رات اور بھی اندھیری ہو گئی اور اُسے لگا کہ وہ ہوا سے بھی ہلکا ہے اور بادلوں کی طرف اُڑتا جا رہا ہے؛ وہی بادل جن کا اُسے خوف تھا۔ اُسے اپنا وجود بے وزن لگا اُن دنوں کی طرح جب وہ پینگ چڑھاتے ہوئے خود کو بے وزن محسوس کیا کرتا تھا اور محسوس کرتا تھا کہ ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ اور پھر درد کی تیز چھری اُس کے سر کے آر پار ہو گئی، اُس تیز دھار چھری کی طرح جو ایک ہی جھٹکے میں تربوز کو درمیان میں سے دو کر دیتی ہے۔ اُسے اپنا وجود منوں بھاری لگا، جیسے کسی اور کا ہو؛ وہ ٹپکے کے آم کی طرح نیچے آن گرا۔

شیدا جب خواب کی کسی دنیا سے باہر نکلا تو وہ آنکھیں کھولنے سے خائف تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی آنکھوں سے ایک نہر بہہ نکلی ہے، اُس نہر سے بھی گہری جو اُس کے گاؤں کے سرہانے بہتی ہے۔ ایک زمانے میں اپنے ہم جولیوں کے ساتھ نہاتے ہوئے، گدلے پانی میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے، کچھ نہ دیکھ سکنے کے باوجود، وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ اُن آنسوؤں کی نہر میں بہتے ہوئے اُس وقت اُس کی وہی کیفیت تھی جو ڈبکی میں سانس ٹوٹنے کے وقت ہوتی تھی۔ اُس نے جلدی سے آنکھیں کھولیں، مبادا اُس کا سانس ٹوٹ جائے!

کیا وہ رو رہا تھا؟ اُسے حیرت ہوئی کہ وہ رو کیوں رہا تھا؟ اب تو اُس کے سر میں درد بھی نہیں

تھا۔ کیا وہ آدمی اُن لٹیروں کی طرح تھا جو پولٹری فارم سے تیار چوزے گاڑیوں میں ڈال کے لے جاتے ہیں؟ اُس کے دانوں کا ڈھیر اتنا بڑا نہیں تھا کہ کوئی لٹیرا پستول کے دستے سے اُسے زخمی کر کے دانے اُٹھا کے لے جاتا اور نہ ہی اُس کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی کہ ایسا کرتا۔ وہ تو ایک محنت کر کے کمانے والا بندہ تھا، کسی کی چنگی منڈی میں کبھی نہیں آیا تھا۔ اُسے اپنے جسم میں طاقت محسوس ہوئی، مست لیٹے سانپ کی پہلی انگڑائی کی طرح۔ اُس نے آنکھیں کھولیں تو اُس کی نظر کے سامنے اندھیرا تھا، گہرا سیاہ اندھیرا، کسی گہرے اندھے کنویں میں آباد اندھیرے جیسا۔ پھر اُسے دھندلی سی روشنی نظر آئی، اندھے کنویں کی گہرائی میں سے گہرے اندھیرے کے پار آسمان سے آتی روشنی کی طرح۔ اُس کے بدن میں حرکت ہوئی اور اُس نے اردگرد دیکھا۔ وہ دانوں کے ڈھیر کے پاس ڈھیا ہوا تھا اور اُس کا باپ نزدیک ہی بیٹھا ہوا تھا جیسے میت کے پاس بیٹھا جاتا ہے۔ شیدے کو اپنے باپ پر ترس آیا اور غصہ بھی کہ وہ اُسے مردہ سمجھ کر شاید پریشان تھا۔ بیٹوں کے مرنے پر باپ پریشان ہوتے ہیں یا دُکھی؟ اُس نے سوچا کہ وہ یہ ابھی تک تو نہیں جانتا، اُس کی شادی ہی نہیں ہوئی، وہ اولاد کے مرنے کے دکھ کو کیسے سمجھ یا محسوس کر سکتا ہے؟

شیدے کے باپ نے اُسے حرکت کرتے دیکھا تو اُس نے شیدے کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ٹٹولا اُس اندھے کی طرح جو اُنگلیوں سے آنکھوں کا کام لیتا ہے۔ شیدے کے چہرے پر آنسو خشک ہوئے بغیر جم کر رہ گئے تھے اور کھردرے چہرے پر اُسے گھاس کی پتیوں پر شبنم کے قطروں کی طرح لگے۔

''کب آئے؟'' اُس نے باپ کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ شیدا بولنے سے ڈر رہا تھا، اُسے اپنی آواز کی طاقت پر حیرانی ہوئی، اُس کا خیال تھا کہ اُس کے گلے سے نکلنے والی آواز کمزور، تھکی ہوئی اور بیمار سی لگے گی۔ اُس کے باپ کا ہاتھ گھاس کی نرم پتیوں کو محسوس کرتے کرتے رک گیا۔ باپ کا خیال تھا کہ شیدا زندگی اور موت کی جنگ میں موت کو مات دینے کی جدوجہد میں ہے۔ اُسے یقین نہیں آیا۔ اُس نے پھر شیدے کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اُسے پہلی مرتبہ شیدے کے جسم میں زندگی کی گرمی کا احساس ہوا۔

''جب وہ وار کر رہا تھا۔'' اُس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے تمھارے آنے کی آواز نہیں آئی۔''شیدے کو اپنے باپ کے آنے کا پتا نہ چلنا اپنے ہنر کی شکست لگا۔ کیا اُس کی مشق میں کمی رہ گئی تھی؟ اُس کے باپ کی چال ایسی تھی کہ اُسے دور سے ہی پتا چل جانا چاہیے تھا۔

''شاید ہوا آواز کو کسی اور طرف لے جا رہی تھی۔'' باپ کا جواب پھر مختصر تھا۔ اِس بار شیدے کو اُس کی آواز میں کوئی کھچاؤ محسوس نہیں ہوا۔

''پھر؟''

''اُسی وجہ سے تمھیں ہم دونوں کے آنے کی آواز نہیں آئی۔''

''پھر؟''

''میں تھوڑے فاصلے پر تھا اِس لیے وار کرنے سے اُسے روک نہیں سکا۔''

''پھر؟''

''اُس نے وار کر دیا۔''

''پھر؟''

''تب تک میں اُس کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔''

''پھر؟''

''میں نے بھی وار کر دیا۔''

شیدے نے جلدی سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اندھیرے میں وہ اُس کا چہرہ پڑھ نہیں سکا۔ اُسے اندازہ تھا کہ اُس کے بوڑھے چہرے پر لکیریں اُبھر آئی ہوں گی اور وہاں سوچ کی لکیریں بھی بن گئی ہوں گی۔ اُس کا چہرہ لکیروں کا جالا بن گیا ہوگا۔ اُس گوڑھے اندھیرے میں بھی وہ اُس کے چہرے کا تصور کر سکتا تھا۔

''تم اُسے جانتے ہو؟''

''ہاں! وہ بشیرے پردیسی کا بیٹا ہے۔''

''وہ تو باہر کے ملک میں ہوتا ہے۔''شیدے کی آواز میں حیرت تھی۔

''وہ آیا ہوا ہے۔'' باپ کی آواز میں ایک لرزہ تھا۔ شیدا سمجھ نہیں پایا کہ آیا یہ لرزہ ہوا کے رخ

بدلنے کی وجہ سے آواز اُس تک پہنچنے میں تھا یا کسی خوف نے پیدا کر دیا تھا!

''وہ تو وہاں کا رہائشی ہے اور سننے میں یہی ہے کہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔'' شیدے نے اپنے زخم والی جگہ پر جمے ہوئے خون کو انگلیوں کی پوروں سے محسوس کیا اور سر میں درد کی لہر اُسے جھنجھوڑ گئی۔ اُسے لگا کہ ہوا مزید ٹھنڈی اور تیز ہوگئی ہے۔ اُس نے اوپر دیکھا تو بادل اور بھی گھرے ہو گئے تھے۔

''لیکن وہ آ گیا ہے۔'' اُس کے باپ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیوں؟'' شیدا اپنے تجسس کو نا چھپا سکا۔

''تمھیں نہیں پتا؟'' باپ کی آواز میں حیرانی تھی۔

''نہیں۔ مجھے ایسی باتوں میں کبھی دل چسپی نہیں رہی۔'' شیدے نے روکھے سے لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے قتل کرنے آیا تھا۔'' شیدے کو لگا کہ اِس مرتبہ پستول چلا دیا گیا ہے اور گولی نے اُس کے سر کے کئی ٹکڑے کر دیے ہیں۔

''پھر؟''

''مجھے قتل کرنے کے لیے کسی قاتل کی ضرورت ہے۔'' باپ کی ہلکی ہلکی ہنسی تمسخر کا عکس لیے ہوئے تھی۔

''ہر قتل کرنے والا قاتل نہیں ہوتا؟'' شیدے نے طنز کیا۔

''نہیں۔ قاتل کا دلیر ہونا ضروری ہے۔'' شیدے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ابھی تک پہلے جھٹکے کو ذہن سے جھٹک نہیں سکا تھا۔ ''مجھے کئی لوگ مارنا چاہتے ہیں لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ مار سکیں۔ یہ لڑکا تو ابھی نابالغ ہے۔'' اُس کے باپ نے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ وہ ایک خاموش اور اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا۔

''وہ تمھیں قتل کرنے کے لیے اتنی دور سے کیوں آیا ہے؟'' شیدے کا تجسس غالب آ گیا۔ اُس کے باپ نے ایک لمبی سانس لی۔ شیدا اُسے عجیب سی نظر سے دیکھ رہا تھا اور وہ مطمئن بھی تھا کہ اُس کا باپ اُس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا۔

''تمھیں تمھاری ماں نے نہیں بتایا کبھی؟'' اُس کی آواز میں حیرت تھی۔ پھر اُس نے جواب کا انتظار کیے بغیر بات جاری رکھی، ''بشیر پردیسی کی شادی سے پہلے میرا اُس کی ہونے والی بیوی سے تعلق تھا جو شادی کے بعد بھی جاری رہا۔ میری بھی شادی ہوگئی تھی لیکن میرا بختاور کے ساتھ رشتہ ختم نہیں ہوا۔ ایک قیاس یہ بھی ہے کہ تم پر حملہ کرنے والا میرا بیٹا ہے لیکن وہ میرا بیٹا نہیں۔'' اُس نے قطعیت سے کہا۔ شیدے کو اپنے پیٹ کے اندر کوئی سانپ کنڈلی مارتے ہوئے محسوس ہوا۔ ''ایسے ہی کسی واقعہ سے بچنے کے لیے پردیسی نے اپنے بیٹے کو چھوٹی عمر میں باہر کے کسی ملک میں بھیج دیا تھا۔ اُس کے چند رشتے دار پچھلی تین نسلوں سے گوروں کے کسی دیس میں رہ رہے ہیں۔ اِس کی دُبئی میں جب دانا پڑنا شروع ہوا تو بشیر نے اُسے وہاں بھجوا دیا۔ اب یہ لڑکا مجھے قتل کرنے آیا تھا۔'' وہ رک گیا اور اُس نے پھر لمبی سانس لی۔ ''لیکن مجھے قتل کرنے سے پہلے قاتل ہونا ضروری ہے۔'' شیدے نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا؛ اُسے لگا کہ ابا کہیں سے بوٹی پی آیا ہے جو اتنی باتیں کیے جا رہا تھا۔

''اب بات پرانی ہوگئی، لوگ بھول بھال گئے۔ اب ہم پر وار کرنے سے اِن لوگوں کی پھر سے بدنامی

نہیں ہوگی؟'' شیدے نے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ اب پھر اُسے دانوں کی فکر نے گھیر لیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اپنے سوال کا جواب سُن کر وہ بارش سے بچاؤ کا بھی کچھ کرے گا۔ گردن ہلانے سے درد ایک چاقو کی طرح اُس کے سر میں گھس گیا۔ وہ کچھ دیر آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔

''یہ بدنامی یا نیک نامی کی بات نہیں، وہ بدلہ لے رہے ہیں۔ وار اُنھوں نے تمھارے باپ پر کرنا تھا کیوں کہ بختاور کی بدنامی کا میں سبب ہوں لیکن مجھے مارنا اتنا آسان نہیں۔'' وہ پھر آہستہ سے ہنسا، ''وہ مجھے اِس لیے نہیں مارتے کہ ڈرتے ہیں۔ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن میرا خوف ابھی تک اُنھیں میری طرف دیکھنے نہیں دے رہا۔'' شیدا جانتا تھا کہ اُس کا باپ اپنے وقت کا سب سے بڑا وارداتیا تھا۔ کوئی گھر یا حویلی اتنی پکی نہیں تھی کہ اُسے اندر جانے سے روک سکے۔ ''تم پر وار کرنا آسان ہے۔ تم محنتی آدمی ہو اور ہر محنتی بندہ کمزور ہوتا ہے۔ وہ کھوہ کھس کے کھانا نہیں جانتا اور جو ایسے نہیں کر سکتا اُس کے سر پر کوئی بھی پستول کا دستہ مار سکتا ہے۔'' شیدا اپنے باپ کی آواز میں سے پھوٹتے غصے سے خوف زدہ ہو گیا اور اُس نے تیزی سے باپ کی طرف دیکھا جس سے ایک بار پھر اُس کا سر درد سے

پھٹ گیا۔

شیدے کو اپنے باپ کی بات سے اتفاق تھا اور نہیں بھی۔ اُس نے اپنا بچپن ایک خوف کے سائے تلے گزارا تھا؛ اُنھیں ہر وقت پولیس کے چھاپے کا دھڑکا رہتا۔ اُس کا باپ جب بھی واردات کرتا تو چند دن وہ خوب اچھا کھاتے اور اُن کے چہروں پر خوش حالی کی رونق ہوتی اور پھر ایک دِن باپ، ماں کو اور اُسے نانے کے گھر بھیج دیتا جہاں غربت کا مستقل بسیرا تھا۔ باپ وہاں رہنے کے لیے اتنی رقم دے دیتا تھا کہ وہ چند دِن جو اُنھوں نے گزارنے تھے، نانا بھی مزے کر لے۔ شیدے کو یہ کرائے کی زندگی لگتی اور وہ ہر بار فیصلہ کرتا کہ بڑے ہو کر اپنی ماں کو اِس طرح بھگائے نہیں پھرے گا۔ ایک مرتبہ اُس کے باپ نے بڑی واردات کی جس کے بعد وہ وارداتیں چھوڑ گیا کیوں کہ وہ اب کہتا کہ اُس واردات کے بعد چھوٹی وارداتیں کرنا اُس کی عزت کم کریں گی۔

تب شیدے نے محنت کر کے زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا!

شیدے نے زخم میں شدید درد کے باوجود آسمان کی طرف دیکھا؛ بادل اُسی طرح سیاہ اور گہرا تھا اور بارش ٹلی نہیں تھی۔ وہ دانوں کا بندوبست کرنے کے ساتھ ساتھ باپ کی بات بھی سننا چاہتا تھا۔ اُسے اپنے باپ کی زندگی کے بارے میں ہر بات کا علم تھا سوائے جو آج اُس نے سنائی۔

''پر ابا مجھے مار کر اُس نے تم سے بدلہ کیسے لے لینا تھا؟''

''اپنی ماں کا نام صاف کرنے کے لیے۔''

''اب تک تو داغ وقت نے خود ہی مٹا دینا تھا۔''

''ہاں لیکن کچھ داغ صرف دھوبی ہی مٹاتا ہے۔'' باپ کی بات سے شیدا کسی حد تک لاجواب ہو گیا لیکن وہ بات کرتے ہی چلے جانا چاہتا تھا، ساتھ وہ یہ معاملہ جلد ختم کرنے کا بھی ارادہ رکھتا تھا۔ ''وہ داغ تم ہو حالانکہ ہونا مجھے چاہیے تھا۔ لیکن مجھے مارنے کے لیے قاتل ہونا ضروری ہے۔'' وہ رکا، تھوڑا کھانسا، پیچھے منہ کر کے تھوکا، ''تم ایک عرصے سے بڑے چودھریوں کے کامے رہے ہو اور کامے کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ انھوں نے تمھاری خدمت کے صلے میں گندم کے لیے یہ زمین دے دی جو سارا گاؤں جانتا ہے۔'' وہ خاموش ہو کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا، اُس نے شیدے کی طرف

دیکھا اور بات جاری رکھی، ''سب جانتے ہیں کہ تم یہاں رات کو اکیلے ہوتے ہو اور مجھے تمھارا چودھریوں کا کاما ہونا اور یہ مشقت پسند نہیں۔ وہ اِسے ہمارا اختلاف سمجھتے ہیں اِس لیے بشیر کے بیٹے نے تم پر وار کرنے کا فیصلہ کیا۔ بعض اوقات چکے میں سے ایک اینٹ گرائی جائے تو کئی گرتی ہیں، اپنی نظر میں وہ مجھ پر وار کر رہے تھے۔''

''وہ کون؟'' شیدا اب اُکتانا شروع ہو گیا تھا۔

''بشیر پردیسی اور اُس کا بیٹا۔''

''اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو اُنھوں نے تفتیش کا رُخ کسی اور طرف موڑ دینا تھا۔ بشیر نے رشوت کے لیے ایک بھاری رقم الگ رکھی ہوئی تھی جو گواہوں اور پولیس کو دی جانی تھی۔''

یہ سن کر شیدے نے پریشانی سے اوپر آسمان کی طرف دیکھا لیکن وہاں سب جوں کا توں تھا۔ اُس نے تمام توجہ سے بادلوں میں کوئی سوراخ، دراڑ یا وِتھ پھر سے ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن ناکامی کے بعد اُس کی نظر دانوں پر آ گئی۔

''پر ابا! مجھے مار کر اُنھیں ملنا کیا تھا؟'' شیدے نے پہلے کیے جانے والا سوال دہرایا۔

''میری بدنامی۔ اگر میں کچھ نہ کروں تو لوگ کہیں گے کہ عورت پر بیٹے کو قربان کر گیا اور اگر بدلہ لوں تو پھانسی۔ اُنھوں نے کھیل بہت سوچ کر تیار کیا ہوا تھا۔''

''ایک بات بتا؟'' اُس کی آواز میں اُمید، فخر اور توقع تھی۔

''کیا؟''

''تو اُس کا باپ ہے؟''

اُن دونوں کے درمیان میں خاموشی کو بجلی کی چمک اور پھر گرج نے توڑا۔ شیدے کو ڈھیر کے پار بشیر پردیسی کا بیٹا سکڑ کر لیٹا ہوا نظر آیا تو اُس کے دماغ میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔

''کیوں پوچھ رہے ہو؟'' شیدے کو لگا کہ باپ کے لہجے میں سے جارحیت جاتی رہی تھی۔ اُس کی آواز اُسے اپنے جیسے کسی زندگی کی مار کھائے ہوئے آدمی سی لگی۔

''جاننا ضروری ہوتا ہے۔ سب کی آنکھوں میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔'' پہلی مرتبہ اُسے اپنی آواز میں برتری کا احساس ہوا۔

''ہاں وہ میرا بیٹا ہے۔'' اُس کی آواز دھیمی تھی۔

''تو اُسے مجھے مار لینے دیتے!'' شیدے نے اپنی آواز میں درد اور شکست کو محسوس کیا۔

''مجھے پتا تھا کہ آج اُس نے وار کرنا ہے۔ میں راستے میں چھپ کر اُس کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ میں اُس پر سامنے سے وار نہیں کرنا چاہتا تھا سو پیچھے آتا رہا۔ میں جب اپنے چلنے کی آواز چھپانا چاہوں تو سانپ بھی میرے قدموں کی دھمک محسوس نہیں کر سکتے۔ اُس نے جب ہاتھ اُٹھایا اور تم نے مُڑ کر دیکھا تو میرا ڈنڈا اُس وقت ہوا کو چیر رہا تھا۔ اب وہ اُدھر پڑا ہوا ہے۔ میں یہاں سے گھسیٹ کر لے گیا تھا۔ وہ زندہ ہے اور مرے گا بھی نہیں۔''

''اُسے مجھے مار دینے دیتے یا پھر اُسے مار دیتے۔ ایک کو نہیں رہنا چاہیے تھا۔'' شیدے نے آہستہ مگر شدت سے کہا۔

''بشیر پردیسی یہی چاہتا تھا۔''

شیدے نے کوئی جواب نہیں دیا اور باپ کی بات کو اُس کی سوچ میں جذب ہوتے کچھ وقت لگا۔ پھر وہ کچھ بے یقینی اور کچھ مزاح سے ہنسا۔ ''ابا تجھے کیسے پتا چلا کہ وہ آج مجھے مارنا چاہتے تھے۔''

باپ نے آسمان کی طرف دیکھا جیسے وہاں سے مدد چاہتا ہو اور جواب میں بجلی چمکی اور بادل گرجا۔

''مجھے بختاور نے بتایا دیا تھا۔'' شیدے کی آنکھوں کے سامنے بختاور کا بڑھاپے کی طرف گامزن چہرہ گھوم گیا۔

تب اُس کا باپ اُٹھا اور اپنی بھاری چال سے بوہل کے دوسری طرف گرے ہوئے آدمی کی طرف چل پڑا۔ اُسی وقت شیدے نے آسمان کی طرف دیکھا تو بارش کا دوسرا قطرہ اُس کے چہرے پر گرا!
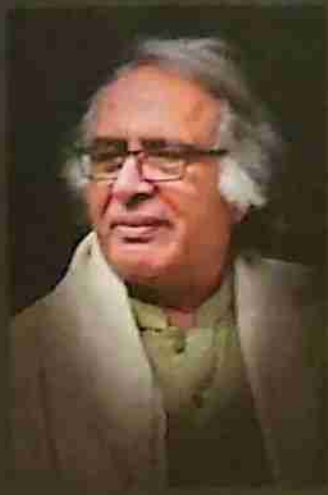
اُردو کے افسانوی ادب میں خالد فتح محمد پکی روشنائی سے لکھا ہوا وہ نام ہے جس کی درخشندگی آنے والے وقت کے ساتھ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں یا ناول نگار، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے، مگر وہ تخلیق کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ تخلیق میں بغاوت یا انحراف میں ہی انفرادیت کی اساس دیکھتے ہیں لیکن یہ روایت سے منہ موڑنے کا نام نہیں بلکہ نئے راستے کی تلاش کا نام بھی ہے یعنی یہ صرف انہدام سے نہیں بلکہ تعمیر نو سے متشکل ہوتی ہے..... خالد فتح محمد نے فکری اور فنی اظہار کی سطحوں پر جس تبدیلی کا احساس دلایا ہے وہ یقیناً ایک نئی تعمیر کا پیش خیمہ ہے۔ اُن کے افسانے موجودہ معاشرے کی پیچیدگیوں اور عصری زندگی کی المناکیوں سے تشکیل شدہ ہیں اِس لیے اُن میں سماجی حقیقت نگاری کا وہ عکس جمیل نظر آتا ہے جس کی روشنی میں معاشرے کی نفسیاتی، سماجی اور عصری شعور کی عکاسی دیکھی جا سکتی ہے۔ فن پر اُن کی گرفت شاید ہی کبھی ڈھیلی ہوئی ہو، گنجلک اظہار کی راہ سے الگ اُن کی راہ رہی ہے۔ معاصر دور میں اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اردو افسانہ جو دوبارہ جنم لینا چاہتا ہے یا اُس آدم کو جنم دینا چاہتا ہے جو تخلیق نو کی آرزوؤں سے بھرپور افسانہ لکھ سکے تو خالد فتح محمد کو پڑھیے کہ اُن کی افسانہ نگاری جدید اردو افسانے کی اِس آبرو کے تحفظ کی بشارت قرار پائی ہے جس کو آج لٹنے کا شدید خطرہ درپیش ہے

حفیظ تبسم۔ ملتان

AKSPUBLICATIONS
Ground Floor Mian Chamber 3-Temple Road, Lahore.
Ph:0423-6294000 Cell # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com
www.akspublications.com